"تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ گردن کا کٹ جانا اور سکراتِ موت کو برداشت کرنا
ہمارے لئے اس سے آسان ہے کہ علیؑ کے حق میں کوئی غلط بات ہم سنیں"
(حضرت عدیؓ بن حاتم طائی۔صحابی امیرالمومنینؑ)

کشف المسائل

آپکے سوالات واعتراضات اور انکے جوابات پر مشتمل کتاب

سید باقر نثار زیدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	کشف المسائل
مصنف	سید باقر نثار زیدی
ناشر	سید باقر نثار زیدی
کمپوزنگ	سید ناصر عباس زیدی
ٹائٹل ڈیزائننگ	سید صفدر عباس زیدی
ڈیزائن کنسلٹینٹ	سید آفتاب رضوی
طبع اول	اگست ۲۰۰۳
تعداد	۱۱۰۰
مطبع	مائکرو ایڈورٹائزنگ
قیمت	

E-mail add. baqarnisar@hotmail.com
baqarnisarzaidi@yahoo.co

یہ کتاب صرف اہلِ تشیع کے لئے خالصتاً شیعہ عقائد کے مطابق لکھی گئی ہے۔غیر
شیعہ حضرات اس کا مطالعہ اپنی ذمہ داری پر فرمائیں۔

میرا تعارف

کوئی لالچ نہ تمنا نہ توقّع نہ طلب
نہ کوئی ڈر نہ کسی غم کا اثر ہے مجھ پر
میں نہ عالم ہوں نہ اعلم ہوں نہ علّامۂ دہر
ہاں مگر یہ ہے کہ مولاؑ کی نظر ہے مجھ پر

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا

’’جس نے کسی کو علمِ دین دیا اسکو عمل کرنے والے کا سا اجر ملے گا۔ اگر وہ تمام لوگوں کو سکھاتا رہے گا تو بھی یہی صورت رہے گی اور ہر ایک کا ثواب اسکو ملے گا اور اگر وہ مر جائے اور دوسرا اسکی تعلیم لوگوں کو یاد دلائے تو بھی اسے ثواب ملتا رہے گا‘‘۔

(کافی)

ہدیہ

میں بصد عجز و نیاز اپنی اس حقیر کوشش کو ہدیہ کرتا ہوں بارگاہِ حضرتِ صاحب الزمانؑ میں کہ میری دنیا و آخرت دونوں انہی سے وابستہ ہیں۔ وہ ایسے غائب ہیں کہ اگر آنکھیں انھیں تلاش کرنے نکلیں تو تارِ نگاہ ٹوٹ جائے مگر ان تک رسائی نہ ہو سکے اور وہ ایسے ظاہر ہیں کہ خلوت گاہِ قلب میں ہمہ وقت انکی مسند بچھی رہتی ہے۔ وہ آنکھ کے اندھوں کو نظر آ سکتے ہیں لیکن دل کے اندھوں کو نظر نہیں آ سکتے۔ میں اپنے مولاؑ کے قدموں میں سر رکھ کر التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے ظہور میں تعجیل فرمائیں اور باقی تمام مومنین کے ساتھ ساتھ اپنے اس گنہگار بندے کو بھی اپنے انصار و اعوان میں شامل فرمائیں۔ بیشک انہی کی معرفت کیلئے مجھے دنیا میں بھیجا گیا ہے اور بیشک میری بازگشت انہی کی طرف ہے۔

انتساب

میں اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم والدین سید نثار حسین زیدی اور سیدہ ریاض فاطمہؒ زیدی کے نام کرتا ہوں جنکی تربیت نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق آلِ محمدؐ کی وکالت کرسکوں۔ انکا حقِ ربوبیت ادا کرنا میری طاقت سے باہر ہے لیکن میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس خیرِ جاریہ کا ثواب ان مرحومین کو عطا فرمائے اور انھیں جوارِ معصومینؑ میں جگہ دے۔ (آمین)

رَبِّ ارحمھما کماربیانی صغیراً

التماس

میں تمام مومنین سے التماس کرتا ہوں کہ میرے استادِ مرحوم حضرت شاہ عبدالعلیم ابن شاہ عبدالحکیم کی روحِ پرفتوح کے ایصالِ ثواب کیلئے ایک سورۂ فاتحہ ہدیہ فرمائیں۔ وہ ایک ایسے سبک رفتار دریا تھے جس نے میری تشنگیٔ علم کو سیراب کرکے اس پیاس کو اور بڑھادیا۔ وہ ایک ایسے ابرِ گوہر بار تھے جس نے معرفت کے موتیوں سے میرے دامن کو اسطرح بھر دیا کہ میں کوتاہیٔ دامن کا شکوہ ہی کرتا رہ گیا۔

وہ صورتیں خدایا کس دیس بستیاں ہیں
اب جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ماخذ

نام کتاب	نام مولف
قرآن حکیم	
تفسیر المتقین (ترجمہ و تفسیر)	علامہ امداد حسین کاظمی
فتنۂ تفسیر بالرائے	علامہ امداد حسین کاظمی
اصولِ کافی	علامہ محمد بن یعقوب کلینی
فروعِ کافی	علامہ محمد بن یعقوب کلینی
من لایحضرہ الفقیہ	شیخ صدوق
علل الشرائع	شیخ صدوق
نہج البلاغہ	خطباتِ امیرؑ المومنین
نہج الاسرار	خطباتِ امیرؑ المومنین
کتابِ سلیم بن قیس ہلالی	سلیمؓ بن قیس
مناقب ابن شہر آشوب	علامہ محمد بن علی شہر آشوب
بحارالانوار	علامہ محمد باقر مجلسی
شیعہ مذہب کے اصولِ دین	علامہ سید بو علی شاہ زیدی
شہادتِ ثالثہ	علامہ محمد حسنین السابقی
کوکبِ درّی	سید محمد صالح کشفی ترمذی
اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ	علامہ سید نثار عباس نقوی

ماخذ

نام کتاب	نام مولف
ذکراورذاکرین	ڈاکٹرعلی شریعتی
عزاداری ازدیدگاہ مرجعیتِ شیعہ	آقائی علی ربانی خلخالی
العلی سلطانانصیرا	علامہ سیدعبداللہ شاہ عبد
مُروج الذہب	مورخ مسعودی
الخصال	شیخ صدوق
فلسفۂ عزاداری	آقائی علی خامنہ ای
حق الیقین	علامہ محمد باقر مجلسی
شہادتِ ولایتِ علی	علامہ نذرحسین قمر
سیدنا علی ابن ابی طالب اورانکے سیاسی حریف	سید شاہد زعیم فاطمی
طبِ معصومینؑ	علامہ رشید ترابی
فقۂ اسلامی کا تاریخی پس منظر	محمد تقی امین
دی پرنس	میکیاولی
ینابیع المودة	شیخ سلیمان قندوزی
غررالحکم ودررالکلم	اقوالِ جناب امیرؑ کا مجموعہ
احسن العقائد	علامہ حلی
منتہی الآمال	شیخ عباس قمی
طبقاتِ ابنِ سعد	محمد بن سعد

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
میرا تعارف	۱
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا	۲
ہدیہ	۳
انتساب	۴
التماس	۵
ماخذ	۶
فہرست مضامین	۸
سوال	۱۶
کس سے پوچھیں؟	۱۹
تیسرا آدمی	۲۱
چوتھا آدمی	۲۲
سوال کا مطلب کیا ہے؟	۲۳
سوال کیا کرنا ہے؟	۲۴
سوال کس سے کرنا ہے؟	۲۶
اہلِ ذکر کیلئے تمام مخلوقات کی زبان جاننا ضروری ہے	۲۸
دوسری شرط	۲۹

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر
تیسری شرط	۲۹
عالم اور مجتہد میں فرق	۳۰
ایک عوامی مغالطہ	۳۱
سوال کا جواب نہ ملنے یا موصولہ جواب سے مطمئن نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا ہے؟	۳۵
آج کل راوی کون ہے؟	۳۶
حقائق الصلوٰۃ	۳۹
طرفہ تماشا	۴۶
پہلی شرط	۴۹
دوسری شرط	۵۰
معرفۃ الصلوٰۃ	۵۲
اہم ترین سوال	۵۵
دو نمازیں	۵۶
نمازِ حقیقی وجودی	۵۹
اسی لئے	۶۱
دو قسم کے نمازی	۶۳
اذان واقامت اور حقیقتِ نماز	۶۶
نیتِ نماز اور حقیقتِ نماز	۶۷
حزب اللہ	۶۸

عنوان	صفحہ نمبر
رکوع اور حقیقتِ نماز	۷۱
سجدہ اور حقیقتِ نماز	۷۳
جبر و اختیار	۷۷
امر بین الامرین	۷۸
نیت	۷۸
ایک مثال	۷۹
مدتِ عمل	۸۰
حسنِ ظن	۸۲
انسان کی مختلف حیثیات و کیفیات	۸۵
مزید وضاحت	۸۶
سوال کا آخری حصہ	۸۷
شرفِ انسانیت	۸۷
ترغیبِ جہل اور سلبِ عقل	۹۰
علامتِ زوال	۹۲
شرک فی العبادت	۹۳
حقِ امام	۹۴
اقتدار و انتشار	۹۷
کتمانِ حق	۱۰۱
نوشتہ دیوار	۱۰۴
زیرِ بحث حدیث پر ایک نظر	۱۰۵

عنوان	صفحہ نمبر
زیرِ نظر حدیث کا حقیقی مفہوم	۱۱۱
بہت اہم	۱۱۵
نصرتِ مظلوم	۱۱۹
محبت	۱۲۱
اپنا خون خود بہانا	۱۲۵
مذاق اڑائے جانے کا خوف	۱۲۸
خفیہ ہاتھ	۱۳۰
زہر کا علاج زہر سے	۱۳۱
آقائی نائینی کا فتویٰ	۱۳۲
آقائی نائینی کی تائید	۱۳۳
دیگر مراجع کے فتاویٰ	۱۳۴
وجوبِ زنجیر و قمہ زنی کے بارے میں فتوے	۱۳۵
وہ فتاویٰ جو مانعین زنجیر و قمہ زنی کی مذمت میں صادر کئے گئے ہیں	۱۳۷
احسن الحدیث	۱۴۳
ضرورتِ حدیث	۱۴۵
احسن الحدیث کا ماجرا	۱۴۹
کلام اور قول	۱۴۹
معنی اور مفہوم	۱۵۱

عنوان	صفحہ نمبر
حدیث کا قرآنی ثبوت	۱۵۳
کیا قرآن لاوارث ہے؟	۱۵۴
دوسرا سوال	۱۵۶
اطاعت	۱۵۶
جنکی اطاعت سے منع کیا گیا ہے	۱۵۷
جنکی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے	۱۵۷
اتحادِ بین المسلمین	۱۶۱
مذہب پر اتحاد کیسے ہو؟	۱۶۳
حبل اللہ کون ہے؟	۱۶۵
پس چہ باید کرد	۱۶۸
معرفت عمل	۱۶۹
ایمان کی تعریف	۱۶۹
ترکِ عمل	۱۷۲
خود پسندی	۱۷۳
ذکرِ جلی اور ذکرِ خفی	۱۷۴
مجاز اور حقیقت	۱۷۶
مقصد عمل	۱۷۷
احسنِ عمل	۱۷۸
حسنہ	۱۷۹

عنوان	صفحہ نمبر
محبت	۱۸۱
فرشتوں کی تسبیح	۱۸۵
اقسامِ ایمان	۱۸۶
خصائصِ ایمان	۱۸۹
علاماتِ ایمان	۱۹۲
خوف ورجاء	۱۹۴
بشارت ونذارت	۱۹۵
ظاہری اعمال کی تاکید کیوں؟	۱۹۹
سنہرے اصول	۲۰۳
پہلا سوال	۲۰۳
دوسرا سوال	۲۰۷
اسم	۲۰۸
اللہ کا اسم کون ہے؟	۲۰۹
تیسرا سوال	۲۱۱
عالم کون ہے؟	۲۱۱
پہلا اصول	۲۱۴
دوسرا اصول	۲۱۵
تیسرا اصول	۲۱۸
چوتھا سوال	۲۲۱

صفحہ نمبر	عنوان

پانچواں سوال	۲۲۳
بہت اہم	۲۲۵
چھٹا سوال	۲۲۶
کلمۃ التقویٰ (پہلا حصہ)	۲۳۱
ایک اور فتنہ	۲۳۶
جوازِ اختلاف	۲۳۸
پہلی توجیہ	۲۳۹
دوسری توجیہ	۲۴۳
موسیٰ و خضرؑ	۲۴۶
کلمۃ التقویٰ (دوسرا حصہ)	۲۵۲
فرض ـ واجب اور......؟	۲۵۵
اور؟	۲۵۶
از مہد تا لحد از ازل تا ابد یا علیؑ	۲۵۸
کلمہ اور شہادتِ ثالثہ	۲۶۳
لوحِ محفوظ پر کلمہ	۲۶۵
عالمِ ذر میں بنی آدم کا کلمہ	۲۶۵
کلمہ محشر	۲۶۶
کلمۂ ولایتِ علیؑ دورِ رسالت میں	۲۶۷
حضرت امیر المومنینؑ کا کلمہ	۲۶۹

عنوان	صفحہ نمبر
سیدۂ کونین حضرت فاطمۃ الزہرا کا کلمہ	۲۶۹
امام حسنؑ کا کلمہ	۲۶۹
امام حسینؑ کا کلمہ	۲۷۰
امام محمد باقرؑ کا کلمہ	۲۷۰
حضرت صاحب الزمانؑ کا کلمہ	۲۷۰
اذان اور شہادتِ ثالثہ	۲۷۱
نماز اور شہادتِ ثالثہ	۲۷۲
بنیادی بات	۲۷۵
آخر کیوں؟	۲۷۹
ایک اور عذرِ لنگ	۲۸۴
الغدیر	۲۸۵
تقاضائے عقل	۲۸۷
قرآن کا حکم	۲۸۹
احکام معصومینؑ	۲۹۰
عملِ معصومؑ	۲۹۶
رسول اللہؐ کی نماز	۲۹۶
امام جعفر صادقؑ کی نماز	۲۹۸
امام علی رضاؑ کی نماز	۲۹۹

سوال

کسی معقول آدمی کے سامنے اگر کوئی معقول بات کہی جائے تو وہ بات کی حقانیت کومحسوس کرتے ہی اسے تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگائے گا کیونکہ یہ اسکی عقل کا تقاضا ہوگا۔ البتہ **وہ لوگ جنکے تعلقات عقل سے اکثر کشیدہ رہتے ہیں** کوئی نہ کوئی مین میخ ضرور نکالتے ہیں اور کسی نہ کسی بے مقصد بحث کا دروازہ ضرور کھولتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ فتنہ وفساد کے ہمزاد ہوتے ہیں اور انکا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقیقت کو مشتبہ بنادیں تا کہ اگر کوئی سادہ لوح بات کو سمجھنا بھی چاہے تو اس کھینچا تانی میں اسکے بھی اوسان خطا ہوجائیں اور نہ وہ اصل بات سمجھ سکے اور نہ تسلیم کرسکے۔ لیکن جو لوگ نورِ عقل کے ساتھ سفرِ حیات طے کرتے ہیں اور جنھیں اللہ نے ایمان کے ساتھ مخصوص کیا ہے انکے لئے ایسی رکاوٹیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

ایسے صاحبانِ عقل بھی دوطرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کلّیات پر اکتفا کر لینے کے عادی ہوتے ہیں اور جزئیات میں زیادہ تجسّس نہیں کرتے۔ دوسرے وہ جو جزئیات کے متلاشی رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی کلید علم ہے۔ ایسے لوگوں کی عقل جب کسی بات کو تسلیم کرتی ہے تو وہ اسکی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور انکی نگاہ شاخ در شاخ سفر کرتی ہے اور اس طرح ہر پہنچنے والا اپنی اپنی استطاعتِ عقل کے مطابق اپنی منزلِ مراد کو پہنچ جاتا ہے مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جبکہ کلّیہ جان لینے کے بعد انسان کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لینے لگیں کیونکہ سوال ہی وہ چیز ہے جس سے علم کے بند دروازے کھلتے ہیں جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''علم پر ایک تالا پڑا ہوا ہے جس کی کنجی سوال ہے''۔ (کافی)

خداوندِ علیم وحکیم نے کبھی بھی اپنی اس مخلوق کے لئے جسے اس نے جوہرِ عقل سے نوازا ہے صفتِ جہل کو پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ جو لوگ عوام الناس کو جاہل رہنے کی تلقین کرتے ہیں وہ یقیناً فطرت کے بھی دشمن ہیں اور خالقِ فطرت کے بھی۔ قرآن میں جگہ جگہ فضیلتِ علم اور مذمتِ جہل وارد ہوئی ہے اور اللہ کے رسولؐ نے بھی ہر مسلمان پر بلا استثنٰی علم طلب کرنا واجب قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب اس علیم بالذات کا منشاء ہی یہ تھا کہ اپنی صاحبِ عقل مخلوق کو زیورِ علم سے آراستہ دیکھے تو اس نے اپنے خزانۂ علمی کی نشاندہی کرکے علم کی کنجی خود مخلوق کے ہی حوالے کردی تاکہ اس کے لئے کوئی حجت باقی نہ رہے اور وہ اپنے جہل کی ذمہ داری کسی اور کے کاندھوں پر نہ ڈال سکے چنانچہ پروردگارِ علم نے اپنی مخلوق پر واجب کیا کہ وہ سوال کرے اور یہ بھی بتا دیا کہ کس سے سوال کرے تاکہ جعلی مدعیانِ علم کو اپنی اپنی دوکانیں کھول کر بیٹھنے کا موقع نہ ملے چنانچہ ارشاد ہوا۔

''فاسئلو اہل الذکر ان کنتم لاتعلمون'' (جس چیز کو تم نہیں جانتے اسکے بارے میں ''اہلِ ذکر'' سے سوال کرو)۔ اسی ایک آیت سے اہمیتِ سوال کھل کر سامنے آجاتی ہے اور یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بغیر سوال کئے ذائقۂ علم چکھنا محال ہے۔

میں نے سطورِ بالا میں صاحبانِ عقل کے دو طبقوں کا ذکر کیا ہے اور ایسے ہی دو طبقوں سے مجھے بھی واسطہ پڑا۔ جن حضرات نے سوال نہیں کئے میں انکے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ جزئیات پہلے سے ہی انکے پاس محفوظ ہوں اور انھیں سوال کرنے کی ضرورت ہی درپیش نہ آئی ہو لیکن مجھے حقیقی خوشی اس وقت ہوئی جب میرے ای میل ایڈریس پر ملک اور بیرونِ ملک سے مختلف سوالات کا تانتا بندھا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان میں سے ہر شخص معصومؑ یعنی اہلِ ذکر کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کی ذاتی قیاسی

رائے جاننے کا متمنی نہیں بلکہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ اسکے ذہن میں جو سوالات ہیں انکے بارے میں ائمۂ معصومین نے کیا وضاحت فرمائی ہے۔ جو سوالات مجھ سے کئے گئے ان میں سے بہت سے سوال اگر چہ معقول تھے لیکن مختصر ہونے کی وجہ سے میں نے دو چار جملوں میں ہی انکے جوابات دے دئے لیکن کچھ سوال ایسے تھے جو تفصیل طلب تھے۔ انکی ہمہ گیریت اور عمومی افادیت کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال ہوا کہ اس خزانے کو صرف سائل تک محدود رکھنا انصاف کی بات نہ ہوگی بلکہ ان باتوں کو عام ہونا چاہئے کیونکہ یہ سوالات بہت سے ذہنوں میں ہونگے اور بہت سے لوگ اپنی مجبوریات ومصروفیات کی بنا پر انھیں مجھ تک یا کسی اور تک نہ پہنچا سکے ہونگے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ انکو ایک کتابی صورت دے دوں اور اگر یہ مفید سلسلہ جاری رہا اور اگر اللہ نے مجھے طاقت۔ مہلت اور توفیق عطا فرمائی تو میں بھی اس سلسلے میں ہرگز بخل سے کام نہیں لوں گا۔ انشاء اللہ۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی معرض وجود میں آئے تو پھر مجھے میرے ای میل اڈریس پر سوالات بھیجئے۔ ایسے سوالات جو ہمہ گیر افادیت کے حامل اور عمومی دلچسپی کا باعث ہوں۔

کس سے پوچھیں

میں نے ان سولات کا آغاز کر دیا جن پر گفتگو مقصود ہے اور پہلا سوال وہی ہے جسے عنوان قرار دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان بالطبع محتاج ہے اور بغیر کسی سے سوال کئے اسکے لئے کوئی چارہ ہے ہی نہیں۔ مسئلہ کوئی بھی ہو انسان کے لئے کسی نہ کسی سے سوال کرنا ناگزیر ہے چاہے وہ کتاب ہی سے کیوں نہ سوال کرے۔ اس صورتِ حال میں بداہتاً علوم دین کو اوّلیت وفوقیت حاصل ہے کیونکہ دنیاوی معاملات میں نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن خسارۂ آخرت کا کوئی مداوا نہیں ہے اور کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ اسکا شمار ''خاسرین'' میں ہو لہٰذا دینی امور میں لاپرواہی۔ غیر ذمہ داری اور بھیڑ چال سے ہرگز کام نہیں لیا جا سکتا اور اس معاملے میں لازماً سنجیدہ رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ سوال بھی ایسے ہی افراد کی طرف سے آیا ہے جو اپنے دین کی حفاظت کرنے والے ہیں لیکن اس فطری کشمکش میں مبتلا ہیں کہ غیبتِ امامؑ میں اگر کوئی مسئلہ درپیش آ جائے تو ہم کس سے پوچھیں؟

میں اپنے ان برادرانِ ایمانی سے بصد خلوص ومحبت عرض کرتا ہوں کہ انکا سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اسکے جواب کی ضرورت صرف انہی کو نہیں بلکہ اکثر مومنین کو ہے لیکن سب سے پہلے انھیں یہ جان لینا چاہئے کہ یہ سوال ایک جال کی طرح روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے اور بہت سے سادہ لوح اس میں پھنس پھنس کر اپنے دین سے ہاتھ دھو رہے ہیں لہٰذا ہر شخص کا فرض ہے کہ پہلے خود کو اس جال سے محفوظ کرے اور پھر اس سوال کا جواب حاصل کرے۔

علماء نے دین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اصولِ دین یعنی عقائد اور

فروعِ دین یعنی عبادات ۔ ان دونوں کی حقیقت کیا ہے یہ ہم کسی اور موقعے پر بیان کریں گے ۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ غیبتِ امامؑ میں جو دینی مسائل درپیش آئیں گے وہ لازماً انہی دو چیزوں سے متعلق ہونگے یعنی اصول و فروع سے اور انسان دونوں ہی کے بارے میں سوچے گا کہ وہ اپنے سوالات کس سے پوچھے اور یہ بات عقلی ہے کہ جو موضوع زیادہ مشکل ہوگا اس کے بارے میں زیادہ سوالات پیدا ہونگے بہ نسبت اس موضوع کے جو نسبتاً بہت آسان ہو ۔ یہ جاننے کے بعد آپ کے لئے اصل مسئلے کو سمجھنا آسان ہوگا ۔ جن لوگوں نے علم و آگہی سے اپنا تعلق توڑا ہوا ہے اور جو اپنے مولوی کو ہی مجسمۂ علم سمجھتے ہیں اور اس سے آگے اپنی تکلیف شرعی کو ساقط جانتے ہیں اور جنکا مبلغِ علم توضیح المسائل اور دعاؤں اور وظائف کی کتابوں تک ہی محدود ہے انکو سمجھانا یا نہ سمجھانا دونوں برابر ہیں لیکن جو شخص علم کی طرف تھوڑی سی بھی رغبت رکھتا ہے میں اس سے پوچھتا ہوں کہ علومِ عقائد و فروع میں سے کون سا علم زیادہ مشکل ہے؟

کیا عوام الناس حقائقِ توحید سے واقف ہیں؟

کیا وہ اہمیتِ عدل کو جانتے ہیں؟ اور کیا انکو معلوم ہے کہ توحید سے اگر عدل کو جدا کر دیا جائے تو کیا کیا مفاسد پیدا ہوتے ہیں؟

کیا وہ رموزِ نبوت کو پہچانتے ہیں؟

کیا وہ اسرارِ ولایت و امامت کا ادراک رکھتے ہیں؟

کیا وہ قیامت کی کیفیات و جزئیات کا علم رکھتے ہیں جن کے لئے انھیں تیاری کرنی ہے؟

اور کیا کسی سے سوال کئے بغیر ان علوم و معارف کا حاصل کرنا ممکن ہے؟

ہر باشعور انسان اس حقیقت سے واقف ہے کہ علومِ عقائد اس قدر دقیق و عمیق ہیں کہ ہر دور کے فلاسفۂ و علماءِ متکلمین ان مسائل میں ایڑی چوٹی کا

زور لگانے کے باوجود انکے حقائق کا ادراک نہیں کر سکے اور اتنی سعی بلیغ کے باوجود انسان کی حالت یہ ہے جیسے کوئی سمندر کے کنارے پر پڑے ہوئے سنگریزوں سے نمی کشید کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔اسکے باوجود ملاحظہ فرمایئے کہ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ متین بیچ اس مسئلے کے۔

۱۔ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ مسائلِ عقائد میں خود تحقیق و تجسس کرے اور کسی نتیجے پر پہنچ کر صحیح عقائد کا تعین کرے کیونکہ اصولِ دین میں کسی کی بھی تقلید کرنا حرام ہے۔

۲۔البتہ فروعِ دین میں تقلید واجب ہے۔مقلّد نہ قرآن پر عمل کر سکتا ہے اور نہ حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔اسے آنکھ بند کر کے مجتہد کے فتاویٰ پر عمل کرنا ہے کیونکہ بزعمِ خود یہ مسائل اتنے مشکل ہیں کہ سوائے مجتہد کے کوئی بھی انکا ادراک نہیں کر سکتا۔

تیسرا آدمی

کسی بھی صاحبِ ہوش وحواس انسان کی سمجھ میں یہ بات ہرگز نہیں آئے گی کہ جو شخص عقائد کے دقیق مسائل پر از خود غور وفکر اور تلاش وتجسس کر کے صحیح عقیدے تک پہنچ سکتا ہے وہ دو رکعت نماز کے احکام کیوں کر معلوم نہیں کر سکتا اور اسکے لئے وہ تقلید کا محتاج کیوں ہے؟۔اس نظریے کا باطل ہونا ظاہر ہے۔

رسولؐ اللہ نے امت کو قیامت تک گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے دو چیزیں چھوڑیں۔کتاب اللہ اور اہلبیتؑ۔آپؐ نے ورثہ بھی چھوڑا اور وارث بھی۔کتاب بھی چھوڑی اور مفسّر بھی۔کتاب اس لئے چھوڑی کہ تمام عقائد واحکام کی اصل قرآن میں ہے اور مفسّر اس لئے چھوڑا کہ قرآن امت کے احاطۂ علمی سے باہر ہے اور لوگ اسکی تفسیر اور اسکے اسرار ورموز کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے اسکی تعبیر و تشریح کے لئے مفسّر ضروری تھا۔لیکن اب جبکہ اس بات کا دعویٰ کیا جارہا ہے کہ

قولِ مفسّر یعنی فرمودات معصومینؑ کو بھی کوئی نہیں سمجھ سکتا سوائے مجتہد کے تو اس اصول کے تحت یہ ضروری تھا کہ (معاذ اللہ) پیغمبر اسلام دو کے بجائے تین چیزیں چھوڑتے ۔۱۔کتاب ۔۲۔کتاب کو سمجھانے کے لئے اہلبیتؑ ۔۳۔اقوالِ

اہلبیت کو سمجھانے کے لئے مجتہد ۔ورنہ بصورتِ دیگر صرف دو چیزیں چھوڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیوں کہ جب ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی لوگ سمجھنے سے قاصر رہیں تو ان چیزوں کے چھوڑنے کا فائدہ کیا تھا؟۔تعجب ہے کہ جب اللہ نے بقاء واجراءِ دین کے لئے دو چیزوں کو کافی سمجھا تو دین میں یہ دراندازی کیسے شروع ہوئی اور یہ تیسرا آدمی کہاں سے آ گھسا؟۔

چوتھا آدمی

مندرجہ بالا مفروضہ اصولوں پر اجمالی گفتگو ہم کریں گے لیکن پہلے ہم انکے قائم کئے ہوئے سوال نما جال کو انہی کی طرف لوٹاتے ہیں۔خود انہی کا فرمان ہے کہ اصولِ دین میں مجتہد کا کوئی عمل دخل نہیں ۔اسکا دائرۂ کار صرف فروع تک محدود ہے اور غیبت امامؑ میں فروع کے بارے میں اگر کوئی سوال درپیش ہو تو سوائے مجتہد کے اور کسی کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا۔اگر ایک لمحہ کے لئے انکی بات مان بھی لی جائے تب بھی یہ حقیقت تو بہر حال نا قابلِ انکار رہے گی کہ مسائل تو اصول وفروع دونوں کے بارے میں درپیش آتے رہیں گے نہ کہ صرف فروع کے بارے میں اور یہ بات بھی نا قابلِ تردید ہے کہ چونکہ مسائلِ عقائد فروعات کے مقابلے میں بدرجہا مشکل اور دقیق ہیں اس لئے فروع کے مقابلے میں اصول کے بارے میں کہیں زیادہ سوالات درپیش آئیں گے جنکو حل کئے بغیر عقیدہ ناقص رہے گا۔تو کیا انکا مقصد یہ ہے کہ عقیدہ ناقص رہتا ہے تو رہے اور انسان اگر فاسق العقیدہ ہے تو رہے لیکن فروع کے بارے میں اسے ہمہ وقت

مستعد رہنا چاہئے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو چند لوگوں کی دال روٹی بند ہو جائے گی۔اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔یا تو عقیدے کی بساط لپیٹ دی جائے اور فروع کو ہی کُلِّ دین تصور کیا جائے۔اور اگر عقیدہ فروع کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہے اور اسے اوّلیت حاصل ہے تو پھر ہم یہ سوال

قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ "اگر غیبت امامؑ کے دوران عقائد کے سلسلے میں کوئی سوال درپیش آ جائے تو ہم کس سے پوچھیں؟"۔ شاید اسکا جواب یہ آئے کہ رسولؐ اللہ کو (معاذ اللہ) ایک چوتھا آدمی بھی چھوڑنا چاہئے تھا تاکہ وہ ائمۂ معصومینؑ کے ان ارشادات کا مطلب لوگوں کو بتاتا جوانھوں نے عقائد کے بارے میں بیان فرمائے ہیں کیونکہ مجتہد تو بے چارہ صرف فروع تک ہی محدود ہے۔

اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنی بات کو پھر دہراتے ہیں کہ اہمیت سوال سے کوئی فردِ واحد بھی انکار نہیں کرسکتا اور ہر شخص بلا استثنٰی کسی نہ کسی مسئول کا محتاج ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ سوال کرنے سے پہلے چار باتوں کا تعین کرلیا جائے:۔

۱۔ سوال کا مطلب کیا ہے؟
۲۔ سوال کیا کرنا ہے؟
۳۔ سوال کس سے کرنا ہے؟
۴۔ سوال کا جواب نہ ملنے یا موصولہ جواب سے مطمئن نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا ہے؟

سوال کا مطلب کیا ہے؟

یہ عام فہم باتیں ہیں لیکن مجھے انکی وضاحت کرنے کی ضرورت اس لئے پڑ رہی ہے کہ اتنی غیر مبہم باتوں کو بھی ایسا معنی و مفہوم دے دیا گیا ہے جو نہ صرف بعید از

عقل ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے اور اس طرح عوام کی لاعلمی سے مجرمانہ حد تک نا جائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے حالانکہ سوال کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو کسی شے کا علم نہیں تو آپ کسی واقف کار اور قابلِ اعتماد شخص سے پوچھ لیں۔ پوچھنا کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس سے آپ سوال پوچھیں وہ آپ کو چمٹ ہی جائے اور پھر جان ہی نہ چھوڑے اور آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسکے محتاج ہو کر رہ جائیں۔ آج کل اس لفظ کے یہی معنی مراد لئے جا رہے ہیں کہ آپ صرف اسی شخص سے سوال کر سکتے ہیں جسکی آپ تقلید کر رہے ہوں۔ کسی اور سے آپ سوال کر ہی نہیں سکتے چاہے وہ عالم بھی ہو اور قابلِ وثوق بھی کیونکہ آپ کو بہر حال اس کے فتوے پر عمل کرنا ہے جسکی آپ تقلید میں ہیں۔ اس طرح آپ علم کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو گئے اور صرف ایک ہی شخص کو مجسمۂ علم سمجھ کر اسکے دامِ تزویر میں گرفتار ہو کر رہ گئے۔ لغوی۔ اصطلاحی۔ عقلی یا دینی۔ کسی بھی اعتبار سے سوال کے معنی تقلید نہیں ہو سکتے۔ طالبِ علم استاد سے سوال کرتا ہے۔ راہ گیر لوگوں سے راستہ پوچھتا ہے۔ ہزاروں سوالات ہیں جو لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں لیکن کوئی کسی کا مقلد نہیں بنتا۔ یہ بالکل نرالی منطق ہے کہ جیسے ہی نماز روزے کا کوئی مسئلہ درپیش آیا تو فوراً تقلید لازم ہو گئی حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ "قبلہ اگر آپ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ میں کسی اور سے پوچھ لوں گا"۔

سوال کیا کرنا ہے؟

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ اگر سوال ناقص یا غلط ہوگا تو جواب بھی ناقص اور غلط ہی آئے گا۔ اگر آپ کسی خاص نسل کا آم خریدنے جائیں اور بیچنے والے سے صرف یہ کہیں کہ مجھے پانچ کلو آم دے دو تو وہ کوئی سا بھی آم تول کر آپ کو دے دے گا اور آپ بے مراد رہیں گے۔ اگر آپ کسی خاص قسم کے برانڈ

کا ٹیلی وژن خریدنا چاہتے ہیں لیکن دوکان دار کے سامنے اس برانڈ کا نام نہیں لیتے بلکہ صرف ٹی وی طلب کرتے ہیں تو وہ کسی بھی برانڈ کا ٹی وی آپ کے حوالے کردے گا جو شاید آپ کے معیار پر پورا نہ اترے۔اسی طرح کوئی فقہی سوال کرنے سے پیشتر بھی آپکو لازماً طے کرنا پڑے گا کہ آپ کیا جاننا چاہ رہے ہیں۔

اللہ نے ہمیں عبادت کرنے کے لئے خلق فرمایا ہے اور عبادت کا نزا کھرا مفہوم ''اطاعتِ غیرِ مشروط'' ہے۔اس طرح ہمارا مقصدِ حیات اطاعتِ خدا ٹھہرا لیکن ہم اللہ کی اطاعت کیسے کریں؟ نہ تو وہ ہمارے سامنے آتا ہے نہ اسکی آواز ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے اور نہ وہ ہمیں کچھ لکھ کر دیتا ہے۔قرآن بھی ہم نے زبانِ رسولؐ سے سنا ہے۔اللہ نے خود تو پڑھ کر سنایا نہیں۔اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اللہ نے ہم پر واضح کیا کہ اسکی اطاعت کا مفہوم کیا ہے چنانچہ قرآن میں اس نے حکم دیا۔''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اولی الامر کی''۔یہاں اس نے مطاع کے طور پر سب سے پہلے اپنا نام لیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ باقی دو کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے جس کا غیر مشروط ہونا لازمی ہے۔پھر لفظ ''اطیعوا'' رسولؐ اور اولی الامر دونوں کے لئے ایک ہی بار استعمال فرمایا تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ جس طرح رسولؐ معصوم ہے اسی طرح اولی الامر بھی معصوم ہیں کیونکہ غیرِ معصوم جائز الخطاء کی اطاعتِ غیرِ مشروط کو واجب قرار دینا تو درکنار۔اللہ ایسی اطاعت کو حرام قرار دیتا ہے لہٰذا اولی الامر ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کے لئے یہ مقامِ فکر ہے۔اس آیت سے ہمیں پتہ چلا کہ عبادت سے مراد اطاعتِ رسولؐ اور اطاعتِ اولی الامر ہے۔جب ہمارا مقصدِ حیات متعین ہو گیا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارا کام صرف اور صرف رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرنا ہے تو یہ فطری و عقلی تقاضا ہے کہ جب بھی ہمیں کوئی مسئلہ درپیش آئے گا تو ہم یہ تلاش کریں گے کہ اس معاملے میں رسولؐ اور اولی

الامر کا کیا حکم ہے نہ کہ ہم یہ ڈھونڈتے پھریں گے کہ فلاں مجتہد کی ذاتی رائے کیا ہے۔(واضح رہے کہ فتویٰ کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے ''اصولِ فقہ کے ذریعے استنباط کرنے کے بعد مجتہد کی جو ذاتی رائے قرار پاتی ہے اسے فتویٰ کہتے ہیں'') ۔لہٰذا عقلی اور شرعی طور پر اب یہ طے ہوگیا کہ اگر ہمیں کوئی فقہی مسئلہ درپیش ہوتو ہم کسی ایسے شخص کے پاس جائیں گے جس کے بارے میں ہم جانتے ہوں کہ وہ ہم سے زیادہ علم رکھتا ہے اور ظاہری طور پر اسکے کردار میں کوئی عیب نظر نہیں آتا اور یہ کہ ہم اسکی بات پر اعتبار کر سکتے ہیں اور اسکے سامنے مسئلہ بیان کرنے کے بعد اس سے پوچھیں گے کہ ''قبلہ اس مسئلہ میں معصومینؑ کا حکم کیا ہے؟''۔بس اتنی ہی ہماری تکلیف ہے اور یہ کوئی ایسی بات ہے بھی نہیں جس میں کسی قسم کا ابہام۔الجھاؤ یا شک وشبہ پیدا کیا جا سکے۔ ہروہ عقل جواللہ۔رسولؐ اور اولی الامر کی مطیع وفرمابردار ہے اس بات کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کا پس وپیش کرہی نہیں سکتی لیکن ان حضرات نے معصومینؑ کے متوازی کون سا نظام رائج کیا ہوا ہے اسکی جانچ پڑتال کے لئے کبھی آپ کسی مجتہد کے آستانے پر جا کر یہی سوال کریں کہ ''اس مسئلے میں ہمیں کسی کی ذاتی رائے نہیں بلکہ معصومینؑ کا حکم چاہئے۔اگر آپکو معلوم ہے تو ہمیں بتا دیں''۔پھر دیکھئے کیا تماشا ہوتا ہے۔آپ دیکھیں گے کہ ایک شور اٹھے گا کہ ''یہ کون نامحرم اندر گھس آیا ہے۔اسے باہر نکالو''۔

سوال کس سے کرنا ہے؟

یہ انتہائی ضروری بات ہے کہ سوال کرنے سے پہلے مسئول کا تعین کیا جائے ورنہ سوال کرنا بے معنی ہوگا اور جو جواب ملے گا وہ بھی کسی طور یقینی اور قطعی نہیں بلکہ ظنی اور قیاسی ہوگا جس سے مقصد پورا ہونے کے بجائے الٹا نقصان کا احتمال پیدا ہوجائے گا۔یہی وجہ ہے کہ اس علیم وحکیم نے صرف حکمِ اطاعت ہی نہیں دیا بلکہ

احتیاجِ مخلوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوال کرنے کا بھی حکم دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہمیں کس سے سوال کرنا ہے۔ چنانچہ حکم ہوا۔ ”فاسئلو اہل الذکر ان کنتم لاتعلمون“۔ ترجمہ:۔ ”پس اگر تم نہیں جانتے تو ذکر (یعنی رسولؐ) کے اہل (یعنی اہلبیتؑ) سے سوال کرو“۔ اس آیت کو علماءِ سوء نے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنایا ہوا ہے جو اپنی مذہبی اجارہ داری قائم کرنے اور باقی رکھنے کے لئے اسی آیت کا سہارا لیتے ہیں اس لئے مومنین پر واجب ہے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھیں تا کہ آیتِ قرآنی کے ساتھ استہزاء کرنے والوں کی زبانیں بند کی جاسکیں۔

جہاں تک سمعی دلائل کا تعلق ہے ہم نے کشف الحقائق میں کافی تفصیل کے ساتھ اس آیت پر بحث کی ہے اور مکمل طور پر ثابت کیا ہے کہ اہلِ ذکر سے مراد اہلبیتؑ کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا تفصیلات کے لئے کتاب کشف الحقائق کا مطالعہ فرمایا جائے۔ یہاں ہم صرف عقلی دلائل پر ہی اکتفا کریں گے تا کہ یہ گمان بھی نہ کیا جا سکے کہ اہلبیتؑ کے علاوہ کوئی اور وجود بھی ایسے ہو سکتے ہیں جن پر لفظ اہلِ ذکر کا اطلاق ہوسکتا ہو اور جن سے سوال کیا جا سکتا ہو۔

پہلی بات یہ کہ ”فاسئلوا“ جمع کا صیغہ ہے یعنی ”تم سب سوال کرو“۔ اس میں کسی ایک کی بھی تخصیص یا استثنیٰ نہیں کیا گیا۔ مجتہد پر بھی اسی طرح سوال کرنا واجب ہے جس طرح ہم پر۔ اس ”فاسئلوا“ کے مخاطب کون ہیں؟۔ ہر وہ وجود جسے کسی نہ کسی حالت میں سوال کرنے کی ضرورت درپیش آسکتی ہے اور ان تمام موجودات کے سوالات کے جوابات دینے والے اہلِ ذکر ہیں۔ لہٰذا عقل تقاضا کرتی ہے اور شدید تقاضا کرتی ہے کہ ایسی گراں بار ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے اہلِ ذکر میں چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جنکے بغیر کسی پر بھی اس لفظ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ ان خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے۔

تمام مخلوقات کی زبانوں کا علم

تمام مخلوقات قطع نظر اسکے کہ وہ انسان ہیں یا حیوان ۔جن ہیں یا ملائکہ۔ پرند ہیں یا درند۔اس زمین کے رہنے والے ہیں یا مریخ کے۔مشتری پر رہتے ہیں یا زہرہ پر ۔غرض یہ کہ کہیں بھی رہتے ہوں اور انکی نوع کوئی بھی ہو لیکن بہر حال یہ حقیقت ہے کہ انکی زبانیں مختلف ہیں ۔انکی بولیاں جدا جدا ہیں ۔انسانوں کو ہی لے لیجئے اور وہ بھی صرف پاکستان میں رہنے والے انسان ۔ان سب کی زبانیں اور بولیاں مختلف ہیں ۔کوئی اردو زبان بولتا ہے اور کوئی پنجابی ۔کوئی پشتو بولتا ہے تو کوئی بلوچی ۔کوئی سرائکی بولتا ہے تو کوئی سندھی ۔پھر ہر زبان میں قدم قدم پر اختلاف ہے ۔صرف پنجاب میں آٹھ قسم کی پنجابی بولی جاتی ہے اور ایک قسم کی پنجابی جاننے والا باقی سات قسم کی پنجابی سے ناواقف ہے ۔ یہ تو صرف ایک چھوٹے سے ملک پاکستان کا حال ہے جبکہ تمام دنیا میں اس وقت کئی کروڑ زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ سب کے سب سوال کرنے والے ہیں ہفت زبان کا جاننا آسان ہے لیکن کیا کوئی انسان ایسا ہوسکتا ہے جو دنیا کی تمام زبانوں کا ماہر ہو؟ ۔ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے لیکن ''فاسئلوا'' کے مخاطب صرف انسان ہی نہیں بلکہ جن بھی ہیں ۔چلو کسی نے چلّہ کاٹ کر جنوں کی بولی بھی سیکھ لی لیکن ملائکہ کہاں گئے؟ ۔چلو ''کسی'' نے کچھ عرصے ملائکہ کی صفوں میں بیٹھ کر انکی زبان بھی سیکھ لی لیکن انکے علاوہ باقی مخلوقات کہاں جائیں گی؟ ۔اس لئے کہ حیوانات بھی تو ''فاسئلوا'' میں داخل ہیں ۔طوطے کو چند دن قید رکھ کر انسانی بولی کے چند بول سکھا دینا آسان ہے لیکن طوطے کو ایک طویل مدت تک اپنے پاس رکھنے کے باوجود اسکی اپنی زبان سیکھ لینا انسان کے لئے ناممکن ہے ۔کیا دنیا کی تاریخ کسی ایسے وجود کا پتہ دے سکتی ہے جو تمام مخلوقات کی زبانوں سے واقف ہو؟ ان تمام مخلوقات کی زبانوں کو وہی جان سکتا ہے جنکو خالقِ کائنات نے خود تعلیم دی ہو اور وہ کوئی نہیں سوائے اہلبیتِ اطہار کے جنکے بارے میں تاریخ بابانگِ دہل گواہی

دیتی ہے کہ وہ جمیع مخلوقات کے مرجع تھے اور ہر مخلوق اپنی اپنی حاجات کے لئے انہی کی طرف رجوع کرتی تھی۔ ہر مخلوق ان سے اپنی ہی زبان میں بات کرتی تھی اور یہ حضرات اسی کی زبان میں جواب دیتے تھے۔ یہ ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ پس انکے سوا کون ہے جو اہلِ ذکر ہونے کا دعویٰ کرسکے؟ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو خود بھی اندھا ہو اور دوسروں کو بھی اندھا سمجھتا ہو۔

دوسری شرط

صرف زبانوں اور بولیوں سے واقف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسئول کے لئے لازم ہے کہ وہ عالم علی الاطلاق ہو اور ایسے علم کا مالک ہو جس میں جہل کا گذر تک نہ ہو سکے۔ نیز یہ کہ تمام مخلوقات کی ضروریات کا بھی جاننے والا ہو۔ لفظِ ''فاسئلوا'' کسی خاص شعبۂ علم تک محدود نہیں ہے بلکہ سائل جو بھی سوال کرے اور اسکا سوال کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو اہلِ ذکر پر لازم ہے کہ اسکا علم رکھتا ہو ورنہ جواب نہ دے سکے گا۔ مولائے کائنات نے ''سلونی'' کہکر اسی حقیقت کو واضح کیا ہے اور اسی لئے امام رضاؑ نے ارشاد فرمایا ہے ''امام وہ ہوتا ہے جس سے کوئی بھی سوال کیا جائے تو وہ یہ نہ کہے کہ میں نہیں جانتا''۔ پس جس شخص کو یہ تک معلوم نہ ہو کہ اسکے سر میں بال کتنے ہیں اور اسکی پگڑی میں پیچ کتنے ہیں وہ کیوں کر اہلِ ذکر ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے؟۔

تیسری شرط

اہلِ ذکر کے لئے زبانوں کا جاننا اور علم رکھنا بھی کافی نہیں جب تک اس سے سہو و نسیان۔ خطاء و عصیان اور غلبۂ خواہشاتِ نفسانی کے احتمالات کی نفی نہ کی جائے۔ بصورتِ دیگر اس سے ہر حال میں صحیح جواب کی توقع نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس پر کبھی بھول چوک طاری ہو جائے یا کبھی وہ جواب دینے

میں غلطی کر بیٹھے یا کبھی خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو کر دنیاوی مفادات کی خاطر دانستہ طور پر غلط جواب دے دے۔ اس لئے عقل حکم لگاتی ہے کہ اہلِ ذکر کے لئے معصوم ہونا شرطِ لازمی ہے۔ پس کون ہے جو احتمالِ خطاء ونسیان وعصیان ہوتے ہوئے بھی اہلِ ذکر ہونے کا دعویٰ کر سکے؟۔

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب وجود میں لائی جاسکتی ہے لیکن اس مقام پر چونکہ یہ ہمارے مستقل موضوعات سے متعلق نہیں اس لئے ہم صرف اتنے بیان پر ہی اکتفا کرتے ہیں جس سے ہمارا مطلب واضح ہو جائے۔ بہر حال اس پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ سوال صرف اہلِ ذکر سے ہی کیا جاسکتا ہے اور اگر اہلِ ذکر تک ہماری رسائی نہ ہو سکے تو اسکے آثار و اقوال سے سوال کیا جائے گا۔ مقلدین بھی ہر سوال پوچھنے کے لئے مجتہد کے پاس بھاگے نہیں چلے جاتے بلکہ اسکی توضیح المسائل کھول کر دیکھتے ہیں۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے یہ سوال کرے کہ "کس سے پوچھیں" تو اسکے سر پر قرآن رکھ کر اس سے پوچھئے کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں اپنے مرجع سے براہِ راست کتنے سوال کئے ہیں؟۔ اسی طرح احکامِ اہلِ ذکر بھی ہمارے پاس کتابی صورت میں موجود ہیں اور اپنے سوالات کا حل ان کتابوں سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگ دریافت کرتے ہیں کہ کیا احکامِ اہلِ ذکر مجتہدین سے نہیں پوچھے جاسکتے؟۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ یہ سوالات علماء سے ضرور پوچھے جاسکتے ہیں لیکن مجتہد سے نہیں۔

عالم اور مجتہد میں فرق

جو شخص کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں حکمِ معصومؑ کا علم رکھتا ہے وہ اس مسئلے کا عالم ہے اور اس سے یقیناً سوال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہی اس وقت ہے جب مجتہد کو کسی مسئلے کا حل نہ قرآن میں ملتا ہو اور نہ حدیثِ معصومؑ میں جیسا کہ نہج البلاغہ صفحہ ۱۳۵ پر خطبہ ۱۸ کی تشریح کے ذیل میں مفتی جعفر حسین

صاحب لکھتے ہیں:۔

''جب مجتہد کی حکمِ واقعی تک رسائی نہیں ہونے پاتی تو تلاش وتفحص کے بعد جو نظریہ اسکا قرار پاتا ہے اس پر عمل پیرا ہونا اسکے لئے اور اسکے مقلدین کے لئے کفایت کر جاتا ہے لیکن اسکی حیثیت صرف حکمِ ظاہری کی ہوتی ہے جو حکمِ واقعی کا بدل ہے اور ایسی صورت میں حکمِ واقعی کے چھوٹ جانے پر وہ معذور قرار پاتا ہے کیونکہ اس نے اس دریائے ناپیدا کنار میں غوطہ لگانے اور اسکی تہہ تک پہنچنے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی مگر اس پر کیا اختیار کہ دُرِ شہوار کے بجائے خالی صدف اسکے ہاتھ لگے''۔

اس صورتِ حال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر مجتہد کو حکمِ معصومؑ کا علم ہے تو اس سے یقیناً سوال کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس حالت میں وہ عالم ہوتا ہے بشرطیکہ وہ دیانتداری سے کام لے اور یہ کہہ کر بتائے کہ یہ حکمِ معصومؑ ہے میرا فتویٰ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا فتویٰ بتاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بقول مفتی جعفر حسین اسکی رسائی حکمِ معصومؑ تک نہیں ہونے پائی اور اس صورت میں وہ حکمِ معصومؑ سے جاہل ہے اس لئے اس سے ہرگز سوال نہیں کیا جاسکتا۔

ایک عوامی مغالطہ

ایک عام تاثر جو لوگوں میں جڑ پکڑ گیا ہے یہ ہے کہ ہمیں ہر اس مسئلے کا حل معلوم ہونا چاہئے جو ہمیں درپیش آتا ہو یا آسکتا ہو چاہے وہ قرآن ومعصومینؑ نے بیان کیا ہو یا نہ کیا ہو اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو یقین دلا دیا جاتا ہے کہ بغیر مجتہد کے وہ زندگی گذار ہی نہیں سکتے۔ اس مقصد کے لئے ہزار ہزار بہانے تراشے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ایک منظم نیٹ ورک کام کر رہا ہے جسکا مشن ہی یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسے مفروضہ اور ناقابلِ عمل مسائل پیش کئے جائیں جن سے لوگوں کے اذہان پراگندہ ہوجائیں اور وہ مجتہد کی چوکھٹ پر سجدہ ریز

ہونے پر مجبور ہو جائیں حالانکہ وہ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ جنکی ہمیں اپنی عام زندگی میں ضرورت ہی درپیش نہیں آتی۔ سوال صرف اتنا ہے کہ اگر کسی مسئلے کا حل قرآن و احادیث میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں مجتہد اور ایک عام آدمی برابر ہیں۔ آخر مجتہد کے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جسکے ذریعے وہ ایسی بات معلوم کر لے جسکا ذکر نہ اللہ نے کیا ہو نہ رسولؐ نے؟ سوائے اسکے کہ وہ اپنی ذاتی رائے (فتویٰ) سے کام لے مگر اللہ نے ہمیں کسی کی ذاتی رائے کا پابند کب کیا ہے؟۔ دنیا میں مختلف گوشوں سے انٹرنیٹ پر ایسے ایسے سوالات نشر کئے جاتے ہیں کہ جس سے ایک سادہ لوح انسان کی عقل چکرا کر رہ جائے۔ مثلاً آسٹریلیا سے ایک صاحب نے ضرورتِ تقلید کا پرچار کرتے ہوئے مختلف مسائل کا ذکر کیا جنکا حل بقول انکے سوائے مجتہد کے کوئی اور ڈھونڈ ہی نہیں سکتا۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ انسانی کلوننگ کا تھا۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا ہم میں سے کسی کو بھی اس چیز کی ضرورت ہے؟ یہ تو صرف ایک جال ہے جس میں مچھلیوں اور حیوانوں کے بجائے انسانوں کو پھانسا جاتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ کلوننگ کے بارے میں ایک طرف تو خود اسکے ماہرین حیران و سرگردان ہیں اور دنیا بھر کے سائنسدان اسکی مخالفت کر رہے ہیں اور اسے نسلِ انسانی کے لئے ایک عظیم خطرہ قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف کچھ غیر ذمہ دار لوگ ایسے بھی ہیں جو اسکی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اسکے حلال یا حرام ہونے پر بحث کر رہے ہیں حالانکہ انسان صرف اسی صورت میں کسی مسئلے کے حل کے لئے پریشان ہوتا ہے جب وہ مسئلہ اسے درپیش ہو یا درپیش آنے والا ہو۔ لوگوں کو غور تو کرنا چاہئے کہ آخر ہم میں سے وہ کون ہے جسے کلوننگ کا مسئلہ درپیش ہو؟ اور اس میدان میں خیالی گھوڑے دوڑانا صرف اور صرف ذہنی عیاشی ہے یا نہیں؟۔ یہ حیرانی نتیجہ ہے انکا دامن چھوڑنے کا جن سے تمسک کا حکم اللہ نے دیا ہے اور انکی اطاعت سے منہ موڑنے کا جنکی اطاعت کو

اللہ نے لازم گردانا ہے۔ہم نے کشف الحقائق میں اس بارے میں دو احادیث درج کی تھیں۔ یہاں انکی افادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم ایک بار پھر وہ احادیث آپکی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں تا کہ مسئلے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

ا۔بحار الانوار (اردو) جلد۱۲ صفحہ ۷۷۸۔حضرت صاحب الزماںؑ نے فرمایا۔

''ایسے سوالات کے دروازے بند کرو جس سے تمھیں کوئی مطلب نہیں اور وہ بات معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو جسکی تمھیں ضرورت نہیں''۔

۲۔نہج البلاغہ۔قول ۱۰۵۔''اللہ نے چند فرائض تم پر عائد کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو اور تمھارے حدود کا رمقرر کر دئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔اس نے چند چیزوں سے تمھیں منع کیا ہے انکی خلاف ورزی نہ کرو اور جن چند چیزوں کا اس نے حکم بیان نہیں کیا انھیں بھولے سے نہیں چھوڑ دیا لہٰذا خواہ مخواہ انھیں جاننے کی کوشش نہ کرو''۔

ہر چند کہ یہ ایک نا قابلِ عمل بات ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایک مختصر سا تبصرہ کردوں تا کہ ایسے لوگوں کو سکون مل سکے جو ہر آڑی ترچھی بات سن کر بوکھلا جاتے ہیں۔

چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ اس مسئلے کا حل نہ قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیث میں لیکن یہ سوال تو بہر حال باقی رہتا ہے کہ وہ کون ہے جو ہمیں بتائے گا کہ انسانی کلوننگ جائز ہے یا نا جائز؟۔کیا یہ بات ہمیں مجتہد بتائے گا؟۔آج تک آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ مجتہد امورِ شرعیہ کا ماہر ہوتا ہے۔یہی دعویٰ کیا کم تھا کہ اب آپ نے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ مجتہد سائنس اور ٹیکنولوجی کا بھی ماہر ہوتا ہے۔کون بےوقوف آپ کے اس دعوے کو تسلیم کرے گا؟۔ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ایک مرجع نے ٹیپ ریکارڈر کو حرام قرار دے دیا تھا جبکہ کچھ ہی دنوں قبل وہ ریڈیو کو جائز قرار دے چکا تھا۔اس فتوے سے اسکے مقلدین میں ایک ہلچل مچ

گئی اور وہ بھاگے بھاگے گئے اور اسے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر میں مماثلت سمجھائی تب کہیں جا کر انھوں نے اپنا فتویٰ واپس لیا۔ جن لوگوں کو ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کا فرق بھی معلوم نہ ہو ان سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ انسانی کلوننگ کے بارے میں اظہارِ رائے فرمائیں گے؟۔ کہاں یہ ہائی ٹیکنولوجی کے مسائل اور کہاں یہ بیچارے مسجدوں کے قیدی؟۔ آدمی کو بات کرنے سے پہلے کچھ تو سوچ لینا چاہئے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کلوننگ ہے کیا چیز تو اس بارے میں ان سائنسدانوں سے پوچھنا چاہئے جو یہ کام کر رہے ہیں۔ مولوی سے اسکا کیا تعلق؟۔

اس قسم کے مسائل کی اصل یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے اس حقیقت کو قطعاً محو کر دیا گیا کہ یہ دور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں ان ادوار سے قطعی مختلف ہے جن میں حضراتِ ائمہ معصومینؑ بظاہر ہمارے سامنے تھے۔ رسولؐ اکرم نے ایک بار اپنے اصحاب کے سامنے زمانۂ آخر کے مومنین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ ''خوشخبری ہو میرے ان بھائیوں کے لئے جو زمانۂ آخر میں آئیں گے''۔ اصحاب نے پوچھا کہ ''یا رسولؐ اللہ کیا ہم آپؐ کے بھائی نہیں ہیں؟''۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''نہیں۔ تم میرے اصحاب ہو تمھیں اگر کسی مسئلے میں اشتباہ ہوتا ہے تو میں تمھارے پاس موجود ہوں۔ تم مجھ سے آکر پوچھ لیتے ہو لیکن میرے بھائی وہ مومنین ہونگے جنکا امام انکے سامنے نہیں ہوگا اور وہ حیران و سرگردان پھرتے ہونگے''۔ آپ نے اس زمانے کے مومنین اور دورِ حاضر کے مومنین کے حالات و کیفیات میں فرق اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا۔ وہ لوگ ہر مسئلہ کا حل معلوم کر سکتے تھے لیکن ہم مجبور ہیں کہ صرف انہی اعمال تک خود کو محدود رکھیں جنکے بارے میں معصومینؑ کے احکامِ قطعی ہمارے پاس ہیں اور باقی کاموں سے خود کو روکے رکھیں خواہ اسکی وجہ سے ہم بہت سی لذاتِ دنیاوی سے محروم ہی کیوں نہ رہ

جائیں ۔ جو لوگ مجتہد کی آڑ لیکر اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دین دار بھی کہلاتے رہیں اور ہر قسم کی دنیاوی منفعت بھی حاصل کرتے رہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں ۔ یہ دور قربانی چاہتا ہے ۔ اسکا تقاضا ہے کہ مومن اپنے نفس کو کچل دے اور کسی بھی حال میں اطاعتِ معصوم سے تجاوز نہ کرے ۔ جو شخص یہ پابندیاں برداشت کرنے کو تیار نہ ہو وہ یقیناً ان مومنین میں شامل نہیں جنکا ذکر رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے ۔

سوال کا جواب نہ ملنے یا موصولہ جواب سے مطمئن نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

میں نے کشف الحقائق کے صفحہ ۲۸۹ پر ایک جملہ لکھا جس پر اتنا دھیان نہیں دیا گیا جسکا وہ مستحق تھا ۔ جملہ یہ ہے :-

"ہماری زندگی کا مقصد صرف ایک ہے ۔ اطاعتِ خدا ۔ اور اطاعت محتاج حکم ہوتی ہے ۔ حکم ہوگا تو اطاعت کی جائے گی ۔ حکم نہیں ہوگا تو کس چیز کی اطاعت ہوگی؟" ۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے اور کوئی بھی عقل اسکا انکار نہیں کرسکتی ۔ لہٰذا جس مسئلے کے بارے میں ہمیں حکم معصومؑ نہیں ملتا عقلی اور شرعی دونوں اعتبار سے ہمارے لئے وہ عمل ساقط ہے ۔ ہم کسی ایسی شے کے مکلف نہیں ہوسکتے جسکا باوجود کوشش کے ہمیں علم حاصل نہ ہوسکے جیسا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا ۔ "جو عمل بغیر علم کے کیا جائے وہ گمراہی ہے" نیز فرمایا ۔ "بغیر علم کے عمل کرنے والا چکی کے گدھے کی مانند ہے جو ایک دائرے میں گھومتا رہتا ہے اور کبھی اپنے مقام تک نہیں پہنچتا" ۔ یہ دونوں حدیثیں "حکمتِ بوتراب" ترجمہ "غررالحکم و دررالکلم" میں موجود ہیں ۔ لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ عمل میں شدید کوشش کرے مگر صرف اس عمل میں جسکے بارے وہ حکمِ معصومؑ کا علم رکھتا ہو اور جسکا اسے علم نہ ہو اس عمل سے باز رہے ۔ اس

وقت تک جب تک اسے حکم کا علم نہ ہو جائے چاہے اس کوشش میں اسکی تمام عمر ہی کیوں نہ گذر جائے۔ اس صورت میں اسکا عمل نہ کرنا بے عملی نہیں کہلائے گی بلکہ اطاعت معصومؑ کہلائے گی کیوں کہ اطاعتِ معصوم ہی حقیقی عمل ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے ہماری کتاب کشف الحقائق کے باب ''شیعہ کیا کریں'' کا مطالعہ فرمایا جائے۔

آج کل راوی کون ہے؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کے تسلسل میں ایک ضمنی سوال کا جواب بھی دے دیا جائے جو اگرچہ بڑی سادگی سے کیا گیا ہے مگر میرے نزدیک بہت اہم ہے۔ سائل نے حضرتِ صاحب الزمانؑ کی ایک توقیع مبارک کا حوالہ دیا ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''تمھیں چاہئے کی حوادث واقعہ کے بارے میں ہماری حدیثوں کے راویوں سے رجوع کرو کیونکہ وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں اللہ کی حجت ہوں''۔ سائل نے دریافت کیا ہے کہ راوی کی طرف رجوع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ راوی موجود ہو لہٰذا یہ فرمائیے کہ آج کل راوی کون ہے جس کی طرف ہم رجوع کر سکیں؟۔

یہ سوال محض ناواقفیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور اسی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ راوی سے مراد مجتہد ہے۔ میرا مختصر ترین اور حتمی جواب یہ ہے کہ آج کل کوئی راوی نہیں ہے اور نہ ۳۲۹ھ کے بعد سے آج تک کسی راوی کا وجود رہا ہے۔ خود جناب محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ بھی محض محدّث تھے نہ کہ راوی یعنی وہ صرف راویوں کی بیان کردہ احادیث کو بیان کرنے اور جمع کرنے والے تھے۔ جاننا چاہئے کہ راوی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے قولِ معصومؑ براہِ راست معصومؑ سے سنا ہو اور دوسروں سے بیان کیا ہو۔ صرف ایسا شخص ہی ''امام کا راوی'' کہلاتا ہے۔ بعد میں جو لوگ

ایسے شخص سے روایت کرتے ہیں وہ ''راوی کے راوی'' ہوتے ہیں نہ کہ امام کے راوی۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے اپنے اپنے زمانے میں ہر کس و ناکس کو یہ حق نہیں دیا تھا کہ وہ ان سے روایت کر سکے۔صرف انکے نامزد کردہ کچھ معتمد لوگ ایسے تھے جو معصومؑ سے روایت کرنے کے مجاز تھے مثلاً زرارہؒ۔ یونسؒ بن عبدالرحمٰن اور جابر بن یزید جعفی وغیرہ۔ جابر کے متعلق امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''وہ ایسا دریا ہے کہ جتنا اس سے لیا جائے وہ کم نہیں ہوتا اور وہ اپنے زمانے کا باب (علم) ہے اور حجت خدا ابو جعفر محمدؑ بن علیؑ کیطرف سے مخلوق پر حجت ہے''۔ باب علم کی توضیح حضرت صادقؑ یوں فرماتے ہیں۔ ''جو کچھ وہ ہم سے نقل کرتا ہے وہ سچ اور صحیح ہے''۔ (منتہی الآمال (اردو) صفحہ ۶۷۸)۔

یہ بات ''وسائل الشیعہ'' میں درج روایت سے واضح ہو جائے گی جس میں کہا گیا ہے کہ عبدالعزیز نامی شخص امام رضاؑ کی زیارت سے مشرف ہوا تو اس نے عرض کی کہ مولاؑ میرا گھر بہت دور ہے اور میں مسائل پوچھنے کے لئے آپؑ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ آیا آپؑ یونس بن عبدالرحمٰن کی تائید فرماتے ہیں؟۔ کیا میں اپنے مسائل کا حل ان سے دریافت کرسکتا ہوں؟۔ امامؑ نے فرمایا ''ہاں''۔ یہ واقعہ ہمارے موقف کی واضح طور پر توثیق کرتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ بھی جانتے تھے کہ امامؑ سے روایت کرنے کے مجاز صرف چند مخصوص اور معتمد لوگ ہیں۔

اب رہی آج کے زمانے میں راوی کے موجود ہونے کی بات تو اس حقیقت سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے کہ اطاعت کرنے کے لئے اس شخص کا جسکی اطاعت کی جارہی ہے زمانی۔ مکانی یا جسمانی طور پر ہمارے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً اللہ نے ہمیں تین اطاعتوں کا حکم دیا ہے۔ اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت۔ اللہ کی اطاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ ہمارے روبرو آجائے تب ہی اطاعت ہوسکتی ہے۔ رسولؐ کی

اطاعت کا یہ مطلب نہیں کہ رسولؐ ہر زمانے میں جسمانی طور پر موجود رہیں۔اولی الامر کی اطاعت کا یہ مطلب نہیں کہ امامؑ ہر دور اور ہر زمانے میں ہمارے درمیان موجود رہیں۔اللہ کی اطاعت کے لئے احکام قرآن موجود ہیں۔ رسولؐ کی اطاعت کے لئے احادیثِ رسولؐ ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور اولی الامر کی اطاعت کے لئے اقوالِ معصومینؑ ہماری دسترس میں ہیں۔یہی حال راوی کا بھی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ راوی ہر زمانے میں جسمانی طور پر موجود رہے۔ہمارے لئے حجت اسکی بیان کردہ احادیث ہیں۔راوی سے رجوع کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مسائل کا حل راویوں کی بیان کردہ احادیث میں تلاش کیا جائے نہ کہ پیشہ ور مولویوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی عاقبت کو داؤ پر لگا دیا جائے۔

حقائق الصلوٰۃ

ایک برادرِ مومن نے فرمایا کہ "آپ کی کتاب کشف العقائد پڑھ کر ہمیں عقیدے کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔اس سے پہلے ہم غافل تھے اور اجمالی اقرار پر ہی اکتفا کرتے تھے لیکن ایک مولانا صاحب نے ایک عجیب شبہ ہمارے دماغ میں ڈال دیا ہے جسکے بارے میں آپ سے دریافت کرنا ہے۔مولانا صاحب کہتے ہیں کہ عقائد کی گہرائیوں میں جانے سے انسان ایک نظریاتی شخصیت بن کر رہ جاتا ہے جسکا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ایسا آدمی عمل کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ایسے لوگ نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں خاص طور پر نمازِ با جماعت کیطرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔آپ سے التماس ہے کہ آپ یہ الجھن دور فرمائیں کیونکہ وہ مولانا صاحب جگہ جگہ یہی پرچار کرتے پھر رہے ہیں اور جہاں تک ہماری اطلاع ہے صرف وہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے مولانا صاحبان یہی کام کر رہے ہیں"۔

یہ اعتراض کچھ ایسے اذہان کی پیداوار ہے جن میں شیطانِ رجیم نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور یہ سوال سنتے ہی جو پہلا مطلب ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ ناقص عقیدہ رکھنا چاہئے تاکہ اسکی عملیت متاثر نہ ہو اور یہ نتیجہ ہے اس مفروضے کا کہ عقیدہ عمل سے روکتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عمل کہتے ہی اسکو ہیں جو عقیدے کی پیداوار ہو اور عقیدے کے اثر کے طور پر ظاہر ہو۔عقیدہ اگر صحیح اور با معنی ہوگا تو عمل بھی صحیح اور با معنی ہوگا۔عقیدہ اگر ناقص اور بے معنی ہوگا تو عمل بھی ناقص اور بے معنی ہوگا۔عقیدے سے بھاگنے والا دراصل عمل کا بھی فراری ہے چاہے بظاہر وہ رات دن عبادت میں مشغول ہی

کیوں نہ نظر آتا ہو۔ عقیدے میں ڈنڈی مار کر جو بھی عمل کیا جائے وہ عمل کی تعریف میں آتا ہی نہیں بلکہ اسے خالص ریاءکاری کہا جاتا ہے۔ عقیدے اور عمل پر ہم ایک دوسرے سوال کے ذیل میں گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم صرف ایک اجمالی جائزہ لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب کی طرح مذہب شیعہ کے پیروکار بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جنھوں نے اپنے اوپر لفظِ شیعہ کا لیبل لگایا ہوا ہے کیونکہ وہ اتفاقاً کسی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوگئے ہیں اور اسی اعتبار سے شیعہ کہے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کُل مذہب اتنا ہے کہ کلمہ پڑھ لو۔ اصولِ دین یاد کرلو۔ پنجتن پاک۔ بارہ امام اور چودہ معصومین کے نام رٹ لو۔ یہ تو ہوگیا انکا عقیدہ۔ اسکے بعد ساری زندگی ریاءکاری۔ یہ ہوگیا انکا عمل۔ اب جو شے انکے مفروضہ عمل میں خلل انداز ہوگی وہ انھیں تکلیف دے گی اور وہ اسکی مخالفت کریں گے۔ ان لیبل والے حادثاتی شیعوں کے نزدیک عمل کیا چیز ہے یہ میں آپ کو چند عملی مثالوں سے سمجھاتا ہوں لیکن اس پہلے معصومینؑ کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ رسولؐ خدا جنابِ امیرؑ کے زانو پر آرام فرمارہے ہیں۔ عصر کی نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔ جنابِ امیرؑ نے عصر کی نماز چھوڑ دی لیکن رسولؐ اللہ کے آرام میں خلل نہیں پڑنے دیا۔

۲۔ مناقبِ ابنِ شہر آشوب (اردو) ج ۲ صفحہ ۲۴۔ ''ایک روز آنحضرتؐ جنابِ سیدہؑ کے پاس تشریف لائے۔ آپؑ نماز میں مشغول تھیں۔ رسولؐ اللہ کی آواز کو سنا۔ آپؑ نے نماز کو قطع کیا۔ مصلّے سے الگ ہوکر رسولؐ اللہ کو سلام کیا۔''

۳۔ ایک شخص مسجدِ نبوی میں نماز پڑھ رہا ہے۔ رسولؐ اللہ نے اسے آواز دی۔ اس نے دل میں سوچا کہ آنحضرتؐ اللہ سے زیادہ بڑے تو نہیں ہیں۔ میں تو اللہ کی عبادت کررہا ہوں۔ چنانچہ وہ نہیں آیا اور نماز جاری رکھی۔ جب وہ نماز تمام کرکے رسولؐ کی خدمت میں آیا تو آنحضرتؐ غضب ناک ہوئے اور اسکی طرف

سے منہ پھیر لیا۔ معصومینؑ کے اس طرزِ عمل کی تشریح میں آئندہ سطور میں کروں گا لیکن اتنا تو بہر حال آپ جان گئے کہ اگر ایک طرف معصومؑ ہو اور دوسری طرف نماز تو ایسے موقعے پر ہمارا کیا فرض ہے۔ معصومینؑ کے طرزِ عمل کے برخلاف جو عمل بھی کیا جائے گا وہ ریاء کاری ہی کہلائے گا۔ اب دیکھئے کہ ان نام نہاد شیعوں کا اندازِ فکر کیا ہے:۔

۱۔ مجلسِ حسینؑ برپا ہے اور مصائبِ مظلوم بیان ہو رہے ہیں۔ اتنے میں اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور یہ آواز سنتے ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتے ہوئے کچھ لوگ رونا دھونا چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجلس چھوڑ کر نماز پڑھنے چل دیتے ہیں۔ ائمہٴ معصومینؑ نے منافق کی جو علامات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسکے قول و عمل میں مطابقت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ جہاں بھی فرشِ عزا بچھتا ہے وہاں مظلومہٴ اوّل جناب فاطمۃ الزہراؑ خود تشریف لاتی ہیں لیکن ان بدبختوں کو اتنی حیا نہیں آتی کہ اذان کی آواز سن کر یہ لوگ اس مظلومہ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جنگِ صفین میں نیزوں پر قرآن دیکھکر علیؑ کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

۲۔ جلوسِ عاشورہ رواں دواں ہے۔ تبرکاتِ حسینیؑ مثلاً تازیہ۔ علم۔ تابوت اور ذوالجناح ساتھ ہیں۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اس لئے جلوس روک دیا جائے۔ سڑک پر صفیں قائم ہو جاتی ہیں اور نماز شروع کر دی جاتی ہے۔ ریاء کاری کی اس سے زیادہ واضح مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ اوّل اس لئے کہ اگر کسی کو نماز پڑھنا ہے تو وہ کسی قریبی مسجد میں جا کر پڑھ سکتا ہے پھر یہ کہ نماز کا وقت بھی اتنا وسیع ہوتا ہے کہ انسان گھر جا کر بھی یہ فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ اسکے لئے جلوس روکنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر دفاتر اور فیکٹریوں میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ بھی اذان کی آواز سن کر وہیں پر انہیں جما لیتے بلکہ نماز پڑھنے کے لئے مسجدوں میں جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شارع عام پر نماز پڑھنا خود

شرعی اعتبار سے بھی ممنوع ہے۔ لیکن حسینؑ دشمنی میں یہ لوگ شریعت کی مخالفت کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے سڑک پر ہی نماز شروع کر دیتے ہیں تا کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ شیعہ نماز کے اتنے پابند ہیں کہ اسکی خاطر حسینؑ جیسی ہستی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ حسینؑ کے لئے رسولؐ نے اپنی نماز روک دی تھی لیکن ان لوگوں کے نزدیک (معاذ اللہ) رسولؐ اور رسولؐ کی نماز کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے اور انکی ریاء کاری کی نماز اتنی وزنی اور مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہے جس کے سامنے نہ حسینؑ کوئی چیز ہے۔ نہ رسولؐ اور نہ خدائے رسولؐ کیوں کہ اسی خدا نے شارعِ عام پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے لیکن انکی نماز کے سامنے خود خدائے لم یزل بھی کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔ میں منتظمینِ جلوس پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ بھی عزاداری میں دراندازی کی ایک کوشش ہے۔ چونکہ خوش قسمتی سے عزاداری ابھی تک مجتہدین کی دست برد سے محفوظ ہے اس لئے یہ لوگ نماز کے بہانے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عزاداری پر بھی انہی کا کنٹرول ہے اور یہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں جلوس کو روک سکتے ہیں۔

اب میں آپ کے لئے دو واقعات ہدیہ کرتا ہوں جن میں سے ایک آپ بیتی ہے اور دوسری ایک روایت۔ آپ بیتی یہ ہے کہ میں نے ایک عابدِ شب زندہ دار سے سوال کیا کہ جب امامؑ کا ظہور ہوگا تو آسمان سے ایک ندا آئے گی کہ فلاں بن فلاں نے ظہور فرمایا۔ جلدی سے اسکی نصرت کو پہنچو۔ اگر یہ ندا ایسے وقت آئی جب نماز کا وقت ہوا تو آپ نماز پڑھیں گے یا نصرتِ امامؑ کے لئے جائیں گے؟۔ فرمایا۔ ''میں پہلے نماز پڑھوں گا اسکے بعد جاؤں گا''۔

جو روایت میں بیان کر رہا ہوں وہ مناقبِ ابنِ شہر آشوب (اردو) ج ۲ سے اخذ کی گئی ہے۔

جب امام زین العابدینؑ کا جنازہ جا رہا تھا تو ایک شخص سعید بن مسیّب جلوسِ جنازہ سے کٹ کر مسجدِ نبوی کی طرف چلا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم امامؑ کی

نمازِ جنازہ نہیں پڑھو گے؟ ۔اس نے کہا۔" میں دو رکعت نماز مسجد میں پڑھ لونگا۔ رسولؐ اللہ نے جبریل کے واسطے سے حدیث بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ" جو میرا بندہ مجھ پر ایمان لایا اور آپ محمدؐ کی تصدیق کی اور لوگوں سے علیحدہ ہو کر تمھاری مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی میں اسکے اگلے پچھلے گناہ بخش دوں گا"۔ میں نے اس سے کوئی چیز افضل نہیں دیکھی ۔سعید بن مسیّب کہتا ہے کہ جب میں مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو آسمان سے ایک تکبیر بلند ہوئی ۔اسے زمین سے ایک تکبیر نے جواب دیا پھر آسمان سے ایک تکبیر نے جواب دیا پھر اسے زمین کی تکبیر نے جواب دیا۔اس بات سے خوفزدہ ہو کر میں منہ کے بل گر پڑا۔آسمان کے رہنے والوں نے سات تکبیریں کہیں اور زمین کے رہنے والوں نے بھی سات تکبیریں کہیں۔لوگوں نے علیؑ بن حسینؑ کی نمازِ جنازہ پڑھی ۔یہ میرے لئے کھلا ہوا گھاٹا ہے۔پھر رو پڑا اور کہا۔" کاش میں نے امام زین العابدینؑ کی نمازِ جنازہ پڑھی ہوتی"۔

شاید یہی وہ عبادت ہے جسکو معیار بنا کر یہ لوگ مومنین پر طعن کرتے ہیں حالانکہ جس شخص نے ایمان کی بو بھی نہ سونگھی ہو وہ کیسے جان سکتا ہے کہ مومن کیا چیز ہے اور اسکی خصوصیات کیا ہیں۔ان لوگوں کے نزدیک تو نماز محض ایک activity ایک گہما گہمی ۔ ملنے جلنے کا بہانا اور مسجدوں میں بیٹھ کر سیاسی منصوبے بنانے کا نام ہے یا پھر ایک نشہ ہے ۔ایک عادت ہے جسکا عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔اصولِ کافی میں امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان درج ہے "خبردار کسی کے نماز روزے سے دھوکا نہ کھانا کیونکہ بعض اوقات انسان ان چیزوں کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ اگر یہ نہ کرے تو اسے وحشت ہونے لگتی ہے"۔ عبادت وہ ہے جس میں انسان اللہ کی خوشنودی کے لئے عمل کرے اور عادت وہ ہے جس میں انسان اپنے نفس کی خوشنودی کے لئے عمل کرے ۔اسی کتاب میں کسی مقام پر ہم انشاء اللہ حقیقتِ عمل پر گفتگو کریں گے۔یہاں صرف یہ واضح کرنا

مقصود ہے کہ لیبل والے حادثاتی شیعہ تو ایک مومن کی عبدیت وعبادات کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ مومن کا تو ایک لمحہ بھی عبادتِ خدا سے خالی نہیں ہوتا۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''جو سانس نکالتا ہے ہمارے متعلق فکر کرنے میں۔ ظہورِ قائم آلِ محمدؑ کے متعلق اور غمناک ہوتا ہے ہماری مظلومیت پر تو اسکا یہ عمل بمنزلۂ تسبیح کے ہے اور ہمارے معاملے میں رنجیدہ ہونا عبادت ہے اور ہمارے راز کو چھپانا جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ (اصولِ کافی۔ کتاب ایمان وکفر۔ باب ۲۲۶۔ حدیث ۱۶) لہٰذا مومن کو یہ لوگ بھیڑ بھاڑ۔ گہما گہمی اور دنگا فساد میں تلاش نہ کریں۔ وہ تو ان تمام ہنگاموں سے الگ تھلگ کسی گوشے میں اپنے ایمان کو سینے سے لگائے اسکی حفاظت کر رہا ہوگا۔ مومن کی عبادت کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ

اشکِ ندامت دستِ دعا اور خاموشی
تنہا میں اور میرا خدا اور خاموشی

ہمارے دور کے لئے ائمہؑ نے فرمایا ہے ''اُس زمانے میں اپنے ایمان کو بچانا ایسا ہوگا جیسے کوئی اپنی ہتھیلی پر انگارا رکھے ہوئے ہو''۔ (علائم الظہور)۔ آپ خود غور فرمایئے کہ کوئی کتنی دیر تک اپنی ہتھیلی پر انگارا رکھ سکتا ہے؟۔ لیکن مومن تو تمام زندگی یہی کام کرتا ہے۔ معاشرے کی رگوں میں جو منافقت سرایت کئے ہوئے ہے اس سے خود کو محفوظ رکھنا اور ان موانعات کے باوجود اپنے ایمان کو بچا لیجانا یہ صرف مومن ہی کا کام ہوسکتا ہے اور یہ کتنا مشکل کام ہے اسے اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے

گھر کے باہر تیز ہوا اور ہوا کا شور
گھر کے اندر ایک دِیا اور خاموشی

یہاں گھر سے مراد جسم ہے۔ باہر سے مراد ترغیباتِ دنیاوی۔ اندر سے مراد دل اور دِیا سے مراد ایمان ہے۔

جہاں تک نمازِ جماعت کا تعلق ہے تو جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا وہ تو

چاہے نماز با جماعت پڑھیں یا فرادیٰ دونوں برابر ہیں اس لئے کہ ریاء کاری چاہے با جماعت کی جائے یا اکیلے میں بہر حال ریاء کاری ہی کہلائے گی لیکن اگر آپ مومن کی بات کرتے ہیں تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مومن کبھی نماز فرادیٰ پڑھتا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ نماز جماعت ہی پڑھتا ہے اور اگر نماز جماعت نہیں پڑھتا تو وہ مومن ہی نہیں ہے۔ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے میں پہلے ایک عقلی دلیل پیش کرتا ہوں اسکے بعد نص معصومؑ پیش کروں گا۔

اگر پوچھا جائے کہ مسجدوں میں اذان کیوں دی جاتی ہے اور حیّ علی الصلوٰۃ۔ حیّ علی الفلاح اور حیّ علیٰ خیر العمل کے مخاطب کون ہوتے ہیں؟ اسی طرح یہ کہ اقامت کیوں کہی جاتی ہے اور اسکے مخاطب کون ہوتے ہیں؟ تو بلا استثنیٰ ہر شخص یہی جواب دے گا کہ اذان لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لئے دی جاتی ہے اور ان کلمات کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو ابھی مسجد میں نہیں آئے ہوتے۔ اسی طرح اقامت نماز کی طرف متوجہ کرنے اور صفیں درست کرانے کے لئے کہی جاتی ہے اور اسکے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسجد میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات طے ہے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ جب آدمی تنہا (فرادیٰ) نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو اس وقت اسے اذان و اقامت کہنے کا کیوں حکم ہے؟ اذان دے کر وہ کس کو بلانا چاہتا ہے؟ اور اقامت کہہ کر وہ کونسی صفیں درست کرانا چاہتا ہے؟۔ جو شخص بقول امیر المومنینؑ چکی کے گدھے کی مانند ہے وہ تو شاید کبھی بھی ان امور پر غور و فکر نہ کرے اور ایک ہی دائرے میں گھومتا رہے لیکن ہر صاحب فہم و شعور اس بات پر ضرور تدبّر کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کبھی فعل عبث کا حکم نہیں دیتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ اسکے بندے مجنونانہ حرکات کر کے تضحیک کا نشانہ بنیں۔ پس ماننا پڑے گا کہ تنہائی میں نماز پڑھنے کے باوجود انسان کسی نہ کسی کو ضرور بلاتا ہے اور کوئی نہ کوئی صف اسکے پیچھے ضرور ہوتی ہے جسے درست کرانے کے لئے وہ اقامت کہتا ہے۔ اب یہ بات کہ وہ کسے بلاتا ہے اور صفیں کونسی ہوتی

ہیں اسکے لئے ہم فروعِ کافی ۔کتاب الصلوۃ ۔باب ۱۷کی حدیث ۸ پیش کرتے ہیں جس سے بات واضح ہوجائے گی۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

''اذا اذنت واقمت صلّی خلفلک صفّان من الملا ئکۃ و اذا اقمت صلّی خلفلک صفّ من الملائکۃ''۔

ترجمہ:۔''جب تم اذان و اقامت کہوتو دو صفیں ملائکہ کی تمھارے پیچھے ہونگی اور جب (صرف) اقامت کہو گے تو ایک صف ہوگی''۔اس سے ثابت ہوگیا کہ مومن عبث اذان و اقامت نہیں کہتا بلکہ ملائکہ کونماز کے لئے بلاتا ہےاور انہی کی صفوں کو درست کرتا ہےاور وہ اسکے مقتدی بن کرنماز پڑھتے ہیں۔ایسی نماز کا موازنہ اس نماز سے کیونکر کیا جاسکتا ہے جوکسی ایسے شخص کے پیچھے پڑھی جارہی ہو جسکے بارے میں یہ تک نہ معلوم ہو کہ وہ شرائطِ امامت نماز کو بھی پورا کرتا ہے کہ نہیں۔

طرفہ تماشا

ہمارے معاشرے میں ایک عجیب رسمِ بد نے رواج پالیا ہے کہ کوئی بھی اپنی انفرادی ذمہ داری قبول کرنے کو تیارنہیں اور ہرکوئی اپنی ذمہ داریوں کی گٹھڑی حوزۂ علمیہ والوں کے سر پر پھینک آتا ہے۔حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو جوکوئی بھی کسی کی اقتداء میں نماز پڑھتا ہےتو یہ خالصتاً اسکی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ نے امامتِ نماز کے لئے جوشرائط لازم قرار دیں ہیں ان پر وہ پیش نماز پورا اترتا ہے یا نہیں۔لیکن یہاں اللہ کی مقرر کی ہوئی تمام شرائط کو ساقط کردیا گیا ہےاور فقط ایک شرط رکھ دی گئی ہے کہ پیش نماز کے پاس حوزۂ علمیہ والوں کا اجازہ ہے یا نہیں حالانکہ حوزۂ علمیہ والوں کے لئے یہ بات محال ہے کہ ہزاروں میل دور کی کسی بستی سے آئے ہوئے آدمی کے بارے میں یہ یقین کرسکیں کہ وہ مقررہ شرائط پوری کرتا ہے یانہیں کیونکہ وہ ان کے پاس سال چھ مہینے ہی رہتا ہے

اور اتنے مختصر عرصے کے لئے شریف اور پاکباز بنے رہنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ میں شرائط بیان کرتا ہوں جن سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان شرائط کو پرکھنا اور جانچنا کس کا کام ہو سکتا ہے۔ امامت نماز کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ آدمی حلالی ہو۔ اب حوزۂ علمیہ والے بچاروں کو کیا پتا کہ یہ شخص جس بستی سے آیا ہے وہاں اسکے حسب ونسب کی شہرت کیسی ہے نہ انکے پاس کوئی ایسا سسٹم ہے کہ وہ کسی کو اسکی بستی میں بھیج کر چھان بین کرائیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ فاسق العقیدہ نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عقیدہ ایک باطنی شے ہے جسکو انسان بہ آسانی چھپا سکتا ہے اور بعض اوقات برسہابرس کی رفاقت کے باوجود انسان کے عقیدے کا پتہ نہیں چلتا۔ میں جب کوئٹہ میں تھا تو وہاں کی جامع مسجد میں ایک شخص دس سال سے نماز پڑھا رہا تھا۔ ایک روز پولیس نے مسجد پر چھاپہ مارا اور اس شخص کو گرفتار کر کے لے گئی۔ پتہ چلا کہ وہ سکھ تھا اور کسی دشمن ملک کا جاسوس تھا۔ ابھی چند دن ہوئے میں نے اخبار میں اسی سے ملتا جلتا واقعہ پڑھا کہ ایک پیش نماز پکڑا گیا جو دراصل یہودی تھا اور ایسی باتیں گاہے بگاہے منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ پھر بھلا حوزۂ علمیہ والے اسکے عقیدے کا تعین کیسے کر سکتے ہیں؟۔ تیسری شرط یہ ہے کہ علم میں اپنے تمام مقتدیوں سے افضل ہو۔ حوزۂ علمیہ والوں کو کیا معلوم کہ یہ شخص جہاں جا کر نماز پڑھائے گا وہاں کے لوگوں کا علمی معیار کیا ہے اور کیا یہ واقعی ان تمام لوگوں سے بڑا عالم ہے؟ چوتھی شرط کردار کی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اتنے تھوڑے عرصے میں کسی کے کردار کے بارے میں یقینی نظریہ قائم کرنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ آئے دن مسجدوں کے حجروں سے ناپسندیدہ خبریں آتی رہتی ہیں۔ کراچی کے مضافات میں ایک مسجد کے ایک پیش نماز کی بدکاریاں اس قدر بڑھ گئیں کہ انھیں زبردستی مسجد سے نکالنا پڑا۔ پھر وہ قریبی علاقے کی ایک اور مسجد میں چلے گئے جہاں کے لوگوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے انکے پیچھے نماز پڑھنا قبول کر لیا صرف اس لئے کہ

انکے پاس حوزۂ علمیہ والوں کا اجازہ تھا۔آپ حضرات نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ حوزۂ علمیہ والوں کے لئے یہ محالات سے ہے کہ وہ کسی اجنبی شخص کے بارے میں یہ یقین حاصل کرسکیں کہ وہ واقعی شرائطِ امامتِ نماز پر پورا اتر تا ہے یا نہیں۔وہ تو بس اتنا کام کرتے ہیں کہ قراءت ٹھیک کرا دیتے ہیں۔دو چار قرآنی سورے رٹا دیتے ہیں۔نماز پڑھانے۔نکاح پڑھانے اور طلاق دلانے کا طریقہ سکھادیتے ہیں۔ظاہری حلیہ مولویوں والا بنا دیتے ہیں۔اس پر عمامہ اور عبا و قبا لا د دیتے ہیں اور بس۔اب وہ جانے اور اسکے پیچھے نماز پڑھنے والے جانیں۔اسکے برخلاف جس بستی میں وہ پیدا ہوا جہاں وہ پلا بڑھا جہاں بچپن سے جوانی تک اسکی نشست و برخاست رہی اس بستی کے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ اسکے حسب ونسب کی شہرت کیسی ہے۔اسکا عقیدہ کیا ہے۔اسکی علمی حیثیت کیا ہے اور اسکا کردار کیسا ہے اور صرف وہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس میں امامتِ نماز کی شرائط موجود ہیں یا نہیں۔قرآنِ مجید نے بھی یہی اصول مقرر کیا ہے۔چنانچہ توبہ ۱۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔''اور یہ ممکن نہیں کہ تمام مومنین ایک ساتھ (حصولِ علم کے لئے) نکل پڑیں۔پھر آخر ان میں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت کیوں نہیں نکلتی تا کہ دین کی گہری سمجھ حاصل کریں اور تا کہ جب وہ اپنے لوگوں میں واپس آئیں تو انھیں عذابِ الٰہی سے ڈرائیں شاید وہ لوگ اپنے کو (عذابِ الٰہی) سے بچائیں''۔۔معلوم ہوا کہ بستی والوں میں سے ہی کوئی ہونا چاہئے جو لوگوں کی مذہبی قیادت کرے نہ کہ کوئی درآمد کردہ آدمی۔وہ لوگ جو کسی ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہوں جسکے بارے میں انھیں علم تک نہ ہو کہ اسکے پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہے یا نہیں اور یہ سمجھتے ہوں کہ اگر جائز نہیں بھی ہے تب بھی اس کی تمام تر ذمہ داری حوزۂ علمیہ والوں پر ہے اور ہم بری الذمہ ہیں تو ایسے لوگ جتنا وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں وہ سارا وقت نا فرمانی خدا میں گذارتے ہیں اور یہ نا فرمانی نہ کرنے پر مومنین کو مطعون ٹھہراتے ہیں۔بعض لوگ اس معاملے میں

تقیہ کی آڑ لیتے ہیں لیکن اُنہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تقیہ کا ایک محل ہوتا ہے اور بے محل تقیہ کرنا حرام ہے۔

پہلی شرط

میں پوری قوّت سے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ دنیا بھر میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو حلالی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ کسی کے پاس بھی اس بارے میں کوئی دلیل نہیں سوائے اس کے کہ اس کی ماں نے بتایا ہے کہ فلاں شخص تمھارا باپ ہے۔ یہ فخر صرف مذہب حقہ خیر البریۃ شیعہ اثنا عشری کو حاصل ہے کہ اس کے پاس ایک واضح اور یقینی معیار موجود ہے جس پر جانچ اور پرکھ کر یہ بات اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ کون طیب الولادت ہے اور کون خبیث الولادت۔ اور وہ معیار رسول اللہؐ کا وہ قول ہے جس میں آپؐ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ تجھ سے محبت نہیں کرے گا مگر حلال زادہ اور تجھ سے دشمنی نہیں رکھے گا مگر حرام زادہ''۔ خود زمانہ رسولؐ اور جناب امیرؑ میں یہ معیار عملی طور پر موجود تھا۔ میں نے طبقاتِ ابن سعد میں پڑھا ہے کہ اس زمانے میں بچہ جب تھوڑا سا سمجھ دار ہو جاتا تھا تو اس کا باپ اسے لیکر اس راستے پر کھڑا ہو جاتا تھا جس سے جناب امیرؑ کو گذرنا ہوتا تھا۔ جب آپؑ وہاں سے گذرتے تو وہ اپنے بیٹے سے پوچھتا۔ ''یہ شخص (یعنی حضرت علیؑ) تجھے کیسا لگتا ہے؟''۔ اگر بچہ کہتا کہ ''اچھا لگتا ہے'' تو وہ اسے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا اور خوش خوش گھر چلا جاتا۔ اور اگر بچہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو اُسے وہیں زمین پر پٹخ دیتا اور یہ کہتا ہوا چل دیتا کہ ''خدا کی قسم تیری ماں نے مجھ سے خیانت کی ہے''۔ پس اسی معیار پر اُسے بھی پرکھا جائے گا جس کی اقتدا ء میں کسی کو نماز پڑھنا ہے کہ وہ علیؑ کا دوست ہے یا دشمن اور جیسا کہ میں نے کشف الحقائق میں عرض کیا تھا کہ دشمن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک جان کا دشمن اور دوسرا شان کا دشمن۔ اسلیئے ہمیں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ شخص مقصر تو نہیں ہے؟ کیونکہ معصومینؑ نے مقصر کو اپنا دشمن کہا ہے۔

دوسری شرط

جیسا کہ عرض کیا گیا عقیدہ ایک باطنی شئے ہے۔ کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ میں شیعہ ہوں اور میرے پاس قُم کا اجازہ ہے اُس کے عقیدے کا تعین نہیں کیا جا سکتا بلکہ عقیدہ وہ ہے جو انسان کے اعمال و افعال سے ظاہر ہوتا ہو۔ اگر کسی کے اعمال و افعال سے عداوتِ خدا ظاہر ہو رہی ہو تو اُس کے قول کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے پاس بہت سی مثالیں ہیں لیکن بغرضِ اختصار یہاں صرف چار مثالیں دی جا رہی ہیں تا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا جائزہ خود لے سکے۔

۱۔ ایک پیش نماز نے خطبۂ نمازِ جمعہ میں اللہ کے ایک برگزیدہ نبیؑ کا واقعہ کچھ یوں سنایا کہ اُس نبیؑ نے ایک فاحشہ عورت پر تبلیغ کی اور جب وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو گئی تو (بطورِ انعام) اُس سے شادی کر لی اور اِس عورت کے بطن سے (معاذ اللہ) بہت سے انبیأء پیدا ہوئے۔ کیا انبیأء کی اس سے زیادہ توہین کی جا سکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود لوگ اس پیش نماز کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے

۲۔ ایک پیش نماز نے ایک بہت بڑا بینر لکھوایا اور اسے سڑک کے بیچوں بیچ آویزاں کرایا۔ بینر پر یہ عبارت درج تھی۔

''حضرت علیؑ نے خطبہ کے دوران فرمایا۔'' اے لوگو جب تک میں سیدھا رہوں اُس وقت تک میری اطاعت کرنا اور جب میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا''۔

جس پینٹر سے یہ بینر لکھوایا گیا وہ میرا بہت قریبی شناسا ہے اور میرے دوست کا بیٹا ہے۔ میرے ایک اور دوست نے جب اس بینر کے متعلق سُنا تو وہ خود اُس پیش نماز سے ملنے گئے اور اُس سے یہ بینر آویزاں کرنے کی وجہ دریافت کی۔ اُس نے جواب دیا۔ ''روایات میں ایسا آیا ہے''۔ میرے دوست نے پوچھا کہ اگر آیا بھی ہے تو اُسے آویزاں کرنے کی کیا ضرورت در پیش آ گئی؟۔ اس بات کا وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ جملہ خلیفۂ

اوّل کا ہے جو اُنھوں نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا۔ کیا اس حرکت کا مقصد سوائے علیؑ کی توہین کرنے کے کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ اور کیا یہ حرکت کرنے والا علیؑ کا کھلا دشمن نہیں ہے؟۔ لیکن لوگ آج تک اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔

۳۔ اسی پیش نماز نے کئی روز تک بغیر ''علی'' ولی اللہ'' کے اذان دی اور اسی پر اصرار کرتا رہا کہ اصل اذان وہی ہے جس میں علی' ولی اللہ نہ ہو۔ بعض بااثر لوگوں کی فہم و فراست کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اسی طرح ایک اور مسجد کے پیش نماز نے بغیر علی' ولی اللہ کے اذان دی جس پر کافی ہنگامہ ہوا اور ہتھیار تک نکل آئے مگر وہ شخص اپنی بات پر اڑا رہا۔ بہر حال انتظامیہ نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو رفع دفع کرایا۔ کیا یہ علیؑ سے بانگ دہل دشمنی کا اعلان نہیں ہے؟ لیکن لوگوں نے ان دونوں پیش نمازوں کے پیچھے نماز پڑھنا نہیں چھوڑی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نماز ہے یا جنون؟ جسکا مقصد عبادتِ خدا نہیں بلکہ صرف اپنا شوق پورا کرنا ہوتا ہے چاہے احکام خدا کی خلاف ورزی ہوتی ہو یا توہینِ اہلبیتؑ۔ کیا ایسی ہی نمازوں کے لئے مومنین کو طعنے دئے جاتے ہیں؟۔

کبھی یہ گمان بھی نہیں کرنا چاہئے کہ پیش نماز کا فعل اسکے ساتھ ہے اور ہمارا فعل ہمارے ساتھ۔ ہمیں تو صرف اسکے پیچھے نماز پڑھنا ہے اسکے علاوہ ہمارا اس سے کیا تعلق؟ یہ ایک انتہائی مفسد نظریہ ہے کیونکہ دینِ اسلام میں معیّت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ گذشتہ امتوں پر جو عذاب آئے اسکا نشانہ ان امتوں کے برے لوگ ہی نہیں بنے بلکہ انکے نیک لوگ بھی عذاب کی لپیٹ میں آگئے۔ صرف اسی معیّت کی وجہ سے۔ حارث بن نعمان فہری نے جب اللہ سے عذاب مانگا تو عذاب صرف اسی پر نازل نہیں ہوا بلکہ اسکی اونٹنی بھی اسکی لپیٹ میں آئی۔ صرف اسی معیّت کی وجہ سے۔ اسی لئے ہمیں حکم ہوا۔ ''کونوا مع الصادقین''۔ یعنی

ہمیشہ معیّت اہلبیتؑ میں رہو۔

اس موقعہ پر ضروری ہے کہ ہم مذہب کے اہم ترین فریضے یعنی نماز کا تعارف کرائیں تا کہ لوگ نفس پرستی کے بجائے عبادتِ خدا کی طرف متوجہ ہوں۔

معرفۃ الصلوٰۃ

جب ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو ہمارا سر۔ ہاتھ۔ جسم اور آنکھیں سب ہی حرکت کرتے ہیں لیکن کوئی ہمیں دیوانہ نہیں کہتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان حرکات کا ایک مقصد ہے لیکن اگر کوئی کسی محفل میں بیٹھ کر بلا مقصد اپنا سر ہلانے لگے۔ ہاتھوں اور جسم کو حرکت دینے لگے اور اپنی آنکھیں گھمانے لگے تو لوگ یقیناً یہ گمان کریں گے کہ اس شخص کے دماغ میں کوئی نہ کوئی خلل ضرور ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اسکی ان حرکات وسکنات کا کوئی مقصد نہیں پاتے۔ اسی طرح اگر کوئی انتہائی نفیس قسم کے اخروٹ خرید کر لائے پھر انھیں توڑ کر انکا مغز زمین پر پھینک دے اور انکے چھلکے چبا تا پھرے تو ایسے شخص کی صحتِ دماغی پر یقیناً شک کیا جائے گا۔ یہی صورتِ حال نماز (اور دیگر تمام فرائضِ دینی) کی بھی ہے۔ اگر کوئی جانتا ہے کہ حقیقتِ نماز کیا ہے اور یہ جان کر نماز پڑھتا ہے تو نماز میں جو جو حرکات و سکنات وہ کرے گا وہ عاقلانہ کہلائیں گی۔ لیکن اگر کسی کو حقیقتِ نماز کا علم نہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ کھڑا ہونا۔ جھکنا۔ لیٹنا۔ بیٹھنا اور چند کلمات بد بدانے کا ہی نام نماز ہے تو اسکی حرکات وسکنات کو یقیناً مجنونانہ افعال کہا جائے گا۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ اس معاملے میں اربابِ شریعت کا موقف کیا ہے۔ انھوں نے ایک لفظ یاد کرلیا ہے اور وہ ہے ''تعبّد'' جسکا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو کچھ حکم ملے نہ تو اسکی حقیقت کو جانا جائے اور نہ ہی جاننے کی کوشش کی جائے بلکہ آنکھ بند کر کے اس پر عمل شروع کر دیا جائے حالانکہ ہر صاحبِ عقل اس بات سے واقف ہے کہ بغیر معرفت کے نہ عقیدہ صحیح ہوسکتا ہے اور نہ عمل۔ ہر حکم کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اگر

بغیر مقصد کو جانے اس حکم پر عمل کیا جائے گا تو حماقتیں ہی سرزد ہونگی مثلاً اگر ایک مالک اپنے نوکر سے کہے کہ "میاں ذرا بازار جانا ہے" تو نوکر کا فرض ہے کہ وہ یہ پوچھے کہ بازار جا کر کیا لانا ہے کیونکہ اصل مقصد بازار جانا نہیں بلکہ وہ شے لانا ہے۔ بازار جانا صرف وہ شے لانے کا ذریعہ ہوگا۔ اب اگر وہ نوکر بغیر پوچھے گچھے بازار کے چکر لگانا شروع کردے اور مالک کو وہ شے نہ ملے جو وہ منگانا چاہتا تھا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے نوکر کو شاباش دے گا؟۔ یہی حال احکام کا ہے۔ ہر حکم کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور عمل بجا لانے کا مقصد اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات میرے اپنے ذہن کی اپج ہوتی تو اسکو ماننے میں تامل کیا جاسکتا تھا حالانکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنکا فیصلہ خود عقل کرتی ہے۔ ہر بات کی سمعی دلیل لانا بہت مشکل کام ہے لیکن جب مخالفت برائے مخالفت کا رویہ اپنا لیا جائے تو اس صورت میں مجھے دوہری محنت کرنا پڑتی ہے کہ عقل سے بھی ثابت کروں اور نقل سے بھی۔ لیکن بہر حال چونکہ مجھے اپنے موضوع سے انصاف کرنا ہے اس لئے اپنے موقف کی دلیل کے طور پر میں علل الشرائع (اردو صفحہ ۴۸۵) سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں۔

"حضرت امیر المومنینؑ بیت اللہ کے صحن سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اسکی نماز کی تعریف کی اور پھر کہا۔ "اے شخص تو اپنی نماز کی تاویل اور اصل مطلب بھی جانتا ہے؟" اس نے عرض کیا۔ "اے بہترین خلق خدا کے ابن عم (یعنی اے رسولؐ اللہ کے چچا زاد بھائی) کیا حکم اور تعبد کے سوا نماز کی کوئی تاویل اور کوئی مطلب بھی ہے؟"۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ "اے شخص سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کوئی حکم دے کر مبعوث کیا اس حکم میں کچھ متشابہ اور اسکی تاویل وتنزیل بھی ہے اور یہ تعبد کی بنا پر ہے۔ پس جو شخص اپنی نماز کی تاویل اور اصل مطلب کو نہ سمجھے تو اسکی نماز کل کی کل دھوکا ہے۔ ناقص ہے۔ نامکمل ہے"۔

پس عقل و نقل دونوں سے ثابت ہو گیا کہ نماز کا کوئی مقصد اور حقیقت ہے جسکو سمجھے بغیر نماز کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز اہم ترین ارکانِ دین سے ہے اور اسکا انکار کرنے والا کافر ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نماز پڑھنے سے پیشتر حقیقت نماز کا علم ہونا لازمی ہے ورنہ بقول جناب امیرؑ اسکی حیثیت ایک فعلِ عبث کے سوا کچھ نہ ہوگی۔اور یہیں سے تعبّد کی حقیقت بھی واضح ہوگئی یعنی تعبّد کا مطلب ہے کسی حکم کی حقیقت کو جان کر اس پر عمل کرنا۔ ہر باخبر اس بات سے واقف ہے کہ ہر شے کے چار وجود ہیں۔
وجودِ ملفوظی۔وجودِ مکتوبی۔وجودِ ذہنی اور وجودِ حقیقی اور ان چاروں میں اصل شے وجودِ حقیقی ہوتا ہے۔ہم روٹی کی مثال لیتے ہیں۔
''روٹ ی'' اسکا وجودِ ملفوظی ہے یعنی الفاظ کے ذریعے سے بیان کی ہوئی۔اگر کوئی روٹی کی تصویر بنا دے تو یہ اسکا وجودِ مکتوبی ہوگا کیونکہ اس میں الفاظ کو ذریعۂ بیان نہیں بنایا گیا۔ ہمارے ذہن میں روٹی کا جو تصور ہوتا ہے وہ اسکا وجودِ ذہنی ہوتا ہے اور اصل جو چیز ہے یعنی آٹے سے بنی ہوئی شے وہ اسکا وجودِ حقیقی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مقصودِ حقیقی روٹی کا وجودِ حقیقی ہے کیونکہ اوّل الذکر تین وجودوں سے ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتا چاہے ہم دن بھر روٹی روٹی کہتے رہیں یا اسکی تصویریں بناتے رہیں یا اسکے بارے میں سوچتے رہیں۔ان تینوں وجودوں سے ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں پورا ہوگا جبکہ روٹی کا وجودِ حقیقی حاصل کر لیا جائے۔اس اصول پر نماز کے بھی چار وجود ہیں۔اسکا وجودِ ملفوظی ''ن م از'' ہے۔قیام و رکوع و سجود و قعود کے ذریعے ہم جو ایک شکل بناتے ہیں وہ نماز کا وجودِ مکتوبی ہے۔نماز پڑھتے وقت جو تصور ہمارے ذہن میں ہوگا وہ ہماری نماز کا وجودِ ذہنی ہوگا اور ان تینوں وجودوں کے ذریعے ہم جس شے کا حصول چاہتے ہیں وہ نماز کا وجودِ حقیقی ہے۔
ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ اگر ہمیں یہی پتہ نہیں کہ ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں

تو اوّل الذکر تینوں وجود ہمارے لئے بیکارِ محض ہیں لہٰذا نماز کا ارادہ کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ حقیقتِ نماز کو جانا جائے اور اسے اپنا مقصود بنایا جائے۔اس مرحلے پر ہم پہلے دو وجودوں سے گذر کر تیسرے وجود یعنی وجودِ ذہنی پر تدبّر کرتے ہیں۔

اہم ترین سوال

یہ بات نا قابلِ تردید ہے کہ بغیر تصور کے انسان نہ کسی سے محبت کر سکتا ہے نہ اطاعت کر سکتا ہے اور نہ عبادت۔لہٰذا ضروری ہوا کہ نماز پڑھتے وقت آپکے ذہن میں کوئی نہ کوئی تصور موجود رہے۔اب میں اپنے تمام قارئین کی خدمت میں ایک سوال پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ اس سوال کا جواب دیں گے کیونکہ اسی سوال پر پوری نماز کا انحصار ہے۔

سوال یہ ہے:۔

نماز پڑھتے وقت آپکے ذہن میں کس کا تصور ہوتا ہے؟

بظاہر اسکے دو جوابات ہو سکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ انسان بالکل خالی الذہن رہے اور شاید اسی کا نام خضوع وخشوع رکھا گیا ہے حالانکہ یہ صورت قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر انسان ایک لمحہ کے لئے بھی خالی الذہن ہو جائے تو اسے فوراً نیند آ جائے گی لہٰذا یہ صورت تو ہو نہیں سکتی۔دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ذہن میں اسکا تصور ہو جسکی عبادت کی جارہی ہے۔یہ صورت بھی نا قابلِ قبول ہے کیونکہ جسکی عبادت کی جارہی ہے وہ خداوندِ لم یزل ہے جو ہمارے تصور میں نہیں آ سکتا کیونکہ وہ ہماری عقل وفہم وادراک سے بالاتر ہے لہٰذا اگر کوئی اسکا تصور کرتا ہے تو یقیناً وہ تصور خود اسکا ذہنی مخلوق ہوگا اور اس صورت میں نماز پڑھنے والا خالص بت پرست کہلائے گا۔

جس نے سوچا تجھے اس نے تیری حد بندی کی
جو تجھے پوجتے ہیں تجھ کو صنم جانتے ہیں

اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ ذہن میں حقیقتِ نماز کا تصور ہو۔ اسکے علاوہ کوئی اور صورت ہے ہی نہیں۔ اس اعتبار سے صحتِ نماز کو یقینی بنانے کے لئے لازمی ٹھہرا کہ حقیقت نماز کی کھوج لگائی جائے اور وقتِ نماز اسی حقیقت کا تصور ذہن میں رکھا جائے۔

دو نمازیں

گفتگو کا آغاز کرنے سے پیشتر یہ اصول ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کسی بھی صورت میں ایک افضل عمل کو ایک مفضول عمل کی خاطر ترک نہیں کرا سکتا کیونکہ یہ بات منافی عدل ہے اور عدل کو اصلِ دین ماننے والے اس بات کا انکار ہرگز نہیں کر سکتے۔ جب یہ اصول طے ہو گیا تو اب ہم آپکی خدمت میں نماز کے سلسلے میں دو قسم کے احکام پیش کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی نماز کے احکام کچھ اس طرح ہیں:۔

۱۔ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے اور اس نے اپنا اثاثہ اور نقدی برابر میں رکھی ہوئی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی چور اسکا مال اٹھا کر بھاگ جاتا ہے تو اسکا فرض ہے کہ نماز توڑ دے اور چور کے پیچھے بھاگے۔

<u>یہاں مال کی خاطر نماز قطع کر دینے کا حکم ہے۔</u>

۲۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے کوئی موذی جانور مثلاً سانپ بچھو وغیرہ سامنے آ جائے تو حکم ہے کہ نماز توڑ کر پہلے اسے مارے۔

<u>یہاں اپنی جان بچانے کو ترجیح دی گئی ہے۔</u>

۳۔ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے اور قریب میں کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہے اور مدد کے لئے چلا رہا ہے تو حکم ہے کہ نماز توڑ دے اور اسکی جان بچائے۔

<u>یہاں دوسرے کی جان بچانے کو فوقیت دی گئی ہے۔</u>

۴۔اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے اور اسکے بوڑھے والدین میں سے کوئی اسے آواز دے تو حکم ہے کہ نماز توڑدے اور جا کر انکی بات سنے۔

یہاں اطاعتِ والدین کواوّلیت دی گئی ہے۔

۵۔نماز نہ پڑھنے سے انسان کافر نہیں ہوتا بلکہ صرف گناہگار ہوتا ہے اور بعدِ توبہ بخشا جاتا ہے جیسا کہ علامہ حلّی احسن العقائد (اردو) صفحہ۰اپر فرماتے ہیں۔

''عبادات واعمال کی قبولیت اور نجاتِ اخروی کا دارومدار اصولِ دین۔اسلام کی معرفت اور انکے اعتقاد پر ہے۔اصولِ دین کا اعتقادو عدم اعتقاد ہی ثوابِ دائمی و عذابِ دائمی کا سبب ہے۔اصولِ دین کا اعتقاد رکھنے والے وہ اشخاص جو اعمالِ قبیح کے مرتکب ہوئے ہیں (برزخ میں) اپنے اعمالِ قبیح کی سزا پانے کے بعد اپنے عقیدۂ حقہ کی وجہ سے مستحقِ ثواب قرار پائیں گے۔خلود فی النار ان کفار کے لئے ہے جو اصولِ دین کا اعتقاد نہیں رکھتے''۔

یہاں نماز کے شرطِ ایمان اور شرطِ نجات ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

۶۔تواترات سے یہ بات ثابت ہے کہ وقتِ احتضار۔قبر میں اور محشر میں صرف وصرف عقائد کا سوال کیا جائے گا۔ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں نماز کا سوال کیا جاتا ہو۔

یہ وہ ظاہری نماز ہے جو دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے اور جو نمازِ ملفوظی اور نمازِ مکتوبی پر مشتمل ہے۔اگر نماز کو صرف یہیں تک محدود کرلیا جائے تو انسان کی ہلاکت اور بربادی میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اب دوسری نماز کے احکام ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔حدیثِ پیغمبرؐ ہے کہ سب سے پہلے جو سوال کیا جائے گا وہ نماز کا سوال ہوگا۔اس قول کو شیخ سعدی نے اسطرح منظوم کیا ہے۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بُود
اوّلیں پرسشِ نماز بُود

یہ کونسی نماز ہے؟

۲۔نجات کادارومدار نماز پر ہےاور نماز نہ پڑھنے سے انسان کافر ہوجاتا ہے۔ دلیل کے طور پر ہم سورۂ مدثر کی آیات ۴۰ تا ۴۳ پیش کرتے ہیں جن میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔"وہ (اہلِ بہشت) جنتوں میں مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمھیں کیاچیز (دوزخ کی) آگ میں لے گئی۔وہ کہیں گے کہ ہم نمازگزار نہ تھے"۔آج تک کسی محدث۔عالم یا مجتہد نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ نماز نہ پڑھنے سے انسان کافر ہوجاتا ہے جیسا کہ گذشتہ سطور میں علامہ حلی کی عبارت گذری اور یہ طے ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی جائے گا۔غیر کافر نہیں جائے گا۔اسطرح مذکورہ آیات سے بے نمازیوں کا کافر ہونا ثابت ہورہا ہے۔

یہ کونسی نماز ہے؟

۳۔اگر انسان ڈوب رہا ہواور گلے گلے پانی آ گیا ہوتب بھی نماز ترک نہیں کی جاسکتی۔

یہ کونسی نماز ہے؟

۴۔دم نکلتے نکلتے حلق تک پہنچ گیا ہواور صرف آنکھوں میں جان باقی رہ گئی ہوتب بھی آنکھوں کے اشارے سے نماز پڑھے۔اگر اس سے عام نماز مراد لی جائے تو یہ حکم خلافِ فطرت ثابت ہوتا ہے کیونکہ جانکنی کے عالم میں نماز پڑھنا عملاً ناممکن ہےاور اسلام دینِ فطرت ہے یہ خلافِ فطرت حکم نہیں دیتا۔

پس غور کرنا چاہیے کہ یہ کونسی نماز ہے؟

اوّالذکر نماز صرف وجودِ ملفوظی ومکتوبی ہے۔ایسی نماز کیونکر کسی کے کام آسکتی ہے جوخود اپنے وجود میں ہماری محتاج ہو۔ہم کچھ مخصوص حرکات وسکنات کریں گے تو

یہ وجود میں آئے گی ورنہ معدوم رہے گی۔ آخرالذکر نماز وجودِ ذہنی اور وجودِ حقیقی کا نام ہے۔ یہی نماز اپنے پڑھنے والوں کو بخشوائے گی کیونکہ یہ مخلوق کی محتاج نہیں بلکہ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے اور اسی کو زبانِ قرآن میں "صمد" کہتے ہیں لہٰذا نمازِ حقیقی وجودی وہی ہوسکتا ہے جو اللہ کی صفتِ "صمدیّت" کا مظہر ہو۔

اب ہم نماز کے وجودِ حقیقی کا تعارف کراتے ہیں۔

نمازِ حقیقی وجودی

ہم ثابت کر آئے ہیں کہ ہر شے کے چار وجود ہوتے ہیں جن میں سے ایک وجود حقیقی ہوتا ہے اور باقی تین وجود اس حقیقی وجود کا تعارف کراتے ہیں۔ اسکی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اسکی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسکی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ نمازِ حقیقی کے باقی تین وجود اسکی طرف توجہ دلائیں۔ اسکا تصور کرائیں اور اسکو طلب کریں ورنہ انکو نماز ہرگز نہیں کہا جا سکتا اور نہ وہ نماز کی تعریف میں آتے ہیں لہٰذا ہر اس شخص کا نمازِ حقیقی وجودی کا عارف ہونا لازمی ہے جو نماز کی اہمیت کا معترف ہے اور جو نماز پڑھنا چاہتا ہے۔

۱۔ بقرہ ۴۵ "مدد مانگو صبر سے اور نماز سے۔ بیشک وہ (نماز) بہت کٹھن اور دشوار چیز ہے لیکن خاشعین کے لئے نہیں"۔

ہم اس آیت کی تفسیر خود قرآنِ ناطق امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کی زبانِ مبارک سے سنواتے ہیں۔ یہ آپؑ کے خطبۂ معرفتِ نورانیہ کا ایک ٹکڑا ہے جو آپؑ نے حضراتِ سلمانؓ و ابوذرؓ کے سامنے ارشاد فرمایا تھا۔ یہ عبارت ہم "العلی سلطاناً نصیرا" کے صفحہ ۱۲۶ سے نقل کر رہے ہیں جسے انھوں نے بحارالانوار ج ۷ سے اخذ کیا ہے:۔

"سلمان کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا اخا رسولؐ اللہ۔ <u>آیا جو شخص نماز کو برپا کرتا ہے وہ آپؑ کی ولایت کو برپا کرتا ہے</u>؟ فرمایا۔ ہاں اے سلمان ایسا ہی ہے اور اس بات کی تصدیق خدا کا وہ قول ہے اسکی کتاب میں یعنی استعانت

(مدد) چاہو صبر سے اور صلوٰۃ سے لیکن وہ ایک نہایت بزرگ اور مشکل چیز ہے مگر خاشعین کے لئے نہیں۔ پس مراد اس آیت میں صبر سے رسولؐ خدا اور مراد صلوٰۃ سے میری ولایت کا برپا کرنا ہے پس اسی لئے خدائے علیم وحکیم نے کہا ہے کہ وہ ایک نہایت مشکل کام ہے اور نہیں کہا کہ دونوں مشکل ہیں اس لئے کہ

میری ولایت کا متحمل ہونا سخت کام ہے نہ کہ نبوتِ پیغمبرؐ کا مگر خاشعین کے لئے آسان ہے کہ خاشعین سے مراد ہمارے وہ شیعہ ہیں جو مستبصر ہیں ...... الخ''

امیر المومنینؑ نے اس قدر صراحت کے ساتھ یہ بات سمجھا دی کہ نماز کا وجودِ حقیقی خود انکی ذاتِ اقدس ہے اور انکی ولایت کا برپا کرنا (یعنی انکی ولایت کو دل و جان سے تسلیم کرنا اور اسکی تبلیغ کرنا) ہی اصلِ نماز ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ صرف اس وجودِ حقیقی کی طرف توجہ کرنا۔ اسکا تصور کرنا اور اسکو طلب کرنا ہے۔ نیز آپؑ نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ یہ نماز پڑھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ صرف وہ شیعہ یہ نماز پڑھ سکتے ہیں جو عارف مستبصر ہوں۔ جو لوگ معرفتِ ولایت کے نام سے چڑتے ہیں انکا نماز سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ نماز مقامِ ولایتِ مطلقہ ہے۔ یہاں صرف وہی قائم رہ سکتا ہے جسکا دل ہمہ وقت نمازِ حقیقی کی طرف متوجہ رہتا ہو۔ لوٹا اور چٹائی والوں کا یہاں کوئی کام نہیں۔

۲۔ نہج الاسرار ج ۱ صفحہ ۷۹۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ ''میں ہی مومن کی نماز ہوں۔ میں ہی انکی زکوٰۃ اور انکا حج و جہاد ہوں''۔

۳۔ حقائق الوسائط ج ۲ صفحہ ۶۵ پر اصولِ کافی سے اخذ کی گئی مندرجہ ذیل حدیث درج ہے:۔

''سعد خفاف نے امام محمد باقرؑ سے سوال کیا۔ ''یا بن رسولؐ اللہ کیا قرآن تکلم کرتا ہے؟ (بولتا ہے؟) آپؑ نے فرمایا۔ اے سعد نماز بھی تکلم کرتی ہے (بولتی

ہے)۔اسکی صورت وشکل خلقی ہے۔وہ امر بھی کرتی ہے اور نہی بھی۔سعد کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرا رنگ بدل گیا اور میں نے عرض کی کہ مولاً یہ بات لوگوں کے مجمعے میں ہم بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتے کیونکہ یہ مطلب عوام کی عقول سے بالا ہے۔آپؑ نے فرمایا۔جو شخص نماز کی معرفت نہیں رکھتا تو اس نے ہمارے حق کا انکار کیا۔پھر آپؑ نے فرمایا۔اے سعد خداوندِ عالم کا ارشاد ہے۔

''انّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر ولذکر اللّٰہ اکبر''

(ترجمہ:۔بیشک نماز منع کرتی ہے فحش اور منکرات سے اور اللہ کا ذکر اکبر ہے)

اے سعد۔نہی کرنا (منع کرنا) کلام ہے اور فحشاء ومنکر سے مراد (کچھ) لوگ ہیں۔اور ہم ذکر اللہ ہیں اور ہم اکبر ہیں۔اس آیت میں نہی کرنا (منع کرنا) فعل ہے جسکے لئے نہی کرنے والے کی ضرورت ہے جو متکلم ہے۔ظاہری نماز تکلم نہیں کرتی۔اسی لئے نماز سے مراد محمدؐ وآلِ محمدؐ ہیں۔یہی نماز کے باطنی معنی ہیں''۔

پس ثابت ہوگیا کہ نماز کا وجودِ حقیقی محمدؐ وآلِ محمدؐ۔خصوصاً امیر المومنین علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہیں۔انہی کی حرکات وسکنات کا نام نمازِ ملفوظی و مکتوبی ہے جنکی ہم نقل کرتے ہیں اور انہی کا تصور نماز کا وجودِ ذہنی ہے۔

اسی لئے

اسی لئے مسجدِ نبوی میں وہ تاریخ رقم کی گئی جس نے قیامت تک یہ طے کردیا کہ نمازِ ملفوظی ومکتوبی کیا ہوتی ہے اور نمازِ حقیقی وجودی کیا چیز ہے۔رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ اسطرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔اسکا واضح مطلب یہ ہے کہ نماز درحقیقت رسولؐ اللہ ہی پڑھتے تھے اور ہم لوگ فقط انکی نقل کرتے ہیں۔کون ہے جو نمازِ نبوی کا تصور بھی کر سکے۔ہم جب نماز پڑھتے ہیں تو

خدا جانے کتنے خیالات ہمارے اور ہماری نماز کے درمیان حائل ہوتے رہتے ہیں۔ شاید گمان کرنے والے یہ گمان کرتے کہ کم از کم حرکات و سکنات کی حد تک تو ہماری اور رسولؐ کی نماز برابر ہے لیکن نماز کے ایک وجودِ حقیقی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کی اس غلط فہمی کا قلع قمع کر دیا۔ رسول اللہؐ نے قیام کیا لیکن حسینؑ خاموش رہے۔ آپؐ رکوع میں گئے تب بھی حسینؑ نے کچھ نہ کیا لیکن جیسے ہی آنحضرتؐ حالتِ سجدہ میں آئے تو ساتھ ساتھ مشیت خدا بھی حرکت میں آ گئی کیونکہ آج رہتی دنیا تک لوگوں کو نماز سمجھائی جانی تھی۔ حسینؑ پشت نبیؐ پر سوار ہو گئے۔ جو حسینؑ لوحِ محفوظ کا مطالعہ کرتا ہو بلکہ خود لوحِ محفوظ ہو کیا اسکو معلوم نہ تھا کہ نماز کے دوران کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے؟۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حسینؑ کا مقصد تو یہ تھا کہ آج کا دن ایسا یادگار بن جائے کہ کبھی بھلایا ہی نہ جا سکے۔ اب تک جو نماز رسولؐ پڑھ رہے تھے وہ نمازِ ملفوظی و مکتوبی و ذہنی تھی لیکن آنجنابؐ کی نمازِ حقیقی اس وقت شروع ہوئی جب نماز اپنی ہیئت خلقی میں شکل و صورت اور جسم و جسمانیت کا ساتھ آ موجود ہوئی۔ آج تک مورخین و محدثین اسی شش و پنج میں مبتلا ہیں کہ شاید جتنی دیر حسینؑ پشت رسولؐ پر رہے اتنی دیر تک عبادتِ خدا معطّل رہی لیکن ان نادانوں کو کیا معلوم کہ حقیقی عبادتِ خدا تو شروع ہی اس وقت ہوئی جب نمازِ مجسم نے ظہور فرمایا۔ اس وقت نمازِ ملفوظی و مکتوبی کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا سوائے اسکے کہ دست بستہ ہو کر ایک ہی حالت میں کھڑی رہے۔ رسول اللہ اس وقت سجدے میں تھے اور حسینؑ پشت نبی پر بلند تھے۔ سجدہ اللہ کے عبدِ خاص کے لئے بلند ترین مقام ہوتا ہے لیکن عملِ رسولؐ نے بتا دیا کہ اس بلند ترین مقام سے بھی بالاتر ایک اور بلندی ہے جسکا نام حسینؑ ہے۔ کیا اسی حسینؑ کے ذکر سے روگردانی کر کے نمازیں پڑھی جاتی ہیں؟ اور کیا ایسی ہی نمازوں پر ''مولانا حضرات'' کو غرور ہے؟ اور کیا اسی بات پر مومنین کو مطعون کیا جاتا ہے؟۔ کہاں ہیں وہ بے خبر جو حسینؑ کا موازنہ نماز سے کرتے ہیں؟ کیا انھیں

اتنا بھی معلوم نہیں کہ موازنہ اور تقابل کے لئے دو فریق ہونا ضروری ہیں؟ مگر یہاں تو دوسرا فریق ہے ہی نہیں۔نماز ہے تو حسینیؑ ہے اور حسینیؑ ہے تو حسینیؑ ہے۔اب اگر خود کو دیوانہ کہلوانے کا شوق ہے تو بیشک حسینیؑ کا مقابلہ حسینیؑ سے کرتے پھرو یا پھر یہ کہو کہ تمھاری ریاءکاری کی نماز (معاذ اللہ) رسول کی نماز سے افضل ہے۔

یہیں سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے امام زمانہؑ سے کس طرح رجوع کر سکتے ہیں؟ ایسے حضرات بھی جان لیں کہ نماز درحقیقت ''رجوع الیٰ صاحب الزمانؑ'' ہی کا نام ہے۔آپ کے ذہن میں آپکے امام زمانہؑ ہی کا تصور ہونا چاہئے اور نیت یہ ہونا چاہئے کہ

''یا صاحب الزمانؑ۔میں اسکی عبادت کرر ہا ہوں جسے آپؑ جانتے ہیں مگر میں نہیں جانتا۔میں تو صرف آپؑ ہی کو جانتا ہوں۔میری عبادت ناقص ہے اور یہ میں آپؑ کی بارگاہ میں پیش کرر ہا ہوں۔آپؑ کریم ہیں۔میری ناقص عبادت کو کامل کرنا آپؑ کے لئے بڑی بات نہیں۔اسے شرفِ کمال اور شرفِ قبولیت عطا کر کے اللہ تک پہنچانے کا کام میں آپؑ ہی کے سپرد کرتا ہوں کیونکہ آپؑ ہی وہ وسیلہ ہیں جسے ڈھونڈنے کا حکم اللہ نے دیا ہے''۔

اگر آپکی یہ نیت پختہ ہوگئی تو آپ خود مشاہدہ فرمائیں گے کہ آپ کے وسوسے کیسے دور ہوتے ہیں۔آپ کے سوالات کے جوابات آپ کو کس طرح ملتے ہیں اور آپکی مشکلات کس طرح آسان ہوتی ہیں۔دل اگر آئینہ بن جائے اور اسکا رخ ہادیٔ برحق کی طرف ہوجائے تو نورِ ہدایت کی کرنوں سے دل کیونکر منور نہ ہوگا؟۔

دو قسم کے نمازی

جس طرح نمازیں دو ہیں اسی طرح نمازی بھی دو طرح کے ہیں۔ایک قسم کے

نمازی وہ ہیں جو جنتی ہیں اور انکے جنتی ہونے کا باعث انکی نماز ہے۔ دوسری قسم کے نمازی جہنمی ہیں اور انکے جہنمی ہونے کا باعث بھی انکی نماز ہی ہے۔ قرآنِ مجید نے ان دونوں کا تعارف واضح طور پر کرایا ہے۔

پہلی قسم کے نمازیوں کے بارے سورۂ المعارج کی آیات ۳۲ تا ۳۵ یوں اعلان کرتی ہیں:۔

''اور جو اپنی امانات اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی شہادات پر قائم رہنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی جنتوں میں صاحبانِ عزت ہونگے''۔

ان آیات میں پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب نمازیوں کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں:۔

۱۔ وہ اپنی امانات اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہوتے ہیں۔

تفاسیرِ معصومینؑ کے مطابق ''امانت'' اور ''عہد'' سے مراد ولایتِ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہے۔ یہ تفصیل کا محل نہیں۔ ہم نے ان دونوں اشاراتِ قرآنی پر اپنی کتاب کشف العقائد میں مفصل بحث کی ہے لہٰذا تفصیلات اور حوالوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فرمایا جائے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے محبوب نمازی وہ ہیں جو ولایتِ علیؑ پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انھوں نے ولایتِ علیؑ کے بارے میں جو عہد کیا ہے اس سے کبھی روگردانی نہیں کرتے۔

۲۔ وہ اپنی شہادات پر قائم رہنے والے ہیں اور اس ثابت قدمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکی نمازیں محفوظ ہو جاتی ہیں جسکے بعد کوئی بھی شے انکی نمازوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ عربی میں شہادات جمع کا صیغہ ہے جسکا اطلاق تین یا تین سے زیادہ پر ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پوری نماز میں ہم شہادت صرف ایک ہی مقام پر دیتے ہیں اور وہ ہے تشہد۔ لہٰذا تشہد میں کم از کم تین گواہیاں دینا شرطِ نماز ٹھہری۔ جو لوگ صرف دو شہادتوں یعنی شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت تک رک جاتے

ہیں وہ اللہ کے محبوب نمازیوں کی تعریف سے خارج ہیں۔ اللہ کا محبوب نمازی وہی ہے جو ان دو شہادتوں کے ساتھ تیسری شہادت یعنی شہادتِ ولایتِ علیؑ بھی دیتا ہو اور جس طرح شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت واجباتِ نماز سے ہیں بالکل اسی طرح شہادتِ ولایتِ علیؑ بھی واجبِ عینی ہے جس کے بغیر نماز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ولایت ہی نماز کا وجودِ حقیقی ہے۔

۳۔ جن لوگوں کی نمازیں ایسی ہوتی ہیں وہ محض جنتی ہی نہیں ہوتے۔ جنت میں تو بہت سے لوگ یہاں تک کہ اصحاب کہف کا کتا۔ بلعم باعور کا گدھا اور حضرت یوسفؑ کا بھڑیا بھی چلا جائے گا لیکن یہ نمازی ایسے ہیں جو جنت میں صاحبانِ عزت و اکرام ہونگے یعنی باقی تمام جنتیوں پر انکا احترام و اکرام کرنا لازم ہوگا۔

دوسری قسم کے نمازیوں کے بارے میں سورۂ ماعون آیات ۴ تا ۶ میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ ''پس ویل ہے (جہنم ہے۔ لعنت ہے۔ ہلاکت ہے) نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ جو نماز کا دکھلاوا کرتے ہیں''۔

اگر کوئی خود کو نمازی کہے تو اسکے اس دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی لیکن جسے خود اللہ نمازی کہکر خطاب کرے اسکے نمازی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان آیات میں بھی جن نمازیوں کو جہنم۔ لعنت اور ہلاکت کی وعید دی گئی ہے وہ سند یافتہ نمازی ہیں لیکن انکا قصور یہ ہے کہ اگرچہ وہ بظاہر وہ تمام حرکات و سکنات کرتے ہیں جنکو عرفِ عام میں نماز کہا جاتا ہے لیکن وہ حقیقت نماز اور روحِ نماز سے غافل ہیں۔ انکی نماز ایک جسدِ بے روح کی مانند ہے اور اس طرح وہ حقیقتاً مردہ پرست ہیں اور چونکہ انکے ذہن میں نمازِ حقیقی وجودی کا تصور نہیں ہوتا بلکہ اپنے خودساختہ خدا کا تصور ہوتا ہے اس لئے وہ پکے بت پرست ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نماز کو اللہ نے ریاءکاری قرار دیا ہے۔

ہم نے اللہ کی پسندیدہ نماز اور ریاءکاری کی نماز کو پوری طرح واضح کر دیا جسکے بعد کوئی حجت باقی نہیں رہ جاتی۔ اب ہم ظاہری نماز پر ایک نظر

ڈالتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ نماز اور ہر وہ چیز جو اس نماز سے متعلق ہے نمازِ حقیقی و جودی ہی کا تعارف کراتی ہے۔اسی کی نشاندہی کرتی ہے۔اسی کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اسی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

اذان و اقامت اور حقیقتِ نماز

جب مسجد سے لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جاتا ہے اور اذان کہی جاتی ہے تو شہادتِ توحید۔شہادتِ رسالت اور شہادتِ ولایت دے کر پہلے اپنے عقیدے کا اعلان کیا جاتا ہے۔اس طرح نماز کی ابتدا ہی عقیدے سے ہوتی ہے اور اقامت چونکہ منشورِ نماز کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس میں یہ اعلان مضمر ہے کہ ہم اپنا عقیدہ بیان کر چکے اور اب جو حرکات وسکنات ہم کریں گے وہ اسی عقیدے کی عملی شکل ہوگی۔ہماری بات یہیں سے ثابت ہوجاتی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ بات اتنی واضح ہوجائے کہ کسی کو مجالِ انکار نہ رہے۔

اذان و اقامت میں ہم نماز کے لئے تین الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ صلوٰۃ۔فلاح اور خیر العمل۔صلوٰۃ اور فلاح پر ہم بات کر چکے۔اس مقام پر ہم خیر العمل پر گفتگو کریں گے لیکن یہ ذہن میں رکھئے کہ خیر العمل نماز ہی کا نام ہے جسکی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔

غدیرِ خم سے پہلے کوئی بھی تاریخ داں یا کوئی بھی محدث نماز میں کلمۂ ''حی علیٰ خیر العمل '' نہیں دکھا سکتا۔یہ کلمہ کبھی بھی جزوِ اذان نہیں رہا۔یومِ غدیر پہلی بار یہ کلمہ سنا گیا اور وہ بھی جزوِ اذان کے طور پر نہیں بلکہ جب اعلانِ ولایتِ علیؑ کے لئے لوگوں کو بلایا گیا تو چونکہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا اس لئے اذان نہیں دی گئی بلکہ حضرتِ بلالؓ نے بحکمِ رسولؐ صرف ایک کلمے کے ذریعے لوگوں کو بلایا اور وہ کلمہ تھا ''حی علیٰ خیر العمل ''۔اسکا صاف مطلب یہ ہے کہ خیر العمل سے رسولؐ کی مراد ولایتِ علیؑ تھی۔بعد میں رسولؐ اللہ نے حکم دیا کہ یہ کلمہ اذان کا جزو بنا دیا جائے۔اللہ کا رسولؐ فعلِ عبث نہیں کیا کرتا۔اس کلمے کو نماز میں شامل کرانے کا

مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ نماز کی حقیقت ولایتِ علیؑ ہی ہے اور جب نماز کے لئے بلایا جاتا ہے تو حقیقتاً ولایتِ علیؑ ہی کی طرف بلایا جاتا ہے ۔ پس اگر نماز ولایتِ علیؑ کو قائم کرنے کے لئے پڑھی جائے تو یقیناً نماز ہے ورنہ سراسر ریاء کاری ہے ۔ خود جناب امیر المومنینؑ نے حقیقتِ اذان اس طرح بیان فرمائی ہے :۔

''انا حیّ علی الصلوٰۃ ۔ انا حیّ علی الفلاح ۔ انا حیّ علیٰ خیر العمل ۔ انا صلوٰۃ المومنین''

(میں ہی حی علی الصلوٰۃ ہوں ۔ میں ہی حی علی الفلاح ہوں ۔ میں ہی حی علیٰ خیر العمل ہوں ۔ میں ہی مومنین کی کل کی کل نماز ہوں ۔) (اکمال الدین بولایتِ امیر المومنین صفحہ ۵۳۲ بحوالہ القطرہ اور پرواز در ملکوت)

یہی صورت اقامت کی بھی ہے ۔ قرآن میں جہاں جہاں نماز کا حکم دیا گیا ہے وہاں لفظ ''اقیموا'' استعمال کیا گیا ہے یعنی قائم کرو نماز کو ۔ اس طرح ہماری شرعی تکلیف نماز قائم کرنا ٹھہری ۔ اقامت میں جب ہم شہادتِ ولایتِ علیؑ ادا کر دیتے ہیں تو اس وقت ہم کہتے ہیں ''قد قامت الصلوٰۃ'' (یقیناً نماز قائم ہو چکی) ۔ حالانکہ ابھی آپ نے نہ تو نیت باندھی نہ تکبیرۃ الاحرام کہی نہ رکوع کیا اور نہ سجدہ ۔ اس کے باوجود آپ اعلان کر رہے ہیں کہ یقیناً ہم نے نماز قائم کر دی یعنی جو فریضہ اللہ نے ہمارے ذمے کیا تھا وہ ہم نے ادا کر دیا اور اب جو حرکات وسکنات ہم کریں گے وہ نمازِ حقیقی وجودی کی حرکات وسکنات کی نقل ہوگی اور بس ۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ نماز ہو یا اقامت ۔ حقیقتاً دونوں ہی اعلانِ ولایتِ علیؑ ہیں اور دونوں ہی نمازِ وجودی کی طرف متوجہ کرتی ہیں ۔

نیتِ نماز اور حقیقتِ نماز

اذان واقامت کے بعد جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا نیت

سے کرتے ہیں اور نیت ہمیشہ قربت خدا کی کی جاتی ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمادیا ہے کہ ''انما الاعمال بالنیات''۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ اگر نیت صحیح ہے تو عمل بھی صحیح ہے اور اگر نیت غلط ہے یا مبہم ہے تو عمل بھی برباد ہے۔ اس لئے یہ بات نا قابلِ تردید ہے کہ جس کو قربِ خداوندی کا مفہوم معلوم ہے اسکی نماز بامعنی اور مقبول ہوگی اور جسے قربِ خداوندی کا مفہوم ہی معلوم نہیں اسکی تمام حرکات وسکنات مجنونانہ کہلائیں گی اور اسکی نماز وہی نماز ہوگی جو منہ پر ماردی جاتی ہے۔ آیئے ہم اس لفظ کے حقیقی مفہوم کی تلاش کرتے ہیں۔

اگر ''قربۃ الی اللہ'' سے مراد اللہ کی قربت لی جائے تو یہ صریحاً شرک ہے کیونکہ اس طرح اللہ کے لئے مادّی یا ذہنی مقام کا تعین لازمی ہوگا حالانکہ لفظی ہو یا معنوی۔ حقیقی ہو یا مجازی۔ زمانی ہو یا مکانی۔ جسمانی ہو یا روحانی۔ کسی بھی اعتبار سے اللہ کی قربت محالِ ابدی ہے۔ بنی اسرائیل ۵۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ (خود) اپنے پروردگار کی طرف وسیلہ ڈھونڈ تے ہیں کہ ان میں سے اقرب (قریب ترین) کون ہے''۔ اقرب وہ ہوگا جسکے اور اللہ کے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو۔ یہ وسیلے کی بحث ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب کشف العقائد میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ تفصیلات کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہاں ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس ''اقرب'' کو تلاش کریں جسکا قرب اللہ کا قرب معنون ہوگا۔

جنب اللہ

جنب کے معنی پہلو کے ہیں اور پہلو انتہائی قرب کا استعارہ ہے چنانچہ جب کسی کے ساتھ کسی کی قربت ظاہر کرنا ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اسکے پہلو میں بیٹھنے والا ہے۔ زمر ۵٦ تا ۵۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''کہ کوئی نفس یہ کہدے کہ ہائے افسوس اس کمی پر جو میں نے جنب اللہ کے بارے میں کی اور میں یقیناً ہنسی اڑانے والوں میں سے تھا یا (یہ نفس) یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچادیتا

تو ضرور میں متقین میں سے ہوجا تا''۔

احتجاج طبرسی میں جناب امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ ''اللہ نے کھول کھول کر بیان کرنے اور اثباتِ حجت کے لئے اپنے اس قول سے جو اس نے اپنے اصفیاء اور اولیاء کے بارے میں فرمایا زیادہ توضیح کی ہے۔ اس سے غرض اپنے خلیفہ کی تعریف کرکے اسکی قربِ منزلت کا ظاہر کرنا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ تم یہ کہا کرتے ہو کہ فلاں شخص فلاں شخص کے پہلو میں بیٹھنے والا ہے اور اس سے غرض اسکے ساتھ اسکے قرب کو ظاہر کرنا ہوتی ہے''۔

اسی طرح کافی میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں منقول ہے کہ ''جنب اللہ'' جناب امیر المومنینؑ ہیں اور اسی طرح انکے بعد انکے اوصیاء حتیٰ کہ یہ امر انکے آخر کو پہنچے (یعنی حضرت قائم آلِ محمدؑ کو) الاکمال اور تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ جنب اللہ ہم ائمہؑ ہیں اور المناقب میں انہی حضرتؑ سے اور انکے والدِ بزرگوار سے اور انکے فرزند امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر میں وارد ہے کہ جنب اللہ جناب علیؑ ہیں اور وہی قیامت کے دن مخلوق پر اللہ کی حجت ہونگے اور امام رضاؑ سے مروی ہے کہ یہ ولایتِ علیؑ کے بارے میں ہے اور خود جناب امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ جنب اللہ میں ہوں۔

افسوس ہے اس شخص پر جو اب بھی کسی قسم کی تشکیک روا رکھے کیونکہ ہم نے پانچ ائمہؑ معصومینؑ کی بیان کردہ تفاسیر پیش کردی ہیں اور اب یہ مکمل طور پر ثابت ہو چکا کہ جنب اللہ سے مراد جناب امیر المومنینؑ اور باقی ائمہؑ ہیں اور ہمارے لئے <u>جنب اللہ سے مراد ہمارے امام زمانہؑ ہیں</u>۔ ہم مزید دو ثبوت پیش کرتے ہیں تا کہ اس بحث کو مکمل کرلیں:۔

ا۔ (کافی۔ کتابِ حجت) امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''واللہ آسمان میں ملائکہ کی ستر صفیں ہیں۔ اگر تمام اہلِ زمین جمع ہو کر شمار کرنا چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے۔ یہ سب

تقرب حاصل کرتے ہیں ہماری ولایت سے"۔

۲۔ یہ دشمن کی گواہی ہے جو ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہے۔ مناقب ابنِ شہر آشوب (اردو) ج ا صفحہ ۳۵۸ پر ابلیس ملعون کا ایک بیان درج ہے جو ہم آپ کے لئے نقل کرتے ہیں:۔

"علی ابنِ ابی طالبؑ کے ساتھ محبت رکھ کر کامیاب ہو جا اور حضرتؑ کے دشمنوں سے بغض رکھ۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی سات آسمانوں میں عبادت کی ہے اور سات زمینوں میں اسکی نافرمانی کی ہے۔ میں نے جس مقرب فرشتے اور نبی مرسل کو دیکھا ہے وہی اللہ کا تقرب علیؑ کی محبت کے ذریعے حاصل کرتا ہے"۔

اس تمام گفتگو سے ثابت ہو گیا کہ "قربۃً الی اللہ" سے مراد معرفت ولایتِ علیؑ ہے اور اس طرح نماز کی نیت خود حقیقتِ نماز کی نشاندہی کر رہی ہے اور اسکی طرف دعوت دے رہی ہے۔

قیام کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد قیامِ قائمِ آلِ محمدؑ ہے اور اسکا مقصد یہ ہے کہ ہم تیاریِ جہاد کا اعلان کریں اور اپنے امامؑ کو اپنی آمادگی کا یقین دلائیں۔ چنانچہ حکم ہے کہ قیام کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان بالکل سیدھا کھڑا ہو (جھک کر کھڑا نہ ہو جیسا کہ بعض لوگ بزعمِ خود بہ غرضِ تعظیم جھک کر کھڑے ہوتے ہیں) اور گردن جھکا کر رکھے۔ یہ ایک فوجی کا کھڑا ہونا ہے۔ اگر آپ فوج کے کسی آدمی سے معلوم کریں تو وہ آپکو بتائے گا کہ وہاں کھڑے ہونے کا اصول یہ ہے:۔

CHIN IN CHEST OUT

یعنی سینہ باہر اور ٹھوڑی اندر۔ پس قیام بھی ہمیں حقیقتِ نماز کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ قیام کے دوران ہم سورۂ حمد کی تلاوت کرتے ہیں اور اس سورہ کا ایک نام سورۂ علیؑ بھی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو نماز کے تمام واجب ارکان میں ایک یہی رکن ہے جہاں ہم دعا مانگتے ہیں اور دعا یہ ہوتی ہے کہ پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم

پر قائم رکھا اور بتواتر ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد ولایتِ علیؑ ہے۔

رکوع اور حقیقتِ نماز

رکوع نماز کا ایک انتہائی اہم رکن ہے کیونکہ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ "جس کا رکوع صحیح نہیں اسکی نماز بھی صحیح نہیں"۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف رکوع کی ظاہری حالت درست کی جائے بلکہ اسکی حقیقت اور تاویل کو بھی جانا جائے۔ یہاں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ رکوع کی حقیقت بھی ولایتِ امیر المومنینؑ ہے اور اسکا مطلب معیتِ معصومینؑ ہے۔

۱۔ بقرہ ۱۲۵۔ "اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو"۔ اس آیت پر اگر غور کیا جائے تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ وہ کون پاک ہستیاں ہیں جن کے لئے خانۂ کعبہ کو بھی پاک کرنے کی ضرورت ہے؟۔ اگر تاریخ کعبہ پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اس پر ہمیشہ کفار و مشرکین کا قبضہ رہا ہے جنکا طہارت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ صدیوں تک خانۂ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے رہے اور یہ حالت فتح مکّہ تک برقرار رہی۔ مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی اکثر ادوار میں خانۂ کعبہ پر نجس لوگوں کا ہی تسلط رہا۔ پھر یہ راکعین کون ہیں جنکے لئے پروردگارِ عالم اپنے گھر کو پاک رکھنا چاہتا ہے؟۔

۲۔ مرسلات ۴۷۔۴۸۔ "اس دن کے جھٹلانے والوں (یعنی کافروں) کے لئے ویل ہے (یعنی جہنم ہے۔ لعنت ہے۔ ہلاکت ہے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے"۔ اس آیت پر معمولی تدبر ہی سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ کافرین و مشرکین سے (جو ابھی ایمان لائے ہی نہیں) قبلِ ایمان رکوع کرنے کی توقع بے معنی ہے اور حکیمِ مطلق ایسا عبث حکم ہرگز

نہیں دے سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ رکوع کوئی اور ہی چیز ہے جسکی ظاہری شکل وہ ہے جو ہم دورانِ نماز بناتے ہیں۔

۳۔ آل عمران ۴۳۔ ''اے مریم تو اپنے رب کی خضوع وخشوع سے عبادت کرتی رہ اور سجدہ کئے جا اور راکعین کے ساتھ رکوع کئے جا''۔ اس آیت میں کئی امور محلِ غور ہیں:۔

ا۔ جناب مریمؑ کی مناسبت سے یہاں صیغۂ مونث یعنی ''الرا کعات'' آنا چاہئے تھا لیکن یہاں صیغۂ جمع مذکر یعنی ''الراکعین'' استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی کچھ مرد ہیں جنکے ساتھ رکوع کرنے کا جناب مریمؑ کو حکم دیا جا رہا ہے۔

ب۔ یہاں سجدہ پہلے ہے اور رکوع بعد میں جو خلافِ عادت وفطرت ہے۔

ج۔ عیسائیوں کی نماز میں رکوع ہوتا ہی نہیں۔

د۔ جناب مریمؑ بچپن سے جوانی تک بیت المقدس کے ایک حجرے میں تنِ تنہا رہیں اور انکے ساتھ کبھی کوئی نہیں رہا۔ پھر وہ کون راکعین ہیں جنکے ساتھ رکوع کرنے کا حضرت مریمؑ کو حکم دیا جا رہا ہے؟۔

۴۔ بقرہ ۴۳۔ عام مسلمانوں کو حکم ہے ''اور تم نماز کو قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور راکعین کے ساتھ رکوع کرو''۔ اس آیت میں جب نماز کا حکم دے دیا گیا تو رکوع کا حکم اس میں شامل ہے کیونکہ رکوع جزوِ نماز ہے۔ پھر الگ سے رکوع کرنے کا حکم اور وہ بھی راکعین کے ساتھ کیا معنی رکھتا ہے؟

۵۔ پس ان آیات سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ یہ رکوع کوئی اور ہی چیز ہے اور راکعین ایک خاص جماعت ہے۔ یہ راکعین وہ راکعین ہیں جن کا ذکر سورۂ مائدہ کی اس آیت میں آیا ہے ''والّذین یقیمون الصلوۃ و یوء تون الزکواۃ و ھم راکعون ''۔ یہاں ''یقیمون'' اور ''یوءتون'' مضارع کے صیغے ہیں۔ قاعدے کے مطابق بجائے ''راکعون'' کے ''یرکعون'' آنا چاہئے تھا۔ راکعون اسمِ فاعل ہے۔ پس یہ راکعین ائمۂ طاہرینؑ ہیں جنکے فردِ اوّل علیؑ

ابن ابی طالبؑ ہیں جنھوں نے حالتِ رکوع میں سائل کو انگشتری دی اور بالاتفاق یہ آیت امیرالمومنینؑ کی شان میں نازل ہوئی۔ یہ ''راکعین'' ان معنی میں ہیں کہ رکوع حالتِ وسطیٰ کا نام ہے درمیان قیام و سجود کے۔ گویا کہ یہ راکعین واسطہ ہیں درمیانِ خالق و مخلوق۔ پس ''وارکعو مع الراکعین'' کے معنی ہونگے کہ انکے ساتھ ساتھ رہو جو خدا اور اسکی مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ رکوع بھی حقیقتِ نماز کی نشاندہی کرتا ہے اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

سجدہ اور حقیقتِ نماز

سجدے کے بارے میں کسی وضاحت کی نہ ہمیں ضرورت ہے اور نہ آپ کو کیونکہ یہ مسئلہ تو خود اللہ کے رسولؐ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیا۔ اللہ نے بھی مقام حسینؑ کا تعارف کرانے کے لئے حالتِ سجدہ کو ہی منتخب کیا تا کہ دنیا دیکھ لے کہ حقیقتِ سجدہ کیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ بارگاہِ رب العزت میں بھی سجدہ اسی وقت کوئی قدر و قیمت رکھتا ہے جبکہ سجدہ گذار کے ذہن میں حسینؑ جلوہ گر ہو اور کیوں نہ ہو جبکہ کربلا میں کائنات کے خالص ترین سجدے کو قیامت تک اللہ نے حسینؑ کی ذات کے لئے مخصوص کر دیا کہ ادھر سجدے کا خیال آیا ادھر سارے تصورات رخصت ہوئے اور صرف حسینؑ کا تصور باقی رہ گیا۔

یہاں ہم سجدے کے بارے میں ایک اجمالی تجزیہ پیش کریں گے تا کہ مومنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے۔ ہم تاریخ انسانیت پر ایک نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ پہلے سجدے کی حقیقت کیا تھی اور پھر آخری سجدہ کس کے لئے ہوگا۔ جب ہم آغاز و انجام کو پہچان لیں گے تو درمیانی عرصے میں کئے جانے والے سجدوں کی حقیقت خود ہی واضح ہو جائے گی۔

پہلا سجدہ وہ تھا جو تمام عالمِ ملکوت نے حضرت آدمؑ کو کیا۔ ہم یہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا واقعی وہ سجدہ حضرت آدمؑ کے لئے تھا یا آدمؑ کے پردے میں کوئی اور جلوہ فرما تھا؟۔

ص۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''پس جب میں اسے (آدمؑ کو) درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح کا ایک جزو پھونک دوں (من روحی) تو تم اسکے لئے فوراً سجدہ کرنے والے ہو کر گر پڑنا''۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آدمؑ کا پتلا مکمل ہو چکنے کے باوجود بھی قابلِ سجدہ نہ تھا۔ قابلِ سجدہ تب بنا جب اس میں اللہ نے اپنی روح کا ایک جزو پھونکا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اصل سجدہ اس روح کو تھا اور آدمؑ فقط ایک قبلہ تھے جسکی طرف رخ کر کے سجدہ کیا جا رہا تھا۔ کیا اللہ نے یہ ذکر قرآن میں بار بار صرف اس لئے کیا ہے کہ ہم اسے ایک قصہ سمجھ کر پڑھتے رہیں؟ اور کیا ہمارا یہ فرض نہیں بنتا کہ ہم تلاش کریں کہ وہ روح کون تھا جسکو اوّلین سجدہ کیا گیا اور جسے اللہ نے اپنی روح قرار دیا؟۔ ہم نے قرآن میں تلاش کیا۔ احادیث میں ڈھونڈا۔ روح کی مختلف اقسام کا بیان پڑھا لیکن ہمیں وہ روح کہیں نظر نہیں آئی جسے اللہ نے ''اپنی'' روح کہا یہاں تک کہ ہماری نظر سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۲ تک جا پہنچی جہاں ارشادِ رب العزت ہو رہا ہے ''(اے رسولؐ) اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح کو وحی کیا جو ہمارے امر سے تھی اور تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ لیکن ہم نے اس (روح) کو ایک نور قرار دیا جسکے ذریعے اللہ جسکی چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے''۔ تب ہمیں جستجو ہوئی کہ دیکھیں کہ معصومینؑ نے اس آیت کی کیا تفسیر فرمائی ہے۔ اور جو گوہرِ مراد ہم نے پایا وہ ہم آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ نہج الاسرار ج ا صفحہ ۱۲۶ بحوالہ بحر المعارف اور مشارق الانوار۔

جناب امیر المومنینؑ نے فرمایا ''میں ہوں امر خدا اور اسکی روح''۔

۲۔ آپؑ ہی کا ارشاد ہے ''میں ہی روح ہوں۔ میں ہی ام الارواح ہوں بلکہ روح الارواح ہوں''۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کی تفسیر میں اس روح کی وضاحت کرتے

ہوئے جسے اللہ نے نور قرار دیا ہے معصومؑ فرماتے ہیں ''اس سے مراد امیر المومنینؑ ہیں۔ اللہ جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے''۔

یہاں سے ہمیں پتہ چل گیا کہ سجدے کی ابتدا اس سجدے سے ہوئی جو مولائے کائنات کی بارگاہِ اقدس میں پیش کیا گیا۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ آخری سجدہ کسے کیا جائے گا۔ علامہ بوعلی شاہ صاحب زیدی نے اپنی کتاب مستطاب ''شیعہ مذہب کے اصولِ دین ج ا'' میں تفسیر العیون سے امام رضاؑ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ ہم علامہ صاحب کی پوری عبارت انکی کتاب کے صفحہ ۷۱ سے پیش کرتے ہیں:۔

''سورۂ قلم ۴۲۔ ''جس دن پنڈلی سے حجاب کھولا جائے گا اور لوگ سجدوں کے لئے بلائے جائیں گے تو (نافرمان) لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے''۔ ساق کے معنی ہیں ستون جس پر جسم کا انحصار ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالی کی معرفت کا انحصار محمدؐ و آلِ محمدؑ پر ہے اس لئے وہ ساقِ الٰہی ہیں۔ انہی کو حجاب بشریت میں ہدایت کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ قیامت میں انھیں حجاب بشریت سے باہر نورانی صورتوں میں بطورِ نیابتِ الٰہی مثلِ آدمؑ پیش کرکے سجدہ کرایا جائے گا۔ تفسیر العیون میں امام رضاؑ سے منقول ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حجابِ نور کھل جائے گا تو مومن (جنکے دل عظمتِ محمدؐ وآلِ محمدؑ کے لئے دنیا مین جھکتے رہے ہیں) سجدے میں گر پڑیں گے اور منافقین (جنکے دلوں نے عظمتِ محمدؐ وآلِ محمدؑ کو قبول نہیں کیا) کی ریڑھ کی ہڈی سلاخ یا جانور کے سینگ کی طرح سخت ہو جائے گی اور وہ سجدہ نہ کرسکیں گے''۔ ابتدائے ہدایت میں ابتدائی حجت اللہ (آدمؑ) کو سجدہ کرانا ہی اس بات کی بنیاد و دلیل ہے کہ انتہا میں انتہائی حجت اللہ (محمدؐ وآلِ محمدؑ) کو سجدہ کرایا جائے گا جو بحکمِ خدا اللہ ہی کا سجدہ تصور و معنون ہوگا۔ ان حضرات کو حجابِ آدمؑ میں ابتدا میں سجدہ کرایا گیا اور حجابِ بشریت سے باہر کرکے قیامت میں سجدہ کرایا جائے گا۔ جو لوگ لباس کے پجاری اور روح

ہدایت کے منکر ہیں وہ کعبہ کو جھکتے ہیں اور روحِ کعبہ علیؑ کی عظمت کے منکر ہیں۔
یاد رہے کہ آیتِ بالا میں سجود کا ذکر ہے۔ مراد بہت سے سجدے۔ یعنی نورِ اوّل کے حاملین چودہ معصومینؑ کو یکے بعد دیگرے سجدہ کرایا جائے گا''۔

ہمیں پہلے اور آخری سجدے کے بارے میں معلوم ہوگیا تو اب ہمارے لئے آسان ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ ان دونوں کے درمیانی عرصے میں جس قدر بھی سجدے کئے جائیں گے انکی حقیقت یہی ذواتِ مقدسہ ہیں اور اگر بحالتِ سجدہ ان حضرات کا تصور ذہن میں نہ ہو تو ایسے سجدے خدا پرستی نہیں بلکہ نفس پرستی کہلائیں گے۔

ان دلائل سے قطع نظر میں یہ کہتا ہوں کہ سجدے کی حالت میں جس شخص کو حسینؑ کی یاد نہیں آتی وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ تاریخیں اور مقاتل گواہ ہیں کہ جب میرا امامؑ زین سے زمین پر تشریف لایا تو اسکا جسمِ اطہر زمین پر نہیں تھا بلکہ تیروں پر معلق تھا۔ ایسی حالت میں حسینؑ نے سجدہ کیسے کیا ہوگا؟ کوئی اس سجدے کا تصور کر سکتا ہے؟ اگر انسان اس سجدے کا ذرا سا بھی تصور کر لے تو اسکی روح اور اسکے بدن کے جوڑ بند تھرانے لگیں گے۔ پس کون مومن ایسا ہو سکتا ہے جو سجدہ کرے اور حسینؑ اسکی نظروں سے اوجھل رہے؟۔

ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ نماز ابتدا سے انتہا تک عقیدہ ہی عقیدہ ہے۔
نماز ایک سفر ہے عقیدے سے عقیدے تک۔ پھر یہ کون مولانا صاحبان ہیں جو عقیدے کو نماز کی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہیں؟

جبر و اختیار

یہ ایک خالص علمی سوال ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔
''مسئلۂ آخرت اور نظریۂ جزاو سزا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے ورنہ اسے جزا یا سزا دینے کا کوئی جواز نہ تھا۔اور اسی پر ہمارا ایمان ہے لیکن عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر پاتے ۔پھر انسان کے مختار ہونے کا کیا مطلب ہے؟''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ اہم ترین دینی مسائل میں سے ایک ہے اور سائل کی یہ بات بالکل درست ہے کہ جزا اور سزا دونوں کا تعلق اختیار سے ہے لیکن اس اختیار کے باوجود جب وہ کارخانۂ حیات میں اپنی بے بسی دیکھتا ہے تو اپنے اختیار پر اسکا اعتماد ڈگمگانے لگتا ہے۔ یہ ایک مختصر سوال ہے لیکن اسکی اہمیت کے پیشِ نظر اسے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ ابتدا ہی سے معرضِ بحث میں رہا ہے اور علماء کے درمیان اس مسئلے پر ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔اس طرح دو مکاتب فکر وجود میں آئے۔
ایک مکتب فکر ابوالحسن اشعری کا تھا جسکا نظریہ تھا کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ ہی کرتا ہے۔اس نظریئے کی ترجمانی کرتے ہوئے میر تقی میر فرماتے ہیں۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

آج مسلمانوں کی اکثریت اسی نظریئے پر کاربند ہے اور ایسے لوگوں کو مجبّرہ کہا

جاتا ہے۔دوسرا نظریہ واصل بن عطامعتزلی نے پیش کیا اور وہ یہ کہ انسان مکمل طور پر مختار ہے کہ جو چاہے کرے۔ان لوگوں کو مفوضہ یا قدریہ کہا جاتا ہے۔یہ ہیں وہ دو نظریات جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہیں۔

امر بین الامرین

لیکن مذہب حقہٗ امامیہ کا موقف ان دونوں نظریات کے بین بین ہے وہ نہ تو انسان کو مکمل طور پر مختار قرار دیتا ہے اور نہ مجبورِ محض بلکہ انسان کے لئے ان دونوں حالتوں کے درمیان ایک اور مقام قرار دیتا ہے۔یہ بات سمجھانے کے لئے ہم آپکی خدمت میں ارشاداتِ معصومینؑ پیش کریں گے لیکن ابتدا اس شے سے کرتے ہیں جو اس مسئلے کے معاملے میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

نیت

انسان جو کچھ بھی کرتا ہے تو پہلے اس کام کی نیت کرتا ہے۔اس نیت کی کیا اہمیت ہے یہ بات جب میں نے احادیثِ معصومینؑ میں پڑھی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔میں جب امامؑ کا یہ فرمان پڑھتا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ جتنا نیت پر دیتا ہے اتنا عمل پر نہیں دیتا'' تو مجھے تعجب ہوتا تھا کہ آدمی ہاتھ ہلائے اور نہ پاؤں پھر بھی ثواب زیادہ ملے؟۔اب ایک حدیث معصومؑ ملاحظہ فرمایئے پھر اسکی علت جو معصومینؑ نے بتائی ہے وہ سنئے اسکے بعد ہم اصل نتیجہ اخذ کریں گے جسکے ساتھ ساتھ وہ عظیم الشان مسئلہ بھی طے ہو جائے گا جو زیرِ بحث ہے۔

اصول کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۷۱۔حدیث ۲۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔''نیت مومن اسکے عمل سے بہتر ہے اور نیت کافر اسکے عمل سے بدتر ہے۔ہر عمل کرنے والا اپنی نیت پر عمل کرتا ہے''۔اب اسکی توجیہ خود ائمہ معصومینؑ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔اصول کافی کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۷۱۔حدیث ۵۔امام جعفر صادقؑ نے

فرمایا۔ ’’دوزخی دوزخ میں ہمیشہ اس لئے رہیں گے کہ دنیا میں انکی نیت یہ تھی کہ اگروہ دنیا میں ہمیشہ رہیں تو ہمیشہ خدا کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور اہل جنت ہمیشہ جنت میں اس لئے رہیں گے کہ دنیا میں انکی نیت یہ تھی کہ اگروہ ہمیشہ دنیا میں رہیں گے تو ہمیشہ خدا کی عبادت کریں گے‘‘۔

۲۔مناقبِ ابن شہر آشوب (اردو) ج ۳ صفحہ ۸۰۔زید شام نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ نیت مومن عملِ مومن سے بہتر کیوں ہے؟ فرمایا۔
’’بسا اوقات عمل ریاء کاری پر مبنی ہوتا ہے اور نیت خالص رب العالمین کے لئے ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ جتنا نیت پر دیتا ہے اتنا عمل پر نہیں دیتا‘‘۔

جب نیت کی اہمیت واضح ہوگئی تو اب ہم انسان کے مختار ہونے کی حقیقیت بیان کرتے ہیں اور یہی اس مسئلے میں مذہب امامیہ کا نظریہ ہے جو اصول کافی۔کتاب توحید۔باب ۳۰ سے نقل کیا جارہا ہے۔حدیث کا نمبر ہے ۸
معصومؑ نے فرمایا۔’’انسان نیت فعل میں مختار ہے۔اسباب فعل میں مجبور‘‘۔
یہاں سے معلوم ہوگیا کہ انسان کے مختار ہونے کا مطلب نیت میں مختار ہونا ہے۔نیت کو عمل میں لانے کے لئے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کے بس میں نہیں ہیں۔

ایک مثال

اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کرنے کی نیت کرتا ہے تو نیت کرنے میں وہ آزاد ہے۔جو چاہے نیت کرے۔لیکن جب عملی طور پر وہ اسے قتل کرنے جائے گا تو اسے اسباب کی ضرورت پڑے گی۔اسے استطاعت کہتے ہیں۔اگر اسباب مہیا نہ ہوئے تو وہ اپنی نیت کو عمل میں نہیں لاسکتا۔مثلاً عین وقت پر ہتھیار نہ ملے۔یا راستے میں پولیس کھڑی ہو۔یا یہ خود بیمار پڑ جائے۔یا وہ شخص جسے یہ قتل کرنا چاہتا ہے گھر پر نہ ملے۔یا اگر مل بھی جائے تو نشانہ خطا ہو جائے۔اس استطاعت کو اصول کافی۔کتاب توحید۔باب ۳۱ کی پہلی حدیث میں یوں بیان کیا گیا

ہے:۔
۱۔راہِ عمل کا مزاحمت سے خالی ہونا۔
۲۔نیت کرنے والے کا بدن عیب سے خالی ہونا۔
۳۔اسباب وآلات کی کمی نہ ہونا۔
۴۔مشیتِ الٰہی کا اس سے متعلق ہونا۔یعنی اگر اللہ چاہتا ہو کہ وہ شخص بچ جائے تو یہ ہرگز اسے قتل نہیں کرسکتا۔

مدّتِ عمل

میری گزارش ہے کہ جو کچھ میں اب عرض کرنے جارہاہوں اسے انتہائی غور سے پڑھاجائے تا کہ مسئلے کی صحیح تفہیم ممکن ہو سکے۔

اگر ہم ایک لمحے کے لئے فرض بھی کرلیں کہ انسان کو تمام اسباب مہیا ہوگئے۔اس صورت میں بھی سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان اپنے فعل میں کتنی دیر کے لئے مختار ہے؟۔

آپ جانتے ہیں کہ زمانے تین ہیں۔ماضی۔حال اور مستقبل۔انسان اگر چاہے کہ ماضی میں جاکر کوئی عمل کرلے تو کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟۔اور اگر وہ چاہے کہ مستقبل میں جاکر کوئی عمل کرلے تو کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟۔یہ دونوں صورتیں انسان کے لئے ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہیں۔اسکے پاس عمل کرنے کے لئے صرف اور صرف ایک لمحۂ موجود ہے جس میں وہ اپنے فعل میں آزاد ہے اور وہ بھی بشرطِ استطاعت۔میں نے زمانۂ حال کے لئے لفظ ''لمحۂ موجود'' اس لئے استعمال کیا ہے تا کہ آپ تدبر فرماسکیں کہ جس زمانے کو آپ ''حال'' کے نام سے پکارتے ہیں اسکی مدت کتنی ہے؟۔اگر آپ غور فرمائیں گے تو فوراً محسوس فرمالیں گے کہ صرف ایک بار سانس لینے میں تینوں زمانے شامل ہوتے ہیں۔اس مختصر سی مدت میں ''زمانۂ حال'' کا وقفہ کتنا ہوگا اسکو شاید بیان بھی نہ کیا جاسکے۔

اس بات کو اور بھی زیادہ واضح طور پر اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک دریا کے کنارے کسی مقام پر ایک نشان گاڑ دیا جائے۔ جس طرف سے پانی آ رہا ہے وہ مستقبل ہے اور جس طرف جا رہا ہے وہ ماضی ہے۔ کیا آپ حساب لگا کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نشان پر پانی کتنی دیر ٹھہرا؟۔ حال کی مدت بس اتنی ہی ہے اور یہی وہ مدت ہے جس میں آپ ''بشرطِ استطاعت'' اپنے عمل میں مختار ہیں اور اتنے سے وقفے کے عمل پر کتنی جزا یا سزا مرتب ہو سکتی ہے اسکا بھی اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپکے اختیار کا دائرہ کتنا وسیع ہے کیونکہ آپکے اختیار کا تعلق آپکی نیت سے ہے اور نیت کی وسعت یہ ہے کہ یہ نہ ماضی کی پابند ہے نہ حال کی اور نہ مستقبل کی۔ کیا آپ زیارتِ امام حسینؑ پڑھتے ہوئے یہ الفاظ ادا نہیں کرتے کہ'' کاش میں آپکے ساتھ ہوتا تو میں بھی عظیم کامیابی پر فائز ہو جاتا؟''۔ یہ نیت نہیں تو اور کیا ہے؟۔ یہاں آپ ماضی میں جا کر نیت کر رہے ہیں۔ اور کیا آپ یہ نیت نہیں رکھتے کہ جب ہمارے امامؑ ظہور فرمائیں گے تو آپ انکے لشکر میں شامل ہو کر دشمنانِ خدا سے جنگ کریں گے؟۔ اس طرح آپ مستقبل میں جا کر نیت کر رہے ہیں۔ لہٰذا نیت ایک دائمی شے ہے اور عمل وقتی۔ اس لئے چاہے ثواب دائمی ہو یا عذابِ دائمی۔ دونوں کا انحصار نیت پر ہے۔

پس سمجھ لیجئے کہ آپ نیت میں مختار ہیں اور اسباب فعل میں مجبور۔

حسنِ ظن

لندن سے میرے ایک نادیدہ کرم فرمانے بہت سے سوالات مجھے بھیجے ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب میں نے اس کتاب کے لئے کیا ہے۔ انکا سوال انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

''میں ابھی تک اس حسنِ ظن کا شکار ہوں کہ مجتہد کے سامنے موضوع سے متعلقہ تمام روایات ہوتی ہیں اور وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے فتویٰ دیتا ہے۔ اسکا فتویٰ قولِ معصوم پر مبنی ہوتا ہے اسکی ذاتی رائے نہیں ہوتا''۔ اسکے بعد فرماتے ہیں۔ ''فتویٰ سے مراد وہ اخذ شدہ مفہوم ہے جو روایتِ معصومؑ سے ظاہر ہوتا ہو''۔ پھر مثال دیتے ہوئے خوئی صاحب کی بیان کردہ مقدار کُر کا ذکر کرتے ہیں یعنی 3X3X3 مکعب بالشت اور فرماتے ہیں کہ من لایحضرہ الفقیہ کے صفحہ ۱۴ پر امام جعفر صادقؑ سے جو روایت منقول ہے اس میں بھی یہی مقدار بیان کی گئی ہے جس سے ہمارے حسنِ ظن کو تقویت پہنچتی ہے''۔ اسکے بعد مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ '' کیا آپ اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں گے کہ آپ مجتہدین کے بارے میں سوءِ ظن میں کیوں مبتلا ہیں؟''۔

یہ سوال انتہائی معقول اور مبنی بر خلوص ہے اور اسکا جواب تفصیل طلب ہے کیونکہ اس ایک سوال میں کئی سوالات جمع ہو گئے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اور بھی بہت سے انصاف پسند قارئین کے اذہان میں یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات موجود ہونگے اور اسکا جواب ایک عمومی افادے کا حامل ہوگا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے ابتدائے سوال میں جو لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی ''حسن ظن'' اور اسکے ساتھ لفظ ''شکار'' کا اضافہ فرمایا ہے وہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ کو اپنے قول پر خود بھی اعتماد نہیں ہے

بلکہ چند فتاویٰ اور اقوالِ معصومینؑ میں مطابقت پا کر آپ نے یہ گمان فرمایا ہے کہ شاید مطلقاً ایسا ہی ہوتا ہو گا حالانکہ سوال کرنے سے پیشتر آپکو مجتہدین کی طرف رجوع کرنا چاہئے تھا اور ان سے اپنی بات کی توثیق کرانا چاہئے تھی کیونکہ مدعی وہ ہیں نہ کہ آپ۔ اور اگر وہ توثیق کر دیتے تو آپ حسنِ ظن کے بجائے ''یقین'' استعمال فرماتے۔ اس صورت میں مجھے بھی جواب دینے میں لطف آتا اور مجھے ایک بڑا میدان بھی مل جاتا۔

آپ اس بات سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ کسی بھی فن کی اصطلاحات وضع کرنے کا حق صرف اس فن کے موجدین و ماہرین کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ''ضرب'' بہ معنی ''جمع مسلسل'' ۔ یہ علماءِ حساب کی وضع کردہ اصطلاح ہے اور مجھے یا آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس میں کوئی تبدیلی کر سکیں۔ اسی طرح لفظ ''فتویٰ'' ماہرینِ اجتہاد کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ اسکے عمومی یا لغوی معنی چاہے کچھ بھی ہوں لیکن جب اجتہاد کے حوالے سے یہ لفظ بولا جائے گا تو وہی معنی مراد لینے پڑیں گے جو مجتہدین نے وضع کئے ہیں اور انھوں نے فتویٰ کی جو تعریف معین کی ہے وہ یہ ہے۔

''<u>اصولِ فقہ کے ذریعے استنباط کرنے کے بعد مجتہد کا جو ذاتی نظریہ قائم ہوتا ہے اسے فتویٰ کہتے ہیں</u>''۔

اس اصول پر آپ کی بیان کردہ تعریفِ فتویٰ یعنی ''وہ اخذ شدہ مفہوم جو روایتِ معصومؑ سے ظاہر ہوتا ہو'' کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اگر فتویٰ کے یہی معنی ہوتے جو آپ نے فرض کیا ہے تو میں کتاب کشف الحقائق لکھتا ہی نہیں۔

آپ کے سوال کے پہلے جملے کے دو پہلو ہیں۔ آپ نے دو دعوے کئے ہیں اور دلیل کے طور پر ایک مثال دی ہے۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ''مجتہد کے سامنے موضوع سے متعلقہ تمام روایات ہوتی ہیں''۔ مجھے اس بات سے ہرگز

انکار نہیں ہے کیونکہ مجھے علم ہے کہ اصولِ فقہ میں قرآن بھی شامل ہے اور حدیث بھی اور یہ بات بھی مجھے معلوم ہے کہ مجتہد مسئلے کا حل سب سے پہلے قرآن و حدیث میں ہی تلاش کرتا ہے لیکن اگر ''فتویٰ'' کی تعریف آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے تو اب میں عرض کرتا ہوں کہ اختلاف مجھے کس بات سے ہے۔

اگر مطلوبہ مسئلے کا حل مجتہد کو قرآن یا حدیث میں مل جاتا ہے تو اسکا اخلاقی اور ایمانی فرض ہے کہ وہ ایسا حکم یہ کہہ کر پیش کرے کہ ''فلاں امام نے اس مسئلے میں یہ حکم دیا ہے'' نہ کہ وہ قولِ امام کو اپنا فتویٰ کہہ کر پیش کرے۔ آپکے پاس کوئی نہ کوئی توضیح المسائل ضرور ہوگی۔ آپ پوری توضیح چھان جایئے۔ کہیں بھی آپکو یہ نہیں ملے گا کہ ''امام نے فرمایا'' بلکہ ہر مقام پر یہی ہوگا کہ ''میرا فتویٰ یہ ہے''۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ جہاں حکمِ امام نقل کیا جائے وہاں لکھا جائے کہ یہ حکمِ امام ہے اور جہاں اپنا فتویٰ لکھا جائے وہاں بیشک کہا جائے کہ یہ میرا فتویٰ ہے تاکہ عمل کرنے والا یہ سمجھ کر عمل کرے کہ وہ کس کے حکم پر عمل کر رہا ہے۔ امام کے حکم پر یا مجتہد کے حکم پر؟ ورنہ جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے اس طرح ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ یہ مقدسین ہم تک حکمِ امام ہی پہنچاتے ہیں۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ دونوں چیزوں کو الگ الگ رکھا جائے اور اللہ کا بھی یہی حکم ہے کہ '' ولا تلبسوا الحق با لبا طل ''۔ حق و باطل کو آپس میں گڈمڈ مت کرو۔

دوسرا دعویٰ جو آپ نے فرمایا ہے وہ آپ نے ایک قاعدے کلّیے کے طور پر بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ ''مجتہد کا فتویٰ قولِ معصومؑ پر مبنی ہوتا ہے اسکی ذاتی رائے نہیں ہوتا''۔ اس سلسلے میں میری صرف اتنی گذارش ہے کہ پہلے لفظ مجتہد کو سمجھ لیا جائے بلکہ اس سے بھی پہلے خود لفظِ اجتہاد کی تعریف جان لی جائے تو بات کو سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔ یہ تعریف ہم نے کشف الحقائق کے صفحہ ۲۵ پر درج کی ہے جہاں اسے ایک عظیم الشان مجتہد الاستاذ علامہ اسد حیدر نجف اشرف

عراق کی کتاب ''الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ'' جلد اول کے صفحہ ۱۹۶ سے اخذ کیا گیا ہے۔

''اجتہاد کسی فقیہ کی اس انتہائی کوشش کا نام ہے جس سے حکم شرعی کا ظن حاصل کیا جائے''۔

اجتہاد کی یہ اصطلاحی تعریف خود شاہد ہے کہ اجتہاد مجتہد کو کبھی بھی منزلِ یقین پر نہیں پہنچاتا بلکہ اسکی منزلِ آخر وہ ''ظن'' ہوتا ہے جسکو بنیاد بنا کر وہ فتویٰ صادر کرتا ہے اور اس طرح ابتدا میں ہی آپ کا دعویٰ مسترد ہو جاتا ہے کیونکہ قولِ معصومؑ سے انسان کو یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ ظن لہٰذا یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مجتہد کا فتویٰ مبنی بر نص نہیں ہوتا بلکہ اسکی بنیاد ظن و گمان ہوتا ہے۔شاید میری بات پوری طرح واضح نہ ہو پا رہی ہو اس لئے میں اسکی تھوڑی سی وضاحت کرتا ہوں۔

انسان کی مختلف حیثیات و کیفیات

ہر انسان مختلف اوقات میں مختلف کام کر رہا ہوتا ہے اور ہر حالت میں اسکی حیثیت اور کیفیت جدا ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص وکیل ہے تو جس وقت وہ امورِ وکالت میں مصروف ہوگا اس وقت وہ وکیل ہوگا۔جب وہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گذار رہا ہوگا تو اس وقت وہ باپ ہوگا۔جب وہ کسی تقریب میں جائے گا تو اگر چہ اسے وکیل صاحب ہی کہہ کر پکارا جائے گا لیکن عملی طور پر وہ وکیل نہیں ہوگا بلکہ مہمان ہوگا۔اسی اصول پر سمجھئے کہ مجتہد جب حصولِ ظن میں مشغول ہوگا اس وقت وہ مجتہد ہوگا لیکن جب وہ احکام قطعیہء معصومؑ دیکھ رہا ہوگا اور انکو جانچ پرکھ رہا ہوگا تو اس وقت وہ مجتہد نہیں ہوگا بلکہ علمِ رجال اور علمِ درایت کا ماہر ہوگا اور جب وہ حکمِ معصومؑ بتا رہا ہوگا تو اس وقت وہ ناقلِ حدیث ہوگا لہٰذا جس حکم کا ظن سے کوئی علاقہ نہ ہو اور جو قطعیت پر مبنی ہو ایسے حکم کو ہرگز کسی کا فتویٰ نہیں کہا جا سکتا اور اگر کوئی اسکو اپنا فتویٰ کہتا ہے تو اسکی یہ بات سراسر بد دیانتی اور خیانت کی دلیل ہوگی۔اور یہیں سے میں عرض کرتا ہوں کہ مجتہد کے فتویٰ اور قولِ معصومؑ میں

مطابقت پیدا ہو جانے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اجتہاد کا یہی مطلب ہے بلکہ حدیث معصوم بیان کرنا اور اپنا فتویٰ صادر کرنا دو الگ الگ کام ہیں جو انسان مختلف حیثیات میں سرانجام دیتا ہے اور یہ کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہئے۔

مزید وضاحت

اگر کبھی نص اور فتوے میں یکسانیت واقع ہو جائے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ میں آپکو ایک عملی مثال دیتا ہوں تاکہ آپ مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

اگر اہل خلاف کی چاروں فقہوں کو اکھٹا کر دیا جائے تو اس مجموعے میں سے پوری فقہ امامیہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا عملی مظاہرہ اس وقت ہوا جب شہنشاہِ اکبر نے شہید ثالث نور اللہ شوستریؒ کو چیف جسٹس بنانے کی پیشکش کی۔ انھوں نے یہ عہدہ قبول کرنے کی یہ شرط رکھی کہ وہ چاروں فقہوں سے ہی فتویٰ دیں گے لیکن کسی ایک فقہ کے پابند نہیں ہونگے بلکہ چاروں میں سے کسی بھی فقہ سے حکم لگا سکیں گے۔ اکبر نے یہ شرط درباری علماء کے سامنے رکھی جنھوں نے اسے معمولی بات سمجھتے ہوئے قبول کرلیا۔ اب ہوا یہ کہ جب بھی کوئی مسئلہ شہید ثالثؒ کے پاس آتا تو وہ اسکے حل کے لئے چاروں فقہوں میں سے اس فقہ کی طرف رجوع کرتے جسکا حکم فقہ امامیہ کے مطابق ہوتا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے میں علماء دربار نے یہ محسوس کرلیا کہ عملاً پورے ملک میں فقہ امامیہ رائج کر دی گئی ہے لہٰذا انھوں نے شور مچانا شروع کیا لیکن چونکہ وہ پہلے ہی شرط قبول کر چکے تھے اس لئے انکا شور مچانا انکے کسی کام نہ آیا۔

آپ نے اچھی طرح جان لیا کہ احکام میں کہیں کہیں مطابقت پیدا ہو جانے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ فتوے کی بنیاد احکامِ معصومینؑ ہوتے ہیں۔

سوال کا آخری حصہ

اب میں آ پکے سوال کے آخری حصہ کی طرف آ تا ہوں جس میں آپ نے مجھ سے وضاحت مانگی ہے کہ میں مجتہدین کے بارے میں بقول آپ کے ''سوء ظن'' میں کیوں مبتلا ہوں ۔ میں آ پکو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی کی طرف سے بھی سوء ظن نہیں رکھتا۔ میری زندگی کا منشور یقین ہے ۔ ظن نہیں ۔ مجھے اگر اختلاف ہے تو وہ اصولی ہے ۔ میرے لئے حق وصداقت وایمان وعمل ۔ غرض ہر شے کا معیار صرف وصرف محمدؐ وآلِ محمدؐ ہیں ۔ جو ان سے تمسک اور محبت رکھتا ہے وہ میرا بھائی ہے چاہے میں اس سے ذاتی طور پر ناواقف ہی کیوں نہ ہوں اور جو ان ذواتِ مقدسہ کے متوازی اپنی الگ قیادت کا جھنڈا گاڑے اور خود کو انکی سطح تک لانا چاہے یا انکی کسی فضیلت کا انکار کرے یا انکی شان کو گھٹائے یا عزاداری کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے تو میں اسکا دشمن ہوں چاہے وہ میرا باپ ۔ بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو ۔ چونکہ نظامِ اجتہاد براہِ راست محمدؐ وآلِ محمدؐ سے متصادم ہے اس لئے میں ہر حالت میں اس سے اختلاف رکھتا ہوں ۔ مجتہد تو فقط نظامِ اجتہاد کا ایک نمائندہ ہے ۔ اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں ۔ میری جنگ تو نظامِ اجتہاد کے خلاف ہے جو اہلبیتؑ کے دشمنوں کی ایجاد ہے اور اسے ہمیشہ اہلبیتؑ کے خلاف ہی استعمال کیا گیا ہے چاہے یہ غیروں میں ہو یا اپنوں میں ۔ تفصیلات کا یہ محل نہیں ۔ اسکے لئے آپ کشف الحقائق کی طرف رجوع فرمائیں ۔ یہاں تو آ پکے سوال کے جواب کے طور پر چند قبائح کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو اسی نظام کی پیداوار ہیں اور ان قبائح کے اثرات کس قدر مہلک ہوتے ہیں اسکا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں ۔

شرفِ انسانیت

اگر اللہ کی صنعتوں پر نظر ڈالی جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ بہت سی مخلوقات

ایسی ہیں جنکا تصور بھی ہمارے لئے محال ہے لیکن اسکے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شے کو خلق فرما کر اللہ نے فخر و مباہات نہیں کیا۔ صرف ایک مخلوق ایسی ہے جسکو خلق کر کے اللہ نے اپنی خلاقیت پر فخر فرمایا ہے۔ چنانچہ جب انسان کو پیدا کیا تو ارشاد فرمایا۔ ''فتبارك الله احسن الخالقين ''۔ (مومنون ۱۴) اور یہ اس لیے کہ اس نے انسان کو ایک ایسا جوہر نایاب عطا فرمایا ہے جسکی وجہ سے وہ تمام مخلوقات پر سبقت لے گیا اور وہ ہے جوہر عقل۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس فخر و مباہات کے جو اللہ نے انسان کے بارے میں کیا ہے وہ اسی انسان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے اگر یہ اس جوہر عقل کو استعمال نہ کرے۔ چنانچہ سورۂ اعراف ۱۷۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور انکی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور انکے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ بے خبر ہیں''۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منشاء خداوندی یہ ہے کہ انسان ترقی کے زینے طے کرے۔ انسانِ طبعی سے انسانِ نفسی تک پہنچے۔ پھر ترقی کر کے انسانِ عقلی اور انسانِ روحی کے مقام کو حاصل کرے اور یہ بھی آپ نے جان لیا کہ انسانیت کی سطح سے نیچے گرنا اللہ کو کس قدر ناپسند ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ انسان سطحِ انسانیت پر رہے۔ چوپایا نہ بنے۔ جس نظام پر گفتگو ہو رہی ہے اس پر پہلی فردِ جرم یہی ہے کہ اسکا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ انسان عقل سے کام لینا چھوڑ دے اور جانوروں کی سطح پر آجائے۔ چنانچہ ہم ''تقلید'' کی اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہیں جس سے بخوبی تصدیق ہو جائے گی کہ اس نظام کا مقصد کیا ہے۔ یہ تعریف علامہ علی الحائری کی کتاب ''رسالۃ التنقید فی جواز لاثبات الاجتہاد و التقلید'' سے اخذ کیا گیا ہے جسے ہم کتاب ''الرسالۃ العلمیہ فی اخبار المعصومین'' کے صفحہ ۱۱۳ سے نقل کر رہے ہیں:۔

''پہلی بات تقلید ہے جو الفاظ کی بناوٹ کے علم کی رو سے تفعیل کے مصدر سے

نکلتا ہے اور قلادہ سے بنتا ہے۔ لغت میں اسکے معنی یہ ہیں۔ گردن میں گردن بند۔ گلوبند یا پٹہ پہن لینا۔ جیسا کہ کسی جانور کی گردن میں ڈال کر رسی سے باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح عوام جہلاء اپنی گردن میں پٹہ اور مجتہد کی اطاعت کی رسی باندھ لیتے ہیں کہ وہ انکی منشاء کے خلاف حرکت نہ کر سکیں۔ عرفِ عام میں تقلید یہ ہے۔ کسی کے یا مجتہد کے قول کو اختیار کرنا اور بلا دلیل مانگے اس پر اللہ کا حکم سمجھ کر عمل کرنا۔ چونکہ عوام اپنی جہالت اور بے چارگی کی وجہ سے دین کو نہیں سمجھ سکتے لہٰذا انھیں دلیل و برہان کی کیا ضروت ہے؟۔ انھیں لازم ہے کہ دین کے معاملے میں مجتہد کی تقلید کریں اور شرع کے تمام مسائل کو بلا استدلال معلوم کریں اور بلا چون و چرا عمل کریں اور مجتہد کے حکم کو اللہ کا حکم سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جب مقلد نے اپنے پٹے کی رسی مجتہد کے ہاتھ میں تھما دی تو اسے دلیل و برہان مانگنے کا حق نہیں رہا اور اگر جسارت کر کے اس نے دلیل و برہان مانگ ہی لیا تو اسے یہ جواب سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ میاں میرا پٹہ اتار کر کسی اور مجتہد کا پٹہ پہن لو۔ چوں چرا اسی سے کرنا''۔

آپ محسوس فرمائیں گے کہ یہ تقلید کی اصطلاحی تعریف جن الفاظ میں بیان کی گئی ہے ان میں **جانور۔ پٹہ اور رسی** کی تکرار بے معنی نہیں بلکہ یہ نظام لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے انسان کو انسانیت کی سطح سے گرا کر خالص جانور کی سطح پر لانا چاہتا ہے۔ آپ نے بقرعید کے موقعہ پر لوگوں کو اپنے اپنے جانوروں کے گلے میں پٹہ ڈال کر اور رسی کا سرا خود پکڑ کر انھیں گھماتے پھراتے دیکھا ہوگا۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کسی جانور نے پوچھا ہو کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کیوں لے جا رہے ہو؟ مذکورہ نظام بعینہ یہی توقع انسانوں سے بھی رکھتا ہے اور اسی کی انکو ترغیب دیتا ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنے واضح الفاظ میں ایک عظیم الشان مجتہد کی

زبانی تقلید کی تعریف پڑھ لینے کے بعد بھی وہ کون عقل مند ہوگا جو خود کو جانوروں کی سطح پر لانے کے لئے خوشی خوشی تیار ہوگا بلکہ الٹا اس پر فخر بھی کریگا۔ کیا سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۹ جو اوپر بیان کی گئی ایسے ہی دشمنانِ عقل کی شان میں تو نازل نہیں ہوئی؟۔ واضح رہے کہ جانور کے گلے میں پٹہ ڈالنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ یہ پہچان لیں کہ یہ جانور کسی کی ملکیت ہے۔ انسان اگر کسی کی ملکیت ہو تو اسے غلام کہا جاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ مومن کسی کا غلام نہیں ہوتا سوائے اسکے جسکے ساتھ اسے محشور ہونا ہے۔ یہ بات بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدمی بیک وقت دو آقاؤں کا غلام نہیں ہوسکتا اس لئے جس کسی کو بھی مجتہد کی غلامی کرنا ہے اسے لازمی طور پر اہل بیتؑ کی غلامی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

یہ میری پہلی بات تھی۔

ترغیبِ جہل اور سلبِ عقل

تقلید کی جو تعریف آپ نے پڑھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نظام چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ جاہل اور بے عقل ہی رہے تا کہ وہ ہمیشہ انکا محتاج رہے اور انکا جال توڑ کر بھاگ نہ سکے۔ چنانچہ مومنین کو جاہل۔ بے عقل اور بے چارہ جیسے القاب سے نوازا گیا ہے۔ گویا یہ تاثر دیا گیا ہے کہ علم صرف اور صرف مدرسوں میں جا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ہر شخص اپنا کام کاج چھوڑ کر مدرسوں میں نہیں جا سکتا اس لئے یہ طے کر دیا گیا کہ جو شخص مدرسے میں نہ جائے وہ جاہل ہے اور اسے اپنے گلے میں تقلید کا پٹہ ڈلوانا ہی پڑے گا اور اس بات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ لوگ اپنے گھروں پر رہ کر بھی آثارِ معصومینؑ سے احکامِ شرعیہ کا علم حاصل کر سکتے ہیں اور انھیں اپنے گلے میں کسی کا پٹہ ڈلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی دن کے لئے امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا۔" (ہماری روایات کو) لکھو اور اپنے علم کو اپنے بھائیوں میں نشر و اشاعت کرو اور مرتے وقت اپنی اولاد کو کتب کا وارث بناؤ کیونکہ لوگوں پر ایک

مشکل دور آئے گا جس میں وہ ان کتابوں ہی سے مانوس ہونگے'' (اصول کافی)۔ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں لکھتے ہیں۔'' مجھے اپنی زندگی کی قسم میں نے احادیث کو ایسی کشتیٔ نجات پایا ہے جو سعادت کے ذخیروں سے لبریز ہے اور مینار ہائے نور سے اس طرح مزین و معمور پایا ہے جو جہالت کی تاریکیوں سے نجات دینے والے ہیں۔ میں نے کہیں کوئی ایسی بات نہیں پائی جسکا نچوڑ احادیث میں نہ ہو''۔

کیا ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اس علمی خزانے سے محروم رہیں؟ فرامینِ معصومینؑ پر تعقل و تفکر و تدبر کر کے منازلِ علمی و عقلی تک نہ پہنچ پائیں اور خود کو جانوروں کے ریوڑ میں شامل کیے رہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جس نظام کا بنیادی مطالبہ تقلید ہو اسکا تعلیم سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ تقلید اور تعلیم دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک مقلد عمر بھر تقلید کرنے کے بعد بھی جاہل ہی رہتا ہے۔ اگر جاہل نہ ہو تو مقلد نہیں ہو سکتا کیونکہ مقلد کے لئے جاہل ہونا شرطِ لازمی ہے بصورتِ دیگر وہ خود مجتہد بن جائے گا۔ اگر ان حضرات کا مطمحِ نظر تعلیم ہوتا تو انکے پاس اتنے وسائل موجود ہیں کہ گلی گلی محلے محلے درس گاہوں کا جال بچھا دیتے اور لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے کیونکہ قرآن و حدیث کا پڑھنا اور سمجھنا ہر شخص پر واجب عینی ہے۔ اسکے برخلاف جماعت اسلامی کی طرز پر جو محافلِ درس یہ لوگ منعقد کرتے ہیں ان میں تعلیم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ تقلید ہی پڑھائی جاتی ہے اور مجتہدین کے فتاویٰ ہی رٹائے جاتے ہیں۔ لوگوں کو یہ باور کرانا کہ علم بہت مشکل چیز ہے اور عام لوگ اسے ہرگز حاصل نہیں کر سکتے بلکہ چند گنتی کے لوگ ہی یہ کام کر سکتے ہیں دراصل عوام کو علم سے بے رغبت اور مایوس کرنا ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ اگر بچے کو ابتدا میں ہی یہ کہہ دیا جائے کہ علم بہت مشکل چیز ہے اور اسے حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے تو وہ پہلے دن سے ہی تعلیم سے بددل ہو جائے گا اور کبھی علم حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسکے برخلاف ہم

دیکھتے ہیں کہ بچے کو رغبت دلانے کے لئے رنگ برنگے چارٹ۔تصویریں اور کتابیں فراہم کی جاتی ہیں تاکہ اسکا شوق بڑھے اور اس طرح ایک عام آدمی کا بچہ بھی علم حاصل کرکے اعلیٰ مقامات تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر آخر دین میں یہ اصول کیوں تبدیل کردیا جاتا ہے؟۔ایک عجیب وغریب اصول بنالیا گیا ہے کہ یاتو آدمی خود مجتہد ہو یا پھر مقلد ہو۔ یہ بات اصلاً غلط ہے۔ اصول یہ ہے کہ یاتو آدمی خود عالم ہو یا پھر طالب علم ہو۔فرامین معصومینؑ بھی اسی اصول کی توثیق کرتے ہیں چنانچہ اصول کافی میں امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان موجود ہے۔

''لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔عالم۔متعلم اور ہرزہ کار (بے ہودہ کاموں میں مشغول رہنے والے)۔پس ہم عالم ہیں۔ہمارے شیعہ متعلم ہیں اور لوگ ہرزہ کار''۔اس حدیث کی رو سے جو شخص بھی شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اسکا طالب علم ہونا لازمی ہے اور اگر وہ طالب علم نہیں ہے تو پھر چاہے وہ خود کو مقلّد کہے یا کوئی اور نام رکھ لے وہ بہر حال ہرزہ کار ہی کے زمرے میں آئے گا کیونکہ انسانوں کی کوئی چوتھی قسم ہے ہی نہیں۔

یہ میری دوسری بات تھی۔

علامتِ زوال

نہج الاسرار میں جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔''چار چیزیں زوال پر دلالت کرتی ہیں۔۱۔اصولِ دین کو ضائع کرنا۔۲۔فروع سے تمسک اور انکو مقدم جاننا۔۳۔رذیلوں کو مقدم رکھنا۔۴۔صاحبان فضیلت کو موخر کرنا''۔

نظام اجتہاد اس اعتبار سے سرتاپا علامت زوال ہے۔سب سے پہلی ہوشیاری یہ کی گئی کہ اصول سے خود کو الگ کرلیا گیا اور فرمایا گیا کہ اصول میں خود غور وتدبر کرو۔اصول سمجھانا ہمارا کام نہیں ہے۔اپنا عقیدہ خود طے کرو۔اس طرح اصول کے بارے میں ہر قسم کے سوالات کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔اب

کوئی اصول دین کا مسئلہ مولوی سے نہیں پوچھتا اور جب نہیں پوچھتا تو جاہل رہتا ہے۔ اس طرح حقیقتاً اصول دین کو ضائع کر دیا گیا۔ البتہ فروع کے بارے میں سوال کرنے والوں کا ایک جم غفیر آپکو نظر آئے گا کیونکہ انکو یقین دلا دیا گیا ہے کہ کلمہ رٹ کر تم سچے۔ کھرے اور پکے شیعہ بن گئے اور اب تمھیں مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب جو کچھ ہیں وہ فروع ہیں اور یہی باعث نجات ہیں۔ اس طرح زوال کی اول الذکر دو شرائط پوری ہو گئیں۔ باقی رہیں آخر الذکر دو شرائط سو وہ بھی بحمد اللہ پوری ہو چکی ہیں۔ آپ اپنے مشاہدے کو کام میں لایئے اور دیکھئے کہ کس کو مقدم کیا جا رہا ہے اور کس کو موخر؟۔ کس کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور کس سے بے رغبتی پیدا کی جا رہی ہے؟۔ میری اپنی سرگزشت تو یہ ہے کہ ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ اگر ایک مسئلے میں ایک طرف امام کا حکم صریح موجود ہو اور دوسری طرف اسکے بالکل برخلاف کسی مجتہد کا فتویٰ ہو تو آپ کس کی بات مانیں گے؟۔ ارشاد ہوا۔ ''حالات کے حساب سے تو مجتہد ہی کا کہنا مانیں گے''۔ اسکے بعد زوال آنے میں کونسی کسر رہ گئی ہے یہ مجھے آپ بتا دیں۔

یہ میری تیسری بات تھی۔

شرک فی العبادت

میری چوتھی بات یہ ہے کہ نظام اجتہاد و تقلید کا لازمی نتیجہ شرک فی العبادت ہے۔ میں نے کشف الحقائق میں اصول کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۱۹ کی پہلی حدیث نقل کی تھی جو تشریح مطلب کے لئے ایک بار پھر آپکی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس حدیث میں امام نے واضح طور پر سمجھایا ہے کہ شرک فی العبادت سے کیا مراد ہے۔ شرک کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو پوجنے لگے اور سجدے کرنے لگے تب ہی شرک ہوتا ہے بلکہ شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ بات صرف متوجہ ہونے اور حق کو قبول کرنے کی

ہے ورنہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ احکام معصومینؑ کو تو پہلے ہی پیچھے دھکیل دیا گیا اب لوگوں کے نزدیک انکے فرامین بھلا کیا اہمیت رکھتے ہونگے۔ مگر ہاں اب بھی ایسے دل باقی ہیں جو نورِ حق کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہی میری بات سنیں گے بھی اور قبول بھی کریں گے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے سورۂ توبہ کی آیت ۳۱ پڑھی اور اسکا مطلب پوچھا۔ ''انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا رکھا ہے''۔ فرمایا۔ ''نصاریٰ کو انکے علماء و رھبان نے اپنے نفسوں کی پرستش کی دعوت نہیں دی تھی اور اگر ایسی دعوت دیتے تو وہ قبول نہ کرتے۔ لیکن انکے علماء نے یہ کیا کہ حلال کو حرام بتایا اور حرام کو حلال۔ پس انھوں نے اپنے علماء کی تقلید کی اور اس طرح لاشعوری طور پر انکی عبادت کی''۔

اس حدیث سے یہ تو ہر صورت میں ثابت ہوگیا کہ غیر معصوم کی تقلید کرنے کا مطلب اسکی عبادت کرنا ہے جو صریحاً شرک ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ شرک تو صرف اس صورت میں ہوگا جبکہ علماء فی الواقع حلال کو حرام اور حرام کو حلال کریں۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ جاہل عوام کو کیا پتا کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر رہا ہے یا نہیں۔ وہ تو اسکی ہر بات کو حق سمجھتے ہیں اور آنکھ بند کر کے اسکی تقلید کرتے ہیں۔ معصومؑ نے علماء کے حلال و حرام کرنے کے عمل کو شرک نہیں کہا بلکہ انکی اندھی تقلید کرنے کو شرک کہا ہے اور یہی ثابت کرنا ہمارا مقصد تھا۔ حالانکہ حلال و حرام کرنے کا عمل بجائے خود شرک ہے لیکن وہ ''شرک فی الامر'' کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طرح شرک کی نسبت دونوں طرف جاتی ہے۔

یہ میری چوتھی بات تھی۔

حقِ امامؑ

اگر آپکا کوئی انتہائی قریبی دوست یا رشتہ دار ہو مثلاً زید۔ اور کوئی اجنبی آدمی آپکے پاس آئے اور کہے کہ زید نے کہا ہے کہ ایک لاکھ روپے مجھے دے دیں تو کیا آپ

بغیر تحریری وثیقہ دیکھے اور بغیر اپنے دوست یا رشتہ دار کی تصدیق حاصل کئے اسے ایک لاکھ روپے دے دیں گے؟ ایک لاکھ تو بڑی چیز ہے آپ تو اسے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے اور اگر آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے مطالبہ وثیقہ کے باوجود وہ شخص محض زبانی کلامی روپے لینے پر اصرار کر رہا ہے تو آپ یقیناً اسے شبہ کی نظر سے دیکھیں گے اور پولیس طلب کر لیں گے۔ اسی اصول پر یہ سمجھئے کہ از روئے قرآن و حدیث خمس حق امام ہے۔ اب جبکہ ہمارے زمانے کے امام پردۂ غیبت میں ہیں تو نہ وہ ہم سے خمس طلب کر رہے ہیں نہ خود ہمارے لئے ان تک پہنچنا اور انکی خدمت میں خمس پیش کرنا ممکن ہے تو ایسے میں اگر کوئی ہم سے مطالبہ کرے کہ وہ امام کا نائب اور انکا نمائندہ ہے اور خمس اسکے حوالے کیا جائے درآں حالیکہ نہ اسکے پاس امام کے نائب اور نمائندہ ہونے کی کوئی دلیل ہو اور نہ اسکے پاس اس بارے میں امام کا کوئی تحریری وثیقہ موجود ہو تو کیا آپ اس کو وہ مال دے دیں گے جو خالصتاً امام کا ہے؟ شرعی حیثیت تو ایک طرف رہی یہ بات تو عقلی اعتبار سے بھی جائز قرار نہیں دی جاسکتی اور ایسا کرنا یقیناً خیانت شمار کیا جائے گا اور جو شخص آپ سے طلب کر رہا ہے اسکا عمل ڈاکہ یا فریب دہی شمار ہوگا۔ اسکے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ جب تک انسان مجتہد کو خمس ادا نہ کرے اس وقت تک وہ مقلد نہیں بن سکتا اور جب تک مقلد نہ بنے اس وقت تک اسکے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ کیا عقل سلیم ایسے نظام کی حمایت کرسکتی ہے؟

یہاں ایک اور شبہ کا ازالہ ضروری ہے اور یہ ضرورت اس لئے پڑی کہ لوگوں کو یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ خمس کے کئی حصے ہوتے ہیں اور ان میں سے صرف ایک حصہ امام کا ہوتا ہے۔ جب ہم نے کشف الحقائق میں یہ بات ثابت کی کہ ائمہ نے ظہور امام تک شیعوں پر سے خمس کو معاف کر دیا ہے تو پھر یہی اشتباہ پیدا کیا گیا جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اب ایک عام آدمی یہ سوچتا ہے کہ جو چیز معاف

ہوئی ہے وہ خمس کا صرف اتنا حصہ ہے جو انکے خیال میں امامؑ کا حصہ ہے اور باقی حصے مستحقین کو واجب الادا ہیں۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے صرف وہ اقوال معصومینؑ ہی کافی ہیں جو خمس معاف کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں۔ کسی بھی امامؑ نے یہ نہیں کہا کہ ہم تمھارے لئے خمس کا وہ حصہ معاف کرتے ہیں جو ہمارا حصہ ہے بلکہ ہر مقام پر آپکو یہی ملے گا کہ ''ہم نے اپنے شیعوں پر سے خمس معاف کر دیا ہے'' اور خمس کہتے ہیں پانچویں حصے کو۔ یعنی ائمہؑ نے پورا کا پورا خمس معاف کیا ہے نہ کہ خمس کا کوئی خاص حصہ۔ شرعی اعتبار سے پورا کا پورا خمس امامؑ کا حق ہے۔ وہ جسکو چاہیں دیں اور جسکو نہ چاہیں نہ دیں۔ ایک روایت بھی ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جس میں ہمیں کہا گیا ہو کہ ہم خود خمس کے حصے بخرے کرتے پھریں اور ایک خاص حصہ لے جا کر امامؑ کو دے دیں۔ خود رسولؐ اللہ کے زمانے میں بھی پورا کا پورا خمس رسولؐ اللہ کو ہی پیش کیا جاتا تھا اور تقسیم کا کام خود وہی کیا کرتے تھے نہ کہ خمس دینے والے امتی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پھر سادات کا کیا ہوگا۔ کیا ظہور امامؑ تک وہ محروم رہیں گے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ احکامِ شرعی میں ہمارے احساسات و جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ جو حکم ہے سو ہے۔ رہا سادات کا مسئلہ تو میرا سوال یہ ہے کہ خود زمانۂ ائمہؑ میں سادات کیا کرتے تھے؟ کیونکہ جب خود ائمہؑ کو خمس نہیں ملتا تھا تو سادات کو کہاں سے ملتا؟ ہاں تاریخ میں ہمیں یہ ضرور ملتا ہے کہ کچھ لوگ ائمہ طاہرین کو ہدیے بھیجا کرتے تھے۔ تو آج لوگوں کو کس نے روکا ہے کہ وہ سادات کو ہدیے بھیجیں؟ امداد کے طور پر نہیں بلکہ اکرام کے طور پر۔ آخر صرف خمس پر ہی اصرار کیوں ہے؟ کیا کسی بھی بہانے ائمہؑ اطہار کی نافرمانی کرنا ضروری ہے؟ خمس تو پھر بھی ایک معین مقدار ہے یعنی پانچواں حصہ لیکن اللہ نے تو ایک ایسی چیز رکھ دی ہے جو لامحدود ہے اور وہ ہے ''احسان''۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

''بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا''۔ احسان میں کوئی تقید نہیں ہے۔

آپ کا جتنا جی چاہے دے دیں۔اگر سادات سے واقعی کوئی ہمدردی ہوتی تو انھیں احسان کے تحت دیا جاتا لیکن سادات کے کاندھے پر بندوق رکھ کر وصولی خمس کا جواز پیدا کرنا خود بتا رہا ہے کہ نیت کچھ اور ہے۔خمس عام طور پر ایران اور عراق بھیجا جاتا ہے۔اگر آپ ایران اور عراق میں بسنے والے سادات کا حالِ زار دیکھیں تو آپکا دل خون کے آنسو روئے گا۔پھر آخر سادات کے نام پر وصول کیا گیا یہ خمس کہاں جاتا ہے؟اور کس پر خرچ ہوتا ہے؟

یہ میری پانچویں بات تھی۔

اقتدار و انتشار

کسی بھی گروہ یا معاشرے کی بقا اور اسکی نشو و نما کے لئے سب سے اہم شرط اسکے افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق ہوتا ہے۔جس معاشرے میں اتفاق نہیں ہوتا وہ بہت جلد انحطاط پذیر ہو جاتا ہے اور بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔اب اتفاق کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ کسی وقتی اور ہنگامی ضرورت کے تحت متحد ہو جانا مثلاً دشمن سے جنگ کی صورت میں آپس کے اختلافات ختم کر دیئے جاتے ہیں۔یہ ایک عارضی صورت ہے اور جب صورتِ حال معمول کی طرف لوٹتی ہے تو یہ اتحاد بھی ختم ہو جاتا ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ مشترکہ مفادات کی خاطر اتحاد کر لیا جائے۔اسے MARRIAGE OF CONVENIENCE کہتے ہیں۔یہ بھی عارضی ہوتی ہے اور مطلب نکل جانے پر ختم ہو جاتی ہے۔تیسری صورت اتحاد بذریعہ ڈنڈا کی ہے یعنی کوئی سخت گیر حکمران آ جائے اور اسکے خوف سے لوگ آپس میں لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں۔یہ بھی عارضی چیز ہے۔چوتھی صورت یہ ہے کہ حق کے خلاف اتحاد کر لیا جائے۔ایسا اتحاد غیر فطری اور مصنوعی ہوتا ہے۔اوپر سے لوگ متحد نظر آتے ہیں لیکن انکے دل پھٹے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ سورۂ حشر میں منافقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔"یہ (منافقین) آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔تم انھیں متحد سمجھتے ہو مگر انکے دل جدا جدا

ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ عقل کو استعمال نہیں کرتے''۔ اصل اتحاد وہ ہوتا ہے جو کسی نظریے پر ہو اور جسکی محرک عقل ہو نہ کہ خواہشاتِ نفسانی۔

مذکورہ نظام بھی بظاہر اتحاد کا داعی ہے لیکن اسکے تجویز کردہ اتحاد کی بنیاد نظریہ نہیں بلکہ اوّلذکر چار عوامل ہوتے ہیں مثلاً:۔

ا۔ مسلمانوں کا ایک خاص نعرہ ہے اور وہ یہ کہ ''اسلام خطرے میں ہے''۔ خاص طور پر الیکشن کے زمانے میں یہ نعرہ بہت زور پکڑ جاتا ہے اور ایک ہنگامی صورت حال بن جاتی ہے جسکے تحت تمام مذہبی پارٹیاں متحد ہو جاتی ہیں اور الیکشن کے بعد پھر اپنے اپنے رستے پر ہو لیتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ایک دوسری چیز ہے جو مستقل خطرے سے دوچار رہتی ہے اس لئے یہاں ایک جدا نعرہ ہے اور وہ یہ کہ ''مرجعیت خطرے میں ہے'' اور اسی خطرے کے پیش نظر سال کے بارہ مہینے ایمرجنسی نافذ رہتی ہے۔ کبھی انکو خوابوں میں امریکہ نظر آتا ہے۔ کبھی اسرئیل اور کبھی خود اپنے ہی بھائی بند جنھیں یہ لوگ ''ضدِّ انقلاب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کو اور کوئی کام ہے ہی نہیں سوائے مرجعیت ختم کرنے کے اور یہ مرجعیت بھی ایسی سخت جان ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ بہرحال اس نعرے کی بنیاد پر مستقل ایمرجنسی نافذ کر کے یہ لوگ اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ اس فرضی خطرے کی بو سونگھ کر لوگ ہمارے گرد اکھٹے ہو جائیں گے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو دونوں ہی نعرے باطل ہیں۔ نہ اسلام کبھی خطرے میں پڑ سکتا ہے اور نہ مرجعیت بشرطیکہ ان دونوں سے وہی مراد لیا جائے جو انکے حقیقی معنی ہیں۔ ہمارے مراجع ہمارے ائمۂ معصومینؑ ہیں جنھوں نے کبھی نعرہ نہیں لگایا کہ ''ہماری مرجعیت خطرے میں ہے''۔ حالانکہ حکومتیں ہمیشہ اسے ختم کرنے کے درپے رہیں۔ لیکن چونکہ مرجعیتِ ائمہؑ کا تعلق حصولِ اقتدار و مالِ دنیا سے نہ تھا بلکہ وہ مینارۂ ہدایت تھی جسکی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے یہ مرجعیتِ دائمی ہے جو ازل تا ابد تمام

زمانوں پر محیط ہے۔ خوف اور سکرات کے عالم میں وہی مرجعیت رہتی ہے جسکا مقصد حصول دولت واقتدار ہو اس لئے اسے ہمہ وقت یہی خطرہ لگا رہتا ہے کہ حکومت اب گئی اور تب گئی۔ اس گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ ایسی مصنوعی ایجنسی سے اتحاد و اتفاق پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فقط لوگوں کی نفسیات سے کھیلنا اور بے وقوفوں کی ہمدردیاں سمیٹنا ہے۔

۲۔ ذاتی مفادات۔ یعنی اتنا میرا۔ اتنا تیرا۔ اوپر سے لیکر نیچے تک ہر سطح پر کچھ لوگوں کے مفادات انکی حیثیت کے مطابق وابستہ رہتے ہیں لہذا وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ آپس میں متحد و متفق ہیں لیکن حقیقتاً یہ MARRIAGE OF CONVENIENCE ہوتا ہے۔

۳۔ چونکہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے انکے ہاتھ حکومت آگئی ہے جو بدترین ڈکٹیٹر شپ کے تحت چلائی جارہی ہے اس لئے حکومت کا باطنی سربراہ تمام سفید و سیاہ کا مالک ہے۔ اسی ڈکٹیٹر کو مرکز اتحاد بنالیا گیا ہے۔ اگر آج یہ اقتدار ختم ہوجائے تو سارا اتحاد بُھس کی طرح ہوا میں اڑ جائے۔ حقیقتاً یہ اتحاد نہیں بلکہ اقتدار پرستی ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ دین اور علم کو بھی اقتدار کا پابند بنادیا گیا ہے یعنی جسکے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہو وہی سب سے بڑا عالم اور وہی دین کا ٹھیکیدار ہے۔

۴۔ یہ اتحاد آلِ محمدؐ کے مقابلے میں غیر معصوم لوگوں کی قیادت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے وجود میں آیا ہے اس لئے سورۂ حشر کی بیان کردہ آیت کی زد میں آتا ہے۔

اب رہا حقیقی و معنوی اتحاد جو نظریے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اسکا اس نظام میں کوئی تصور نہیں۔ جو شے دلوں کو آپس میں جوڑتی ہے اور ایک دائمی اتحاد قائم کرتی ہے وہ عقیدہ ہے اور عقیدے کی اس نظام میں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس میں صرف مذہبی رسومات کو ہی عقیدہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ رسومات جدا جدا ہوتی

ہیں اس لئے ایسی صورت میں گروہ بندیاں اور پارٹی بازی اس نظام کا جزوِ لاینفک ہیں۔اس سے قطع نظر ہم اگر ایک لمحے کے لئے عقیدے کو نظر انداز بھی کر دیں تو خود فروعات میں بھی جو انکا اصل میدان ہے ایسے اکھاڑے قائم کر دیئے گئے ہیں جن میں انواع واقسام کی کشتیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح پوری قوم کو گروہ درگروہ تقسیم کر دیا گیا ہے اور تمام فروعی مسائل میں اس قدر اختلافات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی غیر شخص یہ پہچان کر ہی نہیں سکتا کہ شیعوں میں کون شیعہ کس قسم کا شیعہ ہے۔شیعوں کو ٹولیوں میں بانٹنا اور انھیں مرکز اتحاد یعنی ائمہ معصومینؑ سے دور رکھنا ایک ایسا جرم ہے جسے ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا۔نہ ہی یہ بات قابل معافی ہے کہ شریعت میں دخل اندازی کی جائے اور اپنی مرضی سے جس شے کو چاہے حلال کر دیا جائے اور جس شے کو چاہے حرام کر دیا جائے۔اگر ایک ہی شے کو بیک وقت حلال بھی قرار دیا جائے اور حرام بھی تو اس صورت میں وہ لوگ جو کسی ایسے کے مقلد ہیں جس نے اس شے کو حرام قرار دیا ہے ان لوگوں کو حرام خور سمجھیں گے جو اس کے مقلد ہیں جس نے اس شے کو حلال قرار دیا ہے اور جو اپنے مرجع کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے اس شے کو حلال سمجھ کر کھاتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم کتاب ''اکمال الدین بولایت امیر المومنینؑ'' مولفہ علامہ سید نثار عباس نقوی کے صفحہ ۴۴ سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں جو ایک سوال کی صورت میں ہے۔''ڈاکٹر آیت اللہ صادقی تہرانی نے اپنی توضیح المسائل المعروف فقہی مسائل میں کیا یہ فتویٰ صادر نہیں فرمایا کہ خرگوش اور کوا حلال ہے۔اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے؟ کیا آقائے ابوالحسن اصفہانی سے لیکر آقائے سرکار خامنہ ای تک کسی نے خرگوش اور کوے کو حلال کیا ہے؟'' قارئین غور فرمائیں کہ باقی مجتہدین کے مقلد حضرات صادقی تہرانی صاحب کے مقلدین کو حرام خور کہیں گے یا نہیں؟ اس دھینگا مشتی کو دیکھ کر میرے ایک مرحوم دوست فرمایا کرتے تھے۔

۱۔چوپایوں میں ہر چوپایا حلال ہے سوائے چارپائی کے۔
۲۔پرندوں میں ہر پرندہ حلال ہے سوائے پتنگ کے۔
۳۔سمندری جانوروں میں ہر چیز حلال ہے سوائے کشتی کے۔

حرام وحلال کو بھی اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی مسئلے کی سنگینی ختم نہیں ہو جاتی۔ نماز ایک ایسا عمل ہے جو دن اور رات میں پانچ مرتبہ کیا جاتا ہے۔اگر اس میں بھی اختلافات پیدا کر دیئے جائیں اور نوبت سر پھٹول تک پہنچ جائے تو اتحاد ملت کا کیا حشر ہوگا؟۔ایک مرجع ہیں جن کا نام نامی آیت اللہ محمد علی طباطبائی ہے۔وہ کبھی کبھی پاکستان آتے رہتے ہیں۔چونکہ پاکستان اور ہندوستان ایسے بنجر علاقے ہیں کہ ۲۸ کروڑ آبادی میں ایک بھی ایسا نہیں جو مرجع بن سکے اس لئے اس قسم کی مخلوق اگر یہاں آجائے تو اسے عجوبہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ مرجع مذکور کو بھی مختلف علاقوں کے لوگ خوشامد درآمد کر کے لے جاتے تھے تاکہ وہ ایک وقت کی نماز انکی اقتداء میں پڑھ کر ثواب دارین حاصل کر لیں۔ایک مرتبہ ملیر کے ایک علاقے کے لوگ انکو لے گئے۔انھوں نے نماز پڑھائی تو تشہد میں ''علی ولی اللہ'' پڑھا دیا۔یہ سنتے ہی وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور آیت اللہ صاحب کو جان کے لالے پڑ گئے اور انکو بڑی مشکل سے مقتدیوں کی دست برد سے بچایا گیا۔لوگوں نے کہا کہ ہماری نماز باطل ہوگئی ہے اور اس لئے انھوں نے اپنی نماز کا اعادہ کیا۔

ان باتوں سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کے درمیان اختلافات کی کس قدر وسیع خلیج پیدا کر دی گئی ہے۔

یہ میری چھٹی بات تھی۔

کتمانِ حق

یہ معاملہ اپنی سنگینی کے اعتبار سے گذشتہ تمام معاملات پر بھاری ہے۔ہم اسکو درجہ بدرجہ سمجھیں گے اور پہلے قرآن میں تلاش کریں گے کہ اللہ کے نزدیک حق کو چھپانے کی کیا حیثیت ہے۔پھر قرآن میں ہی دیکھیں گے کہ حق سے مراد کیا ہے

اور پھر قرآن سے ہی پوچھیں گے کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہونا ہے۔
بقرہ۴۲ میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔ ''اور تم حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم (حقیقتِ حال) جانتے ہو''۔ کتمانِ حق کی ممانعت قرآن سے ثابت ہوگئی۔ اب دیکھتے ہیں کہ حق سے کیا مراد ہے۔

۱۔ سبا۶۔ ''اور جو لوگ علم دیئے گئے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے......الخ''

تفسیر صافی صفحہ۴۱۲ پر بحوالہ تفسیر قمی لکھا ہے کہ یہاں ''حق'' سے مراد جناب امیر المومنینؑ ہیں۔

۲۔ محمدؐ ۲۔۳۔ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر بھی ایمان لائے جو محمدؐ پر نازل کیا گیا اور وہ انکے پروردگار کی طرف سے حق ہے......الخ''

تفسیر صافی صفحہ۴۶۴۔۴۶۵ پر بحوالہ تفسیر قمی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ سورۂ محمدؐ میں ایک آیت ہمارے بارے میں ہے اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے۔ یعنی حق سے مراد ائمۂ معصومینؑ اور باطل سے مراد انکے دشمن ہیں۔

۳۔ یونس۵۳۔ ''اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ حق ہے۔ کہدو کہ ہاں میرے پروردگار کی قسم وہ یقیناً حق ہے اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو''۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ''اے رسولؐ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ حق ہے؟ تم ان سوال کرنے والوں سے کہدو خدا کی قسم ولایت علیؑ حق ہے اور تم اپنے انکار سے ہمیں عاجز کرنے والے نہیں ہو''۔ (اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۷۔ حدیث ۸۷)

پس ہمیں حدِ یقین تک معلوم ہوگیا کہ اللہ کے نزدیک حق سے مراد امیر المومنینؑ اور ائمۂ معصومینؑ ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ حق کو چھپانے والے کون ہوتے ہیں۔

اعراف ۴۴۔ ''پھر ایک اذان دینے والا انکے درمیان اذان دے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے''

جناب امیرؑ نے فرمایا ''وہ موذن میں ہونگا'' پھر فرمایا ''ظالم وہ لوگ ہیں جنھوں نے میری ولایت کو جھٹلایا اور میرے حق کو چھپایا''۔

اب میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود اپنے کانوں سے سنیں اور محسوس فرمائیں کہ اس نظام کے پروردہ جتنے بھی خطیب ہیں وہ اگر دو گھنٹے بھی تقریر کریں گے تو اس میں فضائل علیؑ وائمہؑ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ملے گا بلکہ محض فروعِ دین اور معاشرتی مسائل ہی انکا موضوع ہوگا۔ اسی طرح آپ انکی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔ ان میں بھی فضائل محمدؐ وآل محمدؑ کا بائیکاٹ ہی ملے گا۔ تو ہینِ اہل بیتؑ میں تو کتابیں مل جائیں گی مگر فضائل اہلِ بیتؑ میں کچھ نہیں ملے گا اور اگر ملے گا بھی تو انتہائی سطحی۔ قرآن کی تفسیریں دیکھیں گے تو انکا بھی کوئی تعلق اہل بیتؑ سے نہیں ہوگا بلکہ سب کی سب انکی اپنی رائے پر مبنی ہوگا۔

کیا آپ کو اب بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں بقول آپ کے ان لوگوں سے سوءِ ظن کیوں رکھتا ہوں؟

نوشتۂ دیوار

یہ عنوان دیکھکر آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ اسے میں نے لفظی معنوں میں استعمال کیا ہے۔سوال کی نوعیت دیکھکر آپ خود محسوس کریں گے کہ اسکے جواب کا مناسب ترین عنوان یہی ہوسکتا تھا۔ایک صاحب نے مندرجہ ذیل سوال مجھے بھیجا:۔

''اللہ کے فضل سے میرا یہ پختہ نظریہ ہے کہ ہرکس وناکس کی تقلید نہیں کی جاسکتی بلکہ تقلید صرف ائمہ کی ہوتی ہے۔لیکن میں نے ایک امام بارگاہ کی دیوار پر یہ حدیث لکھی دیکھی کہ امام حسن عسکریؑ نے فرمایا ہے کہ پاکباز اور نیک سیرت مجتہدین کی تقلید کرنا عوام پر واجب ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اسکی وضاحت فرمائیں تاکہ میرے یقین میں اضافہ ہو''۔

میرے اس کرم فرمانے شاید ''کشف الحقائق'' کا مطالعہ نہیں فرمایا اس لئے پہلا مشورہ تو ان کے لئے یہی ہوگا کہ وہ پہلی فرصت میں اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں تاکہ انکے تمام شکوک وشبہات دور ہوجائیں۔وہاں اس حدیث پر بھی ہم نے سیر حاصل گفتگو کی ہے لیکن اس مقام پر سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ دیوار پر جو حدیث لکھی گئی ہے وہ اصل حدیث کا انتہائی غلط ترجمہ ہے اور یہی بات لکھنے والوں کی بددیانتی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہونا چاہئے کہ عوام کو کس کس طرح تقلید کے جال میں پھانسا جاتا ہے۔

اصل حدیث کا عربی متن اور اسکا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

''فام من کان من الفقہاء صائناً لنفسہ حافظاً لدینہ مخالفاً علی الھواء مطیعاً لامر مولاہ فللعوام ان یقلدوہ''۔ترجمہ:۔''جو کوئی فقہاء میں سے اپنے ذاتی میلانات سے محفوظ ہو۔اپنے دین کا محافظ ہو۔ اپنی خواہشات کا مخالف ہو اور اپنے مولاؑ کا مطیع وفرماں بردار ہو۔عوام کو اجازت

ہے کہ اسکی تقلید کریں"۔

اس حدیث کا ہم تفصیلی جائزہ لیں گے لیکن پہلی چیز جس پر نگاہ فوراً ٹھہرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کسی بھی مقام پر لفظ "مجتہد" استعمال نہیں ہوا۔ پھر وہ کون سا لفظ ہے جسکا ترجمہ "مجتہد" کیا گیا؟ غالباً "فقہا"؟ سو اس فریب کا پردہ بھی ہم ضرور چاک کریں گے۔

زیر بحث حدیث پر ایک نظر

یہ مسلمات سے ہے کہ بارِ ثبوت ہمیشہ مدعی کی گردن پر ہوتا ہے لہٰذا اس حدیث کو پیش کرنے والوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ پہلے اسکی صحت ثابت کریں۔ کسی بھی حدیث کی صحت جانچنے اور پرکھنے کے لئے دو معیار ہیں۔ ایک معیار تو وہ جو رسولؐ اللہ نے مقرر کیا ہے یعنی حدیث کا مزاج قرآنی کے مطابق ہونا۔ دوسرا معیار وہ جو لوگوں نے خود مقرر کرلیا ہے یعنی علم الرجال حالانکہ ختمی مرتبتؐ نے کسی ایک مقام پر بھی یہ نہیں فرمایا کہ تم لوگ خود ہی ایک فن ایجاد کرلینا اور پھر اسے معیار بنا کر اس پر میری حدیثوں کو پرکھنا۔ ہم چونکہ اطاعتِ معصومؑ کے داعی ہیں اس لئے مزاجِ قرآنی پر اس حدیث کو پرکھنا ہماری ذمہ داری ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان حضرات کے تعلقات محمدؐ و آلِ محمدؐ سے ہمیشہ کشیدہ ہی رہتے ہیں اس لئے یہ تو دوسرے معیار کو ہی صحیح سمجھیں گے۔ ہم فی الحال اس قضیئے کو معرض بحث میں نہیں لائیں گے لیکن اتنا حق تو ہمیں بہرحال حاصل ہے کہ ان سے مطالبہ کریں کہ کم از کم اپنے بنائے ہوئے معیار پر ہی اس حدیث کو پرکھیں اور اسکی صحت ثابت کریں اور اسکے لئے چند سوالات کے جوابات دینا انکی ذمہ داری ہے جسکے بغیر اس حدیث پر توجہ نہیں کی جاسکتی۔

۱۔ یہ روایت کس سے منقول ہے؟ امام جعفر صادقؑ سے یا امام حسن عسکریؑ سے جیسا کہ آپ نے خیال کیا ہے؟ (حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے نہ کہ امام حسن عسکریؑ سے۔ امام حسن عسکریؑ نے فقط اس

حدیث کو بیان فرمایا ہے۔ جن لوگوں کو یہ تک نہ معلوم ہو کہ یہ حدیث کس سے منقول ہے حیرت ہے کہ وہ اس حدیث سے کس طرح استدلال کر سکتے ہیں)۔

۲۔اس کے راوی کون کون ہیں؟ اور کیا علم رجال کی رو سے ان میں سے ہر ایک کی عدالت وثقاہت ثابت ہے؟ ۔(اگر چہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ خود علماءِ اصولیین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے جسے نظریۂ ضرورت کے تحت ''مقبولہ'' کا نام دے دیا گیا ہے یعنی قابلِ قبول اور وہ بھی محض اس لئے کہ چند فقہاء اس حدیث کی بنیاد پر کچھ فتوے جاری کر چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث ''حدیثِ مقبولۂ ابن حنظلہ'' ہی کے نام سے جانی جاتی ہے)۔

جب ہمیں ان دو سوالات کے جواب مل جائیں گے تو پھر اگلا مرحلہ یوں شروع ہوگا:۔

ا۔ان حضرات کے نزدیک حدیث معصومؑ کی کیا حیثیت ہے اس پر ہم نے کشف الحقائق میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ہم ایک بہت بڑے مجتہد علامہ محمد باقر خوانساری کی کتاب ''روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات'' سے ایک عبارت نقل کر رہے ہیں جس میں سید مرتضیٰ کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سید مرتضیٰ تمام مجتہدین کے پیرو مرشد مانے جاتے ہیں۔ علامہ خوانساری فرماتے ہیں۔ ''علم الہدیٰ سید مرتضیٰ صرف مجتہد تھے اور خالص اصول فقہ کے پیرو تھے۔ معصومینؑ کی احادیث سے بہت کم تعلق رکھتے اور ان سے احکام اور مسائل پر دلیل نہ لاتے تھے۔ عموماً ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو علامہ مرتضیٰ کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ البتہ ان کے متعلق یہ خبر مشہور ہوگئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ احادیث تو احاد ہیں۔ نہ ان سے علم صحیح حاصل ہوتا ہے نہ ان پر عمل کا انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کتاب ''اجتہاد و تقلید پر اعتراضات کا تجزیہ'' کے صفحہ ۵۲ پر یہ عبارت درج ہے کہ علامہ ابن ادریس حلی جیسے مجتہد خبر واحد کو قبول نہیں کرتے تھے اور اس پر عمل بھی نہیں کرتے تھے۔

جب ہمیں یہ اجتہادی اصول معلوم ہوگیا کہ خبرِ واحد سے نہ تو علم صحیح حاصل ہوتا ہے اور نہ ان پر عمل کا انحصار کیا جاسکتا ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ کیا مذکورہ حدیث متواتر ہے ؟اور اگر نہیں تو اس خبرِ واحد پر ایک ایسے مسئلے کی بنیاد کیونکر رکھی جاسکتی ہے جس پر نجاتِ اخروی کا دار ومدار ہو ؟

۲۔قرآن مجید نے ان تمام امور کا ذکر بڑے شد ومد سے کیا ہے اور انکا انتہائی تاکید کے ساتھ بار بار اعادہ کیا ہے جن پر آخرت کا انحصار ہے مثلاً ایمان ۔عمل صالح ۔تقویٰ ۔اطاعت خدا و رسولؐ و اولی الامر اور مودت اہل بیتؑ وغیرہ ۔اگر مسئلہ تقلیدِ غیر معصوم اتنا ہی اہم ہوتا یا امورِ آخرت میں اسکا رتّی برابر بھی عمل دخل ہوتا تو یقیناً خدائے عادل اپنی کتاب میں اسکا ذکر ضرور کرتا ۔کیا قرآن میں کسی ایک مقام پر بھی تقلیدِ غیر معصوم کا حکم دیا گیا ہے؟ حکم تو دور کی بات ہے۔ یہ حضرات اگر قرآن میں لفظِ تقلید ہی دکھادیں تب بھی ہم انکے علم وفضل کے قائل ہوجائیں گے ۔

۳۔اللہ کے فضل سے شیعوں کے پاس احادیث کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جو ہزاروں کتابوں میں محفوظ ہے ۔ان ہزاروں کتابوں میں سے چار کتابیں (کتبِ اربعہ) ایسی ہیں جنکو شیعوں کی معتبر ترین کتابیں مانا اور تسلیم کیا جاتا ہے اور متقدمین و متاخرین و معاصرین سب کے سب ان پر متحد و متفق ہیں ۔من لایحضرہ الفقیہ ۔الاستبصار اور التہذیب میں تقلید کا کہیں ذکر نہیں ۔البتہ اصولِ کافی میں ایک باب ضرور ہے جسکا عنوان تقلید ہے ۔اس باب میں کل تین احادیث ہیں اور تینوں سے تقلیدِ غیر معصوم کی شدید ممانعت اور مذمت ثابت ہوتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ احادیث کی تمام کی تمام کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں مگر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی چھوٹی سے چھوٹی کتاب میں بھی کوئی حدیث ایسی ہوتی جس میں تقلیدِ غیر معصوم کا معمولی سا بھی

جواز موجود ہوتا تو یہ حضرات اسے ضرور ضرور دلیل کے طور پر پیش کرتے۔ انکا صرف ایک حدیث پیش کرنا اور وہ بھی ایسی جس میں لفظِ مجتہد سرے سے ہے ہی نہیں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ لاکھوں احادیث میں سے انکو بس یہی ایک حدیث ملی ہے جس میں اتفاق سے لفظِ تقلید موجود ہے۔ ایسی حدیث کو بنیاد بنا کر اپنی آخرت کو داؤ پر لگا دینا کسی احمق کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ حقِ فاطمہؑ غصب کرنے والوں کے پاس بھی جوازِ عمل کے طور پر ایک حدیث موجود تھی۔ اس پر تو اتنا واویلا مچایا جاتا ہے لیکن جہاں اپنا مطلب ہوتا ہے وہاں سب کچھ فراموش کر کے صرف ایک حدیث کو دین کی بنیاد بنانے پر اصرار کیا جاتا ہے اور حدیث بھی ایسی کہ جسکے بارے میں انکو یہ تک نہیں معلوم کہ یہ کس امام سے منقول ہے اور یہ کہ اسکے راویوں میں کوئی کذاب تو شامل نہیں ہے؟۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی اہلِ بیتؑ کا حق غصب ہوگا اسکی بنیاد ایسی ہی حدیث پر رکھی جائے گی۔

۴۔ یہ حدیث چاہے امام جعفر صادقؑ سے منقول ہو یا امام حسن عسکریؑ سے لیکن بہرطور اس حکم پر عمل کرنا ان ائمہؑ کے زمانے کے لوگوں پر بھی اسی طرح واجب تھا جیسا کہ آئندہ آنے والے لوگوں پر کیونکہ حدیث مذکور میں کسی خاص زمانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ مطلق حکم ہے۔ اگر اس حدیث کو دلیلِ تقلیدِ غیر معصوم بنایا جارہا ہے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا ائمہؑ کے زمانے میں اور ائمہؑ کی موجودگی میں بھی لوگ ائمہؑ کو چھوڑ کر غیر معصوم کی تقلید کیا کرتے تھے؟۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص یہ کہہ کر حکمِ شریعت بیان کرتا تھا کہ یہ حکمِ امامؑ ہے جو میں آپ تک پہنچا رہا ہوں تو ایسے شخص کی بات کو تسلیم کر لینا اسکی تقلید ہرگز نہیں ہے۔ تقلید اس صورت میں ہوگی جب کوئی یہ کہہ کر حکم لگائے کہ یہ میرا فتویٰ اور میری ذاتی رائے ہے۔ کیا تاریخ سے اس قسم کی ایک بھی مثال دکھائی جاسکتی ہے؟ اور اگر نہیں دکھائی جاسکتی تو دو صورتوں میں سے ایک صورت یقیناً تسلیم کرنا ہوگی۔ یا تو ائمہؑ کے زمانے کے تمام لوگ اور انکے تمام اصحاب (معاذ اللہ) نافرمان تھے اور ائمہؑ نے بھی انکی

نافرمانی پرسکوت اختیار کر کے (معاذ اللہ) اپنے فرائض میں کوتاہی کی۔اور اگر یہ صورت نا قابلِ قبول ہے اور یقیناً نا قابلِ قبول ہے تو پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس حدیث پر نظرِ ثانی کی جائے اور یہ طے کیا جائے کہ یا تو اس حدیث میں اشکال موجود ہے یا پھر یہ کہ اسکو سمجھنے میں غلطی کی جا رہی ہے۔

اب تک ہم نے خود انہی کے معیار پر اس حدیث کا جائزہ لیا ہے۔اب ہم اس معیار کی طرف توجہ کرتے ہیں جو کہ خود رسولؐ اللہ نے معین فرمایا ہے اور وہ یہ کہ ہر حدیث کو مزاجِ قرآن و معصومؑ پر جانچا جائے۔

۱۔مزاجِ قرآن و معصومؑ پر نظر کرنے سے پہلے ہمیں تقلید کی تعریف ذہن میں رکھنا ہوگی۔اصطلاحی تعریف سے قطعِ نظر سادہ لفظوں میں تقلید کا مطلب ہے ''مجتہد کی بات کو بلا دلیل تسلیم کر لینا''۔اس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو یہ حدیث سراسر مخالفِ قرآن نظر آتی ہے کیونکہ پورے قرآن میں اللہ نے خود بھی دلیلیں دی ہیں اور اپنے مخالفین سے بھی دلیلیں طلب کی ہیں۔قرآن میں کسی ایک مقام پر بھی سوائے معصومؑ کے کسی اور کی بات کو بغیر دلیل تسلیم کر لینے کا حکم موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی حدیث میں کسی غیرِ معصوم کی بات کو بلا دلیل تسلیم کر لینے کی ترغیب دی گئی ہو تو معیارِ قرآن کے مطابق اس حدیث کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

۲۔پورے قرآن میں لفظِ تقلید کہیں بھی استعمال میں نہیں آیا لہٰذا اگر کوئی حدیث کسی ایسی شے کا حکم دے جسکا کوئی تعلق قرآن سے نہ ہو تو اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا۔

۳۔اجتہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مجتہد کو جب کوئی حکم نہ قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیث میں تو وہ ظن و قیاس کی بنیاد پر فتویٰ جاری کرتا ہے۔اس طرح فتوے کا تعلق کسی طور پر بھی علم سے نہیں ہوتا۔تقلید نام ہے مجتہد کے فتوے پر عمل کرنے کا۔یعنی علم کو نظر انداز کر کے ظن و قیاس پر عمل کرنا۔جبکہ قرآن نے اس طرزِ عمل کی

شدت سے مخالفت کی ہے چنانچہ بنی اسرائیل ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''ولا تقف ما لیس لک بہ علم ''ترجمہ''اور جس چیز کا تم علم نہیں رکھتے اسکے پیچھے نہ لگو''۔

اس واضح ممانعت کے باوجود اگر کسی حدیث میں ظن وقیاس کی پیروی کا حکم دیا جا رہا ہوتو ایسی حدیث قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

۴۔تقلید کرنے والے کو آنکھ بند کر کے مجتہد کی بات ماننا ہوتی ہے۔یہ نظام سوچ سمجھ سے کام لینے یا عقل کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا اسی لئے اپنے مقلدین کو جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے۔مجتہد سے دلیل یا حوالہ مانگنا بھی اسی لئے ممنوع ہے کہ دلیل یا حوالہ انسان اسی صورت میں طلب کرتا ہے جب وہ عقل سے کام لے لیکن جب ہم قرآن پر نظر کرتے ہیں تو وہاں عقل ہی عقل نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر دو آیات پیش کی جارہی ہیں:۔

ا۔انفال ۲۲۔''بیشک اللہ کے نزدیک زمین پر حرکت کرنے والی مخلوقات میں سے بدترین لوگ وہ گونگے اور بہرے ہیں جو اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتے''۔

ب۔یونس ۱۰۰۔''اور جو لوگ اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتے ان پر اللہ نجاست طاری کر دیتا ہے''۔

ان واضح نصوصِ قرآنی کی موجودگی میں ایسی کسی بھی حدیث کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی جو استعمالِ عقل سے روکتی ہو۔

ہم نے دونوں معیارات کے مطابق اس حدیث کی حیثیت واضح کر دی لیکن ہم یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے حدیث کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس مفہوم کا انکار کیا ہے جو یہ حضرات اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔یعنی یہ کہ اگر اس حدیث کو دلیلِ تقلیدِ غیر معصوم سمجھا جائے تو یہ اجتہادی اور قرآنی دونوں معیارات پر پوری نہیں اترتی البتہ اپنے حقیقی مفہوم کے

اعتبار سے یہ حدیث اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہے۔

زیرِ نظر حدیث کا حقیقی مفہوم

اس حدیث کا حقیقی مفہوم جاننے کے لئے ہمیں اسکے صرف دو الفاظ پر غور کرنا ہوگا۔ایک تو لفظِ ''فقہاء'' اور دوسرے ''تقلید''۔ پہلے ہم لفظ فقہاء پر نظر کرتے ہیں۔فقہا۔تفقہ۔ان الفاظ کے معنی بہ اعتبارِ لغت ''اچھی طرح سمجھنا'' ہے۔اس طرح فقیہ کے معنی ہوئے ''گہری سمجھ رکھنے والا'' اور فقہا اسکی جمع ہے۔ہم پوری قوت سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن و احادیث میں یہ الفاظ ہر مقام پر انہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کا ایک جداگانہ معنی میں استعمال کب اور کیسے شروع ہوا۔

ہر صاحب خبر یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اجتہاد کی داغ بیل ڈالنے والے ابو حنیفہ۔ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی تھے۔اجتہاد کے معنی ''انتہائی کوشش'' کے ہیں لیکن ان حضرات کی مساعیٔ حسنہ کی وجہ سے اب یہ صرف ایک لفظ نہ رہا بلکہ ایک مکتبِ خیال اور ایک فن بن گیا اور آپ جانتے ہیں کہ ہر فن کی چند اصطلاحات ہوا کرتی ہیں۔ماہرینِ فن لغت سے چند الفاظ اٹھاتے ہیں اور انھیں اپنے فن کے اعتبار سے چند مفاہیم کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔اسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کے لغوی معنی ساقط ہو گئے بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ الفاظ جب اس فن کے حوالے سے بولے یا استعمال کئے جائیں گے تو ان سے وہی مفہوم مراد لیا جائے گا جو اہلِ فن نے متعین کئے ہیں۔فنِ اجتہاد کے جن بانیان کا ہم نے ذکر کیا انکے لئے بھی اپنے ایجاد کردہ فن کے لئے چند اصطلاحات وضع کرنا ناگزیر تھا لہٰذا بہت سے الفاظ جنکے لغوی معنی کچھ اور تھے جب بطورِ اصطلاح اس فن میں داخل کیے گئے تو انکا مفہوم یکسر تبدیل کر دیا گیا۔انہی بدنصیب الفاظ میں لفظِ فقہ بھی شامل ہے اور اب اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم ہوگیا ''احکامِ شرعیہ کے ظنیات اور قیاسات''۔یہاں لفظِ ''علم'' ہم نے عمداً

استعمال نہیں کیا کیونکہ مکتبِ اجتہاد علمِ قطعی سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ اس نے ظن اور قیاس کا نام علم رکھا ہے۔اور اسی اعتبار سے یہ لوگ مجتہدین کو علماء کہتے ہیں حالانکہ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ عالم اور مجتہد دو متضاد چیزیں ہیں۔اسی طرح ماہرِ فقہ یعنی مجتہد کو فقیہ کہا جانے لگا اور یہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ تھا کہ مذکورہ حدیث میں بھی لفظِ فقہاء سے مراد مجتہدین لئے گئے حالانکہ ایک معمولی عقل بھی بہ آسانی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ جو اصطلاحات مکتب اجتہاد کے بانیوں نے بقلم خود وضع کی تھیں انکا اللہ و رسولؐ اور ائمۂ معصومؑ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔اس بات کو آپ ایک اور مثال کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔بحارالانوار (اردو) ج ۱۱ صفحہ ۱۸۶ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''کیا میں تمھیں وہ بات بتا دوں جسکے بغیر اللہ بزرگ و برتر کسی بندے کا عمل قبول نہ کرے گا؟'' راوی نے عرض کیا۔فرزندِ رسولؐ ارشاد فرمائیں۔آپؑ نے فرمایا ''اس امر کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ کہ محمدؐ اسکے بندے اور اسکے رسول ہیں نیز جو احکام اللہ نے دیے ہیں انکا اقرار اور ہماری ولایت و دوستی اور ہمارے دشمنوں سے براءت و بیزاری رکھنا یعنی مخصوص ائمہؑ کی ولایت اور انکی امامت کو تسلیم کرنا پھر ورع و تقویٰ اور اجتہاد اور طمانیت قلب اور امام قائمؑ کا انتظار''۔

کیا کوئی احمق سے احمق انسان بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ امام نے لفظ اجتہاد انہی معنوں میں استعمال فرمایا ہے جو ابو حنیفہ نے ایجاد کیے تھے؟ اور اگر کوئی عقل کا دشمن ایسا سمجھتا ہے تو پھر اسی کے مکتبِ فکر کے مطابق مقلد کا تو وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور ہر شخص پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ حوزۂ علمیہ جا کر اجتہاد کی ڈگری لائے تا کہ اسکے اعمال قبول ہو سکیں۔لیکن ان بے تاج بادشاہوں نے یہ طے کر لیا کہ اللہ و رسول بھی انکی وضع کردہ اصطلاحات کے پابند ہو گئے اور اب ان پر (معاذ اللہ) لازم ہو گیا کہ وہ جب بھی ان الفاظ کو استعمال کریں تو انہی معنوں میں کریں جو ابو حنیفہ نے متعین کر دئے ہیں۔

ہر وہ شخص جو ذرا بھی عقل و شعور رکھتا ہے اس بات میں شک نہیں کرے گا کہ دشمنان اہل بیت نے جن الفاظ کو اپنے مفاد کی خاطر اصطلاحی مفاہیم پہنا دیئے ہیں حضرات معصومینؑ کسی بھی صورت میں ان الفاظ کو ان دشمنان خدا کے دیے ہوئے مفہوم میں استعمال نہیں کر سکتے اور نہ کبھی انہوں نے ایسا کیا ہے بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے تو فوراً لفظ فقہاء کی وضاحت فرمائی تا کہ آنے والی نسلیں اس لفظ سے دھوکا نہ کھائیں۔ابو حنیفہ اور امام جعفر صادقؑ کا زمانہ ایک ہی تھا اور اسی زمانے میں یہ اصطلاح گھڑی گئی تھی لہٰذا امام معصومؑ نے اس طرح وضاحت فرمائی:۔

ا۔ہم ہرگز ان فقہاء کو فقیہ کا درجہ نہیں دیتے جو محدث نہ ہوں (ولایت فقیہ)۔

۲۔آدمی دو باتوں سے فقیہ ہوتا ہے۔جس نے ہوا و حرص کو چھوڑ دیا ہو۔اسے یہ پتا نہ ہو کہ اس نے کونسا کپڑا پہن رکھا ہے اور کیا کھایا ہوا ہے۔(الخصال۔باب خصلت ہائے دوگانہ۔حدیث۲۲)

۳۔امام محمد باقرؑ سے کسی نے ایک سوال کیا۔آپؑ نے اسکا جواب دیا۔اس نے کہا ''فقہاء'' تو ایسا نہیں کہتے۔فرمایا وائے ہو تجھ پر۔تو نے کبھی فقیہ کو دیکھا ہے؟اصل فقیہ وہ ہے جو تارک الدنیا ہو۔آخرت کی طرف راغب ہو اور سنت نبیؐ سے تمسک رکھنے والا ہو۔(اصول کافی۔کتاب عقل۔باب۲۳حدیث ۸)

یہی حال تقلید غیر معصوم کا ہے۔یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ معصومؑ اس چیز کا حکم دے سکتے ہیں جسکی حرمت قرآن سے بھی ثابت ہے اور احادیث سے بھی۔لفظ تقلید عام بول چال میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً یہ جملہ:۔

''ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے کردار سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال قائم کریں''

کیا یہ جملہ غلط ہے؟اور اگر صحیح ہے تو کیا یہ ابو حنیفہ کی وضع کردہ اصطلاح کے مفہوم میں بولا گیا ہے؟اگر اصل بات آپ تک پہنچ گئی ہے تو اب میں زیر بحث حدیث کا

ممکنہ مفہوم لکھتا ہوں اور یہ واحد مفہوم ہے جو خدا و رسولؐ و ائمہ معصومینؑ اور صاحبان ایمان کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے:۔

''جو شخص فہم دین رکھتا ہو احادیث معصومینؑ بیان کرتا ہو۔ سنت نبیؐ سے متمسک رہتا ہو (ظن وقیاس کا پرچار نہ کرتا ہو)۔ دنیا کی لذتیں اسے فریب نہ دیتی ہوں اور آخرت ہمیشہ اسکے پیش نظر رہتی ہو۔ لباس اور خوراک کا شیدائی نہ ہو۔ اپنے نفس کا قیدی نہ ہو۔ خواہشات نفسانی کا مخالف ہو۔ دنیا کا لالچی نہ ہو بلکہ ہر حال میں اپنے دین کی حفاظت کرنے والا ہو (زرق برق لباس نہ پہنتا ہو۔ مال امامؑ نہ کھاتا ہو۔ حکومت واقتدار کے جوڑتوڑ میں مشغول نہ رہتا ہو) اپنے مولاؑ کا مطیع و فرماں بردار ہو (نہ کہ انکے متوازی اپنی قیادت قائم کررکھی ہو۔ انکے احکام کے بجائے اپنی رائے اور قیاس پر عمل کرتا اور کراتا ہو) تو عوام کو چاہئے کہ ایسے شخص کو اپنے لئے نمونہ عمل بنائیں اور اس جیسا بننے کی کوشش کریں''۔

فطرت انسانی یہ ہے کہ اگر اسے نصیحت کی جائے تو اسکا اثر تھوڑی ہی دیر تک قائم رہتا ہے لیکن اگر کوئی نمونہ عمل (MODEL) اسکے سامنے ہو تو رفتہ رفتہ نصیحت کا اثر اسکی رگ و پے میں دوڑنے لگتا ہے اور اسکے ذہن میں جم جاتا ہے اور اسکے اعصاب پر طاری ہو جاتا ہے لہٰذا اگر خوش قسمتی سے کوئی ایسا شخص میسر آجائے جو نصیحت کا عملی نمونہ ہو اور ہمارے لئے ایک موڈل بن سکے تو ہماری اصلاح آسانی سے ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ ہم خود ایک نمونہ عمل کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ لیکن یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ امامؑ نے جن صفات کا ذکر کیا ہے اسکا حامل انسان کبھی دوکان کھول کر نہیں بیٹھتا نہ وہ آپکو مقامات شہرت پر نظر آئے گا بلکہ آپ کو اسے تلاش کرنا پڑے گا اور اگر کسی کو ایسا آدمی مل جائے تو اسے اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے۔ یہ سنہرا اصول یاد رکھئے کہ دین وایمان دوکانوں پر نہیں بکتے بلکہ بے لوث بوریا نشینوں کے پاس ملتے ہیں لہٰذا <u>جس شخص کو بھی آپ دیکھیں کہ وہ دوکان سجائے بیٹھا ہے اور طرح طرح کی ترغیبیں دیکر آپ کو اپنا</u>

گاہک بننے کی دعوت دے رہا ہے تو فوراً اپنا دین وایمان سمیٹ کر وہاں سے ہٹ جائیے اور اللہ کی پناہ میں آجائیے۔

بہت اہم

جو کچھ عرض کیا گیا وہ اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن معاملے کو بالکل واضح کرنے کے لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ اس حدیث کا وجوبِ تقلید یا بذاتِ خود تقلید سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ وجوبِ تقلید تو پہلے ہی مرحلے میں رد ہو جاتا ہے کیونکہ امام نے لفظ ''للعوام'' استعمال فرمایا ہے اور ''لِل'' کا مطلب ''اجازت'' ہے نہ کہ وجوب۔ ہاں اگر آپؑ ''علی العوام'' فرماتے تو وجوب کی بات کی جاسکتی تھی۔ لہٰذا اس حدیث کی آڑ میں وجوبِ تقلید کی بات کرنا پہلے ہی مرحلے میں ایک دھوکا اور فریب ثابت ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس حدیث سے تقلید ثابت ہوتی ہے یا نہیں تو اصل حقیقت یہ ہے کہ مجتہدین و مقلدین کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ آدھی اور نامکمل حدیث پیش کرتے ہیں تا کہ ناواقف لوگوں کو دھوکا دیا جاسکے۔ جب آپ مذکورہ حدیث کا مکمل متن پڑھیں گے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ اس حدیث کا تقلید سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ یہ شیعوں کے باہمی جھگڑوں کو نمٹانے کے بارے میں ہے مثلاً زمین جائیداد اور وراثت کے جھگڑے۔ اسطرح اس حدیث کا تعلق ''قضاء'' سے ہے نہ کہ تقلید سے۔ اب ہم اس حدیث کو اسکی ابتدا سے نقل کرتے ہیں جو احتجاج طبرسی جلد دوم سے اخذ کی گئی ہے:۔

''راوی نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ اگر دو شیعوں میں قرضے اور وراثت کے بارے میں تنازعہ پیدا ہو جائے تو کیا انکو اجازت ہے کہ وہ ان تنازعات کا فیصلہ لینے کے لئے بادشاہ یا اسکے مقرر کردہ قاضی کے پاس جاسکتے ہیں؟۔ امامؑ نے فرمایا کہ کسی بھی صحیح یا غلط معاملے کے فیصلے کے لئے ان لوگوں کے پاس جانا

ایسا ہی ہے جیسے شیطان رجیم سے فیصلہ لینا۔ انکے فیصلوں کے ذریعے کوئی بھی شے حاصل کرنا نجاست کھانے کے مترادف ہوگا چاہے وہ فیصلہ صحیح بھی ثابت ہو جائے۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ فیصلہ شیطان سے حاصل کیا گیا ہے جبکہ اللہ نے شیطان کو رد کرنے کا حکم دیا ہے"۔

اسکے بعد حدیث کا وہ ٹکڑا ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔

"راوی نے پوچھا کہ ایسی صورت میں انھیں کیا کرنا چاہئے؟۔ امام نے جواب دیا کہ انکو اپنی جماعت میں سے کسی ایسے کو تلاش کرنا چاہئے جو ہماری احادیث کو روایت کرتا ہو اور ہماری تعلیم کے مطابق حلال وحرام کی پہچان رکھتا ہو اور جس نے ہمارے قوانین کو یاد کر رکھا ہو تو انکو ایسے شخص کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہئے کیونکہ ایسے شخص کو میں نے تم پر حاکم مقرر کیا ہے۔ اگر یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہمارے احکام کے مطابق فیصلہ کر رہا ہے اسکے فیصلے کو تسلیم نہ کیا تو گویا انھوں نے ہمیں رد کیا اور ہمیں رد کرنے کا مطلب اللہ کو رد کرنا ہے اور یہ کفر ہے"۔

اسکے بعد راوی نے مختلف سوالات کئے جنکا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دونوں فریق ایک ایک آدمی کا انتخاب کرلیں جن میں مندرجہ بالا شرائط پائی جاتی ہوں اور انھیں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکتی ہو اور وہ دونوں مختلف احادیث بیان کریں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟۔ امام ایک ایک سوال کا جواب دیتے رہے اور آخر میں فرمایا "جو ایسی حدیث بیان کر رہا ہو جو عامہ (غیر شیعہ) کے خلاف ہو اسے تسلیم کیا جائے اور جو عامہ کے مطابق ہو اسے رد کر دیا جائے"۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ جس حدیث کا تقلید سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں اسی حدیث کے ایک ٹکڑے کو بنیاد بنا کر وجوبِ تقلید کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ بدترین خیانت ہے لیکن اصل لطف تو حدیث کے اگلے ٹکڑے میں ہے جسے یہ لوگ کبھی ظاہر نہیں کرتے لیکن ہم یہ پردہ اٹھائے دیتے ہیں تاکہ آپ حدیث کا پورا مفہوم سمجھ لیں اور آئندہ کبھی انکی چال بازیوں میں نہ آئیں۔

بات کو مکمل کرتے ہوئے امامؑ فرماتے ہیں :۔

''علماء میں ایک ٹولہ ایسا بھی ہے جو ہمارے دوستوں اور موالیوں سے بغض وعناد رکھتا ہے ۔ یہ ٹولہ اس پر تو قادر نہیں کہ کھلم کھلا ہمارا نام لیکر ہماری قدح کرے اور ہماری برائی بیان کر سکے ۔ یہ ٹولہ ہمارے کچھ علوم پڑھ لیتا ہے اور انہی علوم کی وجہ سے ہمارے شیعوں اور موالیوں کے نزدیک قابلِ توجہ بن جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ہمارے کم علم سادہ لوح شیعہ اس ٹولے کی عزت کرنے لگے ہیں تو پھر یہ ٹولہ ہماری ذواتِ مقدسہ میں عیب ونقص دکھاتا ہے اور ہمارے دوستوں کے دشمنوں کے سامنے ہمارے عیوب بیان کرتا ہے اور پھر اپنے قیاس سے ان جھوٹے نقائص اور عیوب کو بڑھا کر بیان کرتا ہے حالانکہ ہم ان نقائص وعیوب سے مبرا ہیں ۔ ہمارے سادہ لوح کم علم شیعہ یہ سمجھ کر کہ یہ ٹولہ ہمارے علوم بیان کرتا ہے انکی باتوں میں پھنس جاتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں اور یہ ٹولہ ان بے چاروں کو گمراہ کر لیتا ہے ۔ یہ ٹولہ ہمارے کم علم سادہ لوح شیعوں کے لئے لشکرِ یزید سے بھی زیادہ ضرر رساں ہے جس نے حسینؑ اور انکے اصحابؑ پر ظلم کیا تھا کیونکہ یہ ٹولہ سادہ لوح کم علم شیعوں کی روحِ ایمان بھی سلب کر لیتا ہے اور انکا مال بھی لوٹ کھسوٹ لیتا ہے ۔ یہی ٹولہ علماءِ سوء ہے ۔ یہی ٹولہ ہمارے موالیوں سے بغض وعناد رکھتا ہے اور انھیں اپنے دام میں پھنسانے کیلئے یہ کہتا ہے کہ ہم تو اہلبیتؑ سے محبت رکھتے ہیں اور انکے دشمنوں سے عداوت رکھتے ہیں ۔ یہی ٹولہ بھیس بدل کر (یعنی ہمارا دوست بنکر) کم علم شیعوں کے دلوں میں شک وشبہ داخل کر دیتا ہے کہ جسکے بعد وہ بے چارے پیچ وتاب میں پھنس کر ہماری عظمتِ شان پر ایمان ویقین سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہی ٹولہ انھیں گمراہ کر لیتا ہے اور حقِ صریح وخالص سے ان بیچاروں کو روک دیتا ہے''۔

آپ یقیناً اس حقیقت تک پہنچ گئے ہونگے کہ اس حدیث سے تقلید کا کوئی ایک گوشہ بھی ثابت نہیں ہوتا البتہ کچھ لوگوں کے چہروں سے نقاب ضرور

ہٹ جاتی ہے۔یہ کون لوگ ہیں یہ پہچاننا خود آپکا کام ہے۔

نصرتِ مظلوم

اس سوال کا تعلق رسومِ عزاداری سے ہے اور مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ رسومِ عزاداری شریعت کے دائرۂ کار میں آتی ہیں یا نہیں؟ اور کیا ان سے متعلق کسی کو فتویٰ جاری کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ اور اسی سلسلے میں زنجیر اور قمہ کے ماتم کے بارے میں جاری کردہ فتوے کے بارے میں پوچھا گیا ہے کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتبار ہے؟۔

میری آرزو تھی کہ عزاداری کے بارے میں ایک مبسوط کتاب لکھوں لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر آج تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ بہر حال ہر شے کا دارو مدار نیت پر ہوتا ہے اور اللہ میری نیت سے واقف ہے اور جب اسکی مشیت ہوگی تو وہ ضرور مجھ سے یہ کام لے لے گا۔ لیکن اس سوال نے میرے لئے بند راستے کو کھولا اور مجھے ایک جزوی موقعہ ملا کہ میں اس موضوع پر مختصراً حقیقتِ حال بیان کرسکوں۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ایک ہی حال پر نہیں رہتا۔ دنیا میں وہ دو قسم کی حالتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ حالتِ اختیار اور حالتِ اضطرار اور شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ انسان کو حالتِ اختیار میں پابند بناتی ہے اور حالتِ اضطرار میں آزاد چھوڑتی ہے۔ مثلاً حالتِ اختیار میں انسان پر ہزاروں پابندیاں ہوتی ہیں کہ فلاں چیز کھاؤ اور فلاں چیز نہ کھاؤ اور اسی لئے انسان کو قدم قدم پر احتیاط کرنا پڑتی ہے اور بہت سی لذتوں سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ لیکن حالتِ اضطرار میں یہ پابندیاں ساقط ہوجاتی ہیں اور اگر ہلاکت کا اندیشہ ہو تو انسان کو آزادی دے دی جاتی ہے کہ جو چاہے کھائے خواہ مرا ہوا کتا ہی کیوں نہ کھانا پڑے یہاں تک کہ اندیشۂ ہلاکت برطرف ہوجائے۔ حالتِ

اختیار میں انسان کے لئے لازم ہے کہ وقتِ نماز اسکا رخ کعبے کی طرف ہو اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن حالتِ اضطرار میں جب کہ سمتِ کعبہ کا تعین کرنا انسان کے بس میں نہ ہو تو ایسی صورت کے لئے امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''مضطر کے لئے تا ابد جائز ہے کہ جدھر چاہے رخ کر کے نماز پڑھے'' (من لایحضرہ الفقیہ)۔ لہذا شریعت کا اطلاق صرف انہی امور پر ہوتا ہے جن کا تعلق حالتِ اختیار سے ہو۔ مثال کے طور پر نیند کا تعلق حالتِ اضطرار سے ہے لہذا نیند کی حالت میں انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ شریعت کے دائرۂ کار سے باہر ہوتے ہیں اور اسی لئے شریعت ان پر کوئی حکم نہیں لگاتی نہ ہی شریعت یہ پابندی لگا سکتی ہے کہ سوتے میں انسان فلاں قسم کا خواب دیکھے اور فلاں قسم کا خواب نہ دیکھے جبکہ خواب میں انسان ہر قسم کے افعال یہاں تک کہ محرمات کا بھی مرتکب ہوتا ہے اور ان میں سے کچھ افعال ایسے بھی ہوتے ہیں جنکا اثر وہ جاگنے کے بعد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اسکے باوجود اس پر کسی حکمِ شرعی کا اطلاق نہیں ہوتا صرف اس لئے کہ وہ اس وقت حالتِ اضطرار میں ہوتا ہے۔ اسی طرح جاننا چاہیئے کہ ماتم دار بھی حالتِ اضطرار ہی میں ہوتا ہے اور اسے شریعت کی عینک سے نہیں بلکہ محبت کی عینک سے دیکھا جائے گا لہذا مفتیانِ دین متین کا بھی فرضِ منصبی ہے کہ وہ خود کو صرف اختیاری افعال تک محدود رکھیں۔ اضطراری افعال میں دخل اندازی کرنے سے انھیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا سوائے اسکے کہ انکی اپنی حیثیت متنازعہ بن جائے گی۔

بات کی مزید وضاحت کے لئے عرض کرتا ہوں کہ کسی بھی کام کے پیچھے دو محرکات ہوتے ہیں۔ ایک تقاضا اور دوسرے اثر۔ اور نقد و نظر تقاضے پر کیا جاتا ہے نہ کہ اثر پر۔ اس لئے گفتگو اس بات پر تو ہو سکتی ہے کہ غمِ حسینؑ منانا چاہیئے یا نہیں؟ لیکن اس بات پر کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا کہ کتنا غم منایا جائے نہ ہی اس پر بحث و تحیث کا دروازہ کھولنے کا کوئی جواز موجود ہے۔ اگر کسی گھر میں موت

ہو جائے تو گھر میں آہ و بکا کی آواز سن کر راہگیروں پر بھی غم کا ایک اثر ہوگا۔ لیکن محلے داروں پر یہ اثر زیادہ شدید ہوگا جس پر راہگیروں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مرنے والے کے دوستوں پر یہ اثر اور بھی زیادہ شدید ہوگا جس پر محلے داروں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ مرنے والے کے گھر والوں اور بہن بھائیوں پر اور بھی گہرا اثر ہوگا جس پر مرنے والے کے دوستوں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ماں باپ پر یہ اثر اپنے عروج پر ہوگا خاص طور پر ماں کی حالت نا قابل بیان ہوگی لیکن باقی لوگوں کو ماں باپ کے ان اضطراری افعال پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہوسکتا۔ غم حسینؑ مظلوم کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یا تو یہ فیصلہ کرلو کہ غم حسینؑ منانا ہی غلط ہے لیکن جب یہ طے ہوجائے کہ یہ غم منانا ہی مشیت ایزدی ہے تو پھر اگر کوئی اس بات پر معترض ہوتا ہے کہ "غم اس طرح منانا چاہئے۔ اس طرح نہیں منانا چاہئے" تو اسکا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ شخص اگر چہ زبان سے ظاہر نہیں کرسکتا لیکن حقیقتاً اسکا دل غم حسینؑ سے کراہت رکھتا ہے اور وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ کسی طرح عزاداریٔ حسینؑ کو بھی عام تعزیتی اجلاسوں اور سیمیناروں کی صورت تک محدود کردیا جائے۔

محبت

غم حسینؑ نہ کوئی معاشرتی مسئلہ ہے نہ سیاسی مسئلہ ہے اور نہ اجتماعی مسئلہ۔ یہ خالصتاً انفرادی مسئلہ ہے جسکی بنیاد محبت ہے۔ شہادت حسینؑ اور مصائب اہل بیتؑ کا اثر ہر دل پر اسی قدر ہوگا جس قدر اس دل کو حسینؑ سے محبت ہوگی اور آج تک دنیا میں محبت کو ناپنے کا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا جاسکا۔ محبت ایک قلبی کیفیت ہے اور قلبی کیفیات پر کسی بھی قانون اور شریعت کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور نہ محبت کے لئے کوئی پیمانہ اور حد مقرر کی جاسکتی ہے۔ جتنی محبت ہوگی اتنا ہی اسکا اظہار ہوگا لہٰذا طریقۂ اظہار پر قدغن لگانے کا مطلب یہ ہوگا کہ محبت کے لئے حدود

معین کردی جائیں جو محالاتِ عقلیہ سے ہے۔ مجالسِ حسینؑ میں ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے روتا ہے۔ کوئی چپکے چپکے روتا ہے۔ کوئی آواز سے روتا ہے تو کوئی داڑھیں مار کر روتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس بارے میں فتویٰ صادر کر سکے اور رونے کا کوئی خاص طریقہ تجویز کر سکے۔ یہ بات بدیہی ہے کہ شریعت محدود ہے اور محبت لامحدود اس لئے عقلِ سلیم یہی فیصلہ دے گی کہ لامحدود پر محدود کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ شریعت کے سجادہ نشینوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ دین ہو یا شریعت۔ ان دونوں کی بنیاد اور شرطِ لازمی محبت ہے جسکے بغیر دین و شریعت پر عمل پیرا ہونا حرام ہے۔ آیۂ مودت شاہد ہے کہ محبت محتاج دین و شریعت نہیں ہے بلکہ دین و شریعت محتاج محبت ہیں۔ یعنی قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اہل بیتؑ سے صرف وہی محبت کر سکتا ہے جو پابند دین و شریعت ہو بلکہ یہ کہا کہ دین و شریعت پر عمل کرنے کا حق صرف اسے ہی پہنچتا ہے جو اہل بیتؑ سے محبت رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ نجات کے لئے ایمان شرطِ لازمی ہے لیکن محبت اپنے اندر ایسی شدید قوت و کشش رکھتی ہے کہ بعض اوقات شرطِ ایمان بھی ساقط ہو جاتی ہے جیسا کہ کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۶۲ پر درج ہے کہ جناب امیر المومنینؑ سے دریافت کیا گیا کہ کیا سارے کافر جہنم میں جائیں گے؟ آپؑ نے فرمایا "جہنم میں کافر کے سوا کوئی نہ جائے گا مگر جسکو اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ جہنم میں داخل نہ ہوگا"۔ اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ وہ کون سے کافر ہونگے جو کافر ہوتے ہوئے بھی جہنم میں نہیں جائیں گے حالانکہ جہنم بنا ہی کافروں کے لئے ہے اور یہ کہ ایسے کافروں سے شرطِ ایمان کیونکر ساقط ہو جائے گی؟
جو عزادارانِ حسینؑ ہیں انکے لئے اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

محبت کے بارے میں یہاں تین احادیث نقل کی جا رہی ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ ایک اور سوال کے ضمن میں بیان کی جائے گی:۔

۱۔ نہج الاسرار ج ۲ صفحہ ۳۴۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ "خداوندتعالیٰ نے زمین کی

طرف توجہ کی اور ہمیں برگزیدہ کیا اور ہماری وجہ سے ہمارے شیعوں کو برگزیدہ کیا تا کہ ہماری نصرت کریں۔ ہماری خوشی میں خوش ہوں۔ ہمارے غم میں غمناک ہوں اور اپنے مال اور اپنی جانوں کو ہم پر قربان کریں۔وہ ہم سے ہیں اور ہم سے ملحق ہونگے"۔

۲۔بحارالانوار (اردو) ج ا صفحہ ۱۲۱۔امام رضاؑ نے ریان ابن شبیب سے فرمایا۔

"اے پسرِ شبیب اگر تو چاہے کہ درجات عالیہ بہشت میں ہمارے ساتھ ہو تو ہمارے غم میں غم کر اور خوشی میں خوشی۔ تجھے لازم ہے کہ ہماری محبت و دوستی پر مضبوط اور ثابت قدم رہ۔ اگر کوئی شخص پتھر کو دوست رکھے گا تو خدا اسکو فردائے قیامت میں اسی پتھر کے ساتھ محشور فرمائے گا"۔

۳۔اصول کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۲۲۶۔حدیث ۱۶۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "جو سانس نکالتا ہے ہمارے متعلق فکر کرنے میں ظہورِ قائم آلِ محمدؐ کے متعلق اور غمناک ہوتا ہے ہماری مظلومیت پر تو اسکا یہ عمل بہ منزلۂ تسبیح ہے اور ہمارے معاملے میں رنجیدہ ہونا عبادت ہے اور ہمارے راز کو چھپانا جہاد فی سبیل اللہ ہے"۔

ان احادیث میں محبت کی سات علامات بتائی گئی ہیں:۔

۱۔محبوب کی خوشی میں خوش ہونا۔

۲۔اسکے غم میں غمناک ہونا۔

۳۔اسکی نصرت کرنا۔

۴۔اپنے مال اور جان کو اس پر قربان کرنا۔

۵۔اسکے بارے میں تفکر وتدبر کرنا۔

۶۔اسکے راز کو چھپانا۔

۷۔مندرجہ بالا امور پر ثابت قدم رہنا۔

ان علامات میں کہیں بھی مقدار معین نہیں کی گئی۔ ہر شخص کے خوش ہونے اور

غمناک ہونے کا انداز جدا جدا ہے ۔اہلِ بیت کے حصے میں خوشیاں بہت کم آئی ہیں جبکہ انکی پوری زندگیاں مصائب جھیلتے گذری ہیں ۔اس لئے خوشی کے موقعے پر بھی جب انکے مصائب یاد آتے ہیں تو آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں ۔ یہ بھی خوش ہونے کا ایک انداز ہے ۔غمناک ہونے کی بھی بہت سی صورتیں ہیں جو سب محبت کی تابع ہیں ۔ جیسے جیسے غم کی شدت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے محبّ کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں اور ہر کیفیت اسکی محبت کا ہی اثر ہوتی ہے ۔اس طرح اسکی کسی بھی کیفیت پر اعتراض کرنا دراصل اسکی محبت پر اعتراض کرنا ہے ۔

سوال کا تیسرا حصہ ایک فتوے سے متعلق ہے جو زنجیر زنی اور قمہ زنی کے خلاف صادر کیا گیا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ وہ فتویٰ سن لیں اسکے بعد ہم اسکا تفصیلی تجزیہ کریں گے ۔ یہ فتویٰ ایران کے سپریم لیڈر جناب خامنہ ای صاحب نے جاری فرمایا ہے جسکا متن حسبِ ذیل ہے :۔

’’قمہ لگانا بھی ان کاموں میں سے ہے جو غلط ہیں ۔ یہ ایک غلط کام ہے کہ بعض لوگ قمہ ہاتھ میں لیں ۔ اپنے سر پر ماریں اور اپنا خون بہائیں ۔اس کام کا کیا مطلب ہے ؟ یہ کام کس زاویے سے عزاداری ہے ؟ یہ کام جعلی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جسکا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ بلاشک ان کاموں سے خدا راضی نہیں ہے ۔ ہمیں ایسے کام نہیں کرنا چاہئیں جنکی وجہ سے بلند و برتر اسلامی معاشرہ یعنی محبین اہلِ بیتؑ کا معاشرہ جسکا افتخار حضرت ولیِ عصرؑ ارواحنا فداہ حسینؑ ابنِ علیؑ اور امیر المومنین علیؑ کے نام مبارک ہیں ۔وہ دنیا کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نظر میں خرافات کا حامل اور بے منطق و شعور معاشرہ قرار پائے ۔ ایسے کام نہ کیجیے ۔ میں دل سے ان کاموں سے راضی نہیں ہوں ۔اگر کوئی سرِ عام قمہ زنی کرے تو میں قلباً اس سے ناراض ہوں‘‘ ۔فتوے کے آخر میں فرماتے ہیں ۔

’’مجھے نہیں معلوم کہ اس کام کی بنیاد کیا ہے اور کونسے ہاتھ ان کاموں کو ہمارے اسلامی اور انقلابی معاشروں میں رائج کر رہے ہیں‘‘ ۔(فلسفۂ عزاداری صفحہ ۱۸ تا

۲۰)۔

کسی بھی قسم کا تبصرہ کرنے سے پہلے ہم پوری قوت سے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عزاداریٔ حسینؑ نہ کسی کے فتوے کے تحت جاری ہوئی ہے اور نہ کسی کے فتوے کی محتاج ہے۔ اسکی ترویج اور بقاء کی ذمہ داری خود اللہ نے لی ہے اور وہی اسکی حفاظت کرنے والا ہے۔

اس فتوے میں مفتی موصوف نے قمہ زنی کو چند وجوہ کی بنا پر غلط۔ جعلی اور بے دینی قرار دیا ہے اور جو وجوہ بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ اپنا خون خود بہانا۔

۲۔ یہ خوف کہ ایسا کرنے پر ساری دنیا مذاق اڑائے گی۔

۳۔ زنجیر زنی اور قمہ زنی کے پیچھے کچھ خفیہ ہاتھ ہیں۔

یہ تینوں امور نتیجہ ہیں اس بات کا کہ عزاداری کو ایک مشینی عمل سمجھ لیا گیا ہے اور اسکے اصل محرک یعنی محبت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ محبت میں کیوں اور کیسے نہیں ہوا کرتا نہ یہ خوف ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے اور نہ محبت کسی کے کہنے سننے سے کی جا سکتی ہے۔ صرف ہمارا یہ ایک جملہ ہی اس فتوے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے لیکن اتمامِ حجت کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان امور پر مختصر روشنی ڈال دی جائے۔ اسکے بعد ہم عزاداری کے سلسلے میں انکا بنایا ہوا زہر خود انہی کو پلائیں گے اور اسکے لئے شاید تفصیل کی ضرورت پڑے۔

اپنا خون خود بہانا

اس میں تین صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ چونکہ محبت کرنے والے پر محبوب کی مصیبت شاق ہوتی ہے اس لئے اگر اسکے لئے ممکن ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب سے مصیبت رفع کرنے کے

لئے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو بھی مصیبت آنی ہے وہ اس پر آجائے لیکن اسکا محبوب محفوظ رہے جیسا کہ شہدائے کربلا نے کیا۔ اس دَور کے حسینیوں کو چونکہ زمانے نے میدانِ کربلا سے بہت دور پھینک ڈالا ہے اس لئے وہ مجبور ہیں اور عملاً نصرت محبوب نہیں کر سکتے۔ البتہ انکی تمنا یہی ہے کہ ''کاش ہم بھی آپؑ کے ساتھ ہوتے اور آپؑ پر اپنی جانیں قربان کرتے''۔ اگر دیکھا جائے تو یہ فقط ایک جملہ ہے جو کوئی بھی اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہے اس لئے محبت کرنے والے اپنے محبوب کو یقین دلانے کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں تا کہ ثابت کر سکیں کہ مولاؑ جب ہم آپؑ کی محبت میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنا خون بہا سکتے ہیں تو آپؑ کی نصرت میں آپؑ کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے زخم کھانا ہم پر کیونکر شاق گذر سکتا ہے؟۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محبّ چاہتا ہے کہ جو تکلیف اور اذیت اسکے محبوب پر گذری ہے اس اذیت کا ذائقہ وہ خود بھی چکھے۔ مثلاً حضرت اویسؓ قرنی کا رسول اللہ کے دو دانت شہید ہو جانے کی خبر سن کر اپنے تمام دانت توڑ لینا یا جناب امّ رباب کا زندگی بھر دھوپ میں رہنا اس لئے کہ انکے محبوب امامؑ کا لاشہ دھوپ میں پڑا رہا تھا۔ جناب امّ رباب کا یہ عمل امامِ وقت کی موجودگی میں تھا اور انکے اس عمل پر امامِ وقت کا خاموش رہنا اور منع نہ کرنا تقریرِ معصومؑ ہے اور حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح رسولؐ اللہ نے بھی حضرت اویس قرنیؓ کے عمل پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا اور اس طرح رہتی دنیا تک جناب اویسؓ کا عمل معصومؑ سے محبت کرنے والوں کے لئے حجت قرار پاتا ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب کو دیکھکر یا اسکی مصیبت کو یاد کر کے ایسا بے خود ہو جائے کہ اسے یہ ہوش ہی نہ رہے کہ اسکے اپنے جسم پر کیا گذر رہی ہے اور خون کیوں بہہ رہا ہے۔ سورۂ یوسف میں زلیخا کی سہیلیوں کا حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لینے کا واقع بیان کیا گیا ہے لیکن کسی بھی موقع پر

اللہ نے ان عورتوں کے اس فعل کی مذمت نہیں فرمائی جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ محبت قوانینِ شریعت سے بالاتر ایک شے ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا حضرت یوسفؑ کے فراق میں بصارت سے محروم ہو جانا بھی اسی بے خودی کی دلیل ہے۔ یہاں ہم خود کربلا سے ایک عملی دلیل پیش کرتے ہیں جسکا ذکر بڑے بڑے مراجع تقلید کے فتاویٰ پر مبنی کتاب ''عزاداری از دیدگاہِ مرجعیت شیعہ'' میں کئی مقامات پر موجود ہے لیکن یہاں ہم بحارالانوار سے ایک اقتباس نقل کر رہے ہیں جو کتاب الرسالۃ العلمیہ فی اخبار المعصومین کے صفحہ ۲۰ تا ۲۱ سے اخذ کیا گیا ہے۔ بازارِ کوفہ کا منظر علامہ مجلسی یوں نقل کرتے ہیں:۔

''ادھر تو امّ کلثومؑ اور عورتوں کو خطاب کر رہی تھیں ادھر ایک زبردست کہرام برپا ہوا جبکہ سر ہائے شہداء آ گئے جنکے آگے آگے امام حسینؑ کا سرِ مبارک زُہرا اور قمر کی صورت میں دمک رہا تھا اور بعینہٖ رسول اللہؐ کے سر کی نمائندگی کر رہا تھا۔ انکی ریشِ مبارک خون سے خضاب آلود اور ہوا سے لہرا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاند بدلی سے نکل رہا ہو۔ یہ دردناک منظر جناب زینبؑ نے دیکھا تو آپؑ نے اپنی پیشانی کو محمل پر اس زور سے مارا کہ پیشانی شق ہو گئی اور خون بہتا ہوا آپؑ کی نقاب سے نیچے دکھائی دینے لگا''۔

یہ تھا اسکا طرزِ عمل جو عالمۂ غیر معلّمہ تھی۔ جو شریکۃ الحسینؑ تھی اور جو مقامِ عصمت پر فائز تھی۔ یہ عمل بھی امامِ وقت کی نظروں کے سامنے ہوا جس پر امامِ معصومؑ نے کوئی ممانعت نہیں فرمائی اور اس اعتبار سے اس عمل کو مالکِ شریعت کی تائید حاصل ہے۔ اسکی مخالفت وہی کر سکتا ہے جو خود کو ائمۂ معصومینؑ سے افضل و برتر سمجھتا ہو۔ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے وہ خود اپنے بارے میں فتویٰ صادر کرے اور اسکے بعد عزاداریٔ حسینؑ سے متعلق کوئی لفظ منہ سے نکالے۔ ہم نے ازراہِ رواداری صرف ایک تجویز دی ہے ورنہ ہمارے پاس ایسے فتوے صادر کرنے والوں کی شدید مذمت میں بہت سے فتوے موجود ہیں جو ہم آئندہ

صفحات میں پیش کریں گے۔انشاءاللہ۔

مذاق اڑائے جانے کا خوف

جس مکتبِ خیال کی بنیاد ہی اس بات پر ہو کہ ہر قیمت پر بڑے بھائیوں کو خوش رکھا جائے وہاں عزاداری کے معاملے میں یہ خوف لاحق ہونا ایک لازمی امر ہے لیکن جن لوگوں کا مقصد بندوں کی خوشنودی نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو وہ ایسے وسوسوں کا کبھی شکار نہیں ہوتے۔اگر مذاق اڑائے جانے کا اتنا ہی خوف ہے تو پھر میرا مشورہ ہے کہ حج جیسی عظیم عبادت کو بھی ترک کر دیا جائے کیونکہ اس میں بھی بہت سے ایسے ارکان موجود ہیں جن پر مسلمانوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔اصولِ کافی میں ایک دہریے کا واقعہ درج ہے جو حج کے موقعے پر آیا ہوا تھا اور وہاں وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں وجودِ باری کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے حاضر ہوا۔امامؑ نے اس سے پوچھا ''جب تو اللہ کو مانتا ہی نہیں تو پھر یہاں کیا کرنے آیا ہے؟''۔اس نے جواب دیا۔''میں یہاں صرف اس لئے آیا ہوں تاکہ مسلمانوں کی مجنونانہ حرکات وسکنات کو دیکھ سکوں''۔اگر آپ ارکانِ حج پر نظر کریں تو کوئی بھی عقلی جواز نظر نہیں آئے گا۔ایک پتھروں اور سیمنٹ سے بنا ہوا حجرہ جسے لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اسکا طواف کرنا اور اس میں نصب شدہ سیاہ پتھر کو چومنے کے لئے ایک دوسرے پر ہجوم کرنا اور دھکے کھانا۔یہ حرکات دیکھ کر کون ہوگا جو ایسا کرنے والوں کو عاقل وفہیم تصور کرے گا؟۔تین پتھروں کو شیطان تصور کر کے اس پر کنکریاں مارنا اور اس دوران ہر سال بہت سے لوگوں کا کچل کر ہلاک ہوتے رہنا کس اعتبار سے ایک عاقلانہ فعل تصور کیا جا سکتا ہے؟۔دو پہاڑوں کے درمیان جوان اور بوڑھے لوگوں کا بھاگنا کون سی عقل مندی کا مظاہرہ ہے؟۔کروڑوں جانوروں کو کاٹ کر پھینک دینا کس زاویے سے ایک منطقی فعل قرار دیا جا سکتا ہے؟۔مفتی صاحب کو غور کرنا چاہئے تھا کہ ان تمام افعال وحرکات کا کوئی بھی پہلو عقلی اعتبار سے معتبر نہیں ٹھہرتا اس لئے ایک فتویٰ حج

کے بارے میں بھی صادر فرمانا چاہئے تھا۔ لیکن حقیقت بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ ان تمام حرکات وسکنات کی بنیاد محبت ہے۔ طواف اور چومنا اپنے محبوب سے اظہارِ محبت ہے۔ سنگریزے مارنا محبوب کے دشمنوں سے دشمنی کا اظہار ہے۔ جانور ذبح کرنا محبوب کا صدقہ اتارنا ہے۔ وہ اسماعیلؑ تھے جنکا صدقہ جانوروں کا خون ہے اور یہ حسینؑ ہے جسکا صدقہ ہمارا اپنا خون ہے۔
ڈاکٹر علی شریعتی اپنی کتاب ''ذکر اور ذاکرین'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے منیٰ کے میدان میں ایک ایرانی کو داڑھیں مار مار کر روتے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے مقام پر ہوں جہاں اسماعیلؑ کے زندہ بچ جانے کی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ کاش میں وہاں ہوتا جہاں حسینؑ کو بچانے والا کوئی نہ تھا''۔ معصومؑ کی والدہ نے اپنے شیر خوار بچے کے لئے پانی تلاش کرتے ہوئے چونکہ صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگائے تھے اس لئے ہر مسلمان پر واجب ہوا کہ وہ بھی یہ تکلیف اٹھائے اگر چہ اسے پانی کی تلاش نہیں ہوتی۔ جب اللہ کو یہ بات پسند ہے کہ محبّ اپنے محبوب پر گذرنے والی تکلیف خود پر بھی طاری کرے اگر چہ اسکی ظاہری منطق کچھ بھی نہ ہو تو زخموں سے چور چور اپنے محبوب پر گذرنے والی اذیت کو اسکے محبّ کیونکر اپنے اوپر طاری نہ کریں گے؟ اسی بات کو محسوس فرماتے ہوئے کتاب ''عزاداری از دیدگاہ مرجعیت شیعہ'' کے صفحہ ۱۰۸ پر آقائی سید علی فانی اصفہانی حسب ذیل الفاظ میں اظہارِ رائے فرماتے ہیں:۔

''ہمارے نزدیک تقربِ الٰہی اور تقربِ ختمی مرتبتؐ و ائمۂ اہل بیتؑ کا عمدہ ترین ذریعہ اور وسیلہ رائج مراسمِ عزائے غریبِ کربلا ہیں کیونکہ ان مراسمِ عزا کے ذریعے ائمۂ اہل بیتؑ کا مشن زندہ ہے۔ مراسمِ عزا کیا ہیں؟۔ یہی کہ ان میں ان پر رویا جاتا ہے۔ سینہ زنی کی جاتی ہے۔ منہ پر طمانچے مارے جاتے ہیں۔ زنجیر

زنی ہوتی ہے۔جلوس سڑکوں پر آجاتے ہیں بلکہ چاقو زنی شبیہ خوانی اور طبل زنی ہوتی ہے اور آگ پر ماتم کیا جاتا ہے''۔اسکے بعد صفحہ ۱۱۳ پر فرماتے ہیں۔'' کیا عزاداری مقامِ مذاق ہے؟ کیا یہ بھی ایک اعتراض ہے کہ عصر حاضر میں جب ہمارے جلوسہائے عزا سڑکوں اور گلیوں میں آتے ہیں تو مخالفین ہمارا مذاق اڑاتے ہیں لہٰذا انھیں بند ہونا چاہئے؟۔جواب یہ ہے کہ ہر مذہب وملت میں کچھ اجتماعی مراسم ہوتے ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ اقوامِ عالم میں سے کسی بھی مذہب کے اجتماعی مراسم ہمارے مراسمِ عزا سے بہتر نہیں ہونگے لہٰذا یہ وہم غلط اور بے بنیاد ہے۔علاوہ ازیں جہاں تک دین اور احکام دین کا تعلق ہے تو اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں اور نہ ہی کسی کے مذاق اڑانے سے احکامِ اسلام بدلے جا سکتے ہیں۔اگر ہم احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں تو انکے اعمال کا ہم بھی مذاق اڑا سکتے ہیں''۔

خفیہ ہاتھ

مفتی صاحب کو تو غالباً وہ خفیہ ہاتھ نظر نہ آیا جو لوگوں کو زنجیر زنی اور قمہ زنی پر آمادہ کرتا ہے لیکن ہم اس خفیہ ہاتھ کو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں کیونکہ حدیثِ قدسی میں ہم نے یہ ارشادِ خداوندی دیکھا ہے کہ'' کنت کنزاً مخفیہ''۔(میں ایک خفیہ خزانہ تھا) یہیں سے ہم نے پہچانا اور پھر مشاہدہ کیا کہ پوری کائنات میں یہی خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔یہی خفیہ ہاتھ ہے جس نے محبتِ اہلِ بیتؑ کو اجر رسالت قرار دیا ہے لہٰذا جسے دین دار کہلانے کا شوق ہے اسے اجرِ رسالت لازماً ادا کرنا پڑے گا اور قہراً اہل بیتؑ سے محبت کرنا پڑے گی۔ <u>اور محبت جہاں بھی ہوگی وہیں اس کے اثرات بھی ساتھ ساتھ ہی ہونگے۔ جب اللہ نے محبت کی کوئی مقدار معین نہیں فرمائی تو پھر اسکے اثرات کو کیونکر محدود کیا جا سکتا ہے؟</u>۔اثرِ محبت کو وہی شخص محدود کر سکتا ہے جس نے ذائقہ محبت

چکھا ہی نہ ہوں اور جب وہ محبت سے ہی نابلد ہے تو وہ اجرِ رسالت کا بھی نا دہند ہے جسکے بغیر دین وشریعت بے معنی الفاظ ہیں۔ یہ تو ہم محبت کرنے والوں کا نقطۂ نگاہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات صرف ایک ہی خفیہ ہاتھ کو جانتے ہیں جو انکو خوابوں میں بھی آ آ کر ڈراتا رہتا ہے اور اس بیماری کو خفقان کہتے ہیں۔

زہر کا علاج زہر سے

ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں کہ نہ ہم کسی غیر معصوم کے فتووں کے قائل ہیں۔ نہ انھیں کوئی اہمیت دیتے ہیں اور نہ انھیں اس قابل سمجھتے ہیں کہ انھیں مقام استدلال پر لایا جاسکے لیکن حکماء کا ایک طریقۂ علاج ہے جسے ''علاج بالمثل'' کہتے ہیں۔ چونکہ مرض بہت پرانا ہے اور جڑیں پکڑ چکا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنی دوا پلانے کے بعد یہ طریقہ بھی آزما دیکھیں کیونکہ مقصد بہر حال اصلاحِ مزاج ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا تمام تر انحصار کتاب ''عزاداری از دیدگاہِ مرجعیتِ شیعہ'' پر ہوگا جسکے مولف آقائی علی ربانی خلخالی ہیں اور جسے ولی العصر ٹرسٹ رتہ متہ ضلع جھنگ نے شائع کیا ہے اور جس میں عزاداری اور رسوم عزاداری کے بارے میں بزرگ ترین مراجعِ تقلید کے فتاویٰ درج کئے گئے ہیں۔ جس ترتیب سے ہم یہ فتاویٰ پیش کریں گے وہ یہ ہے:۔

۱۔ آقائی نائینی جو اکثر مراجع کبار کے استاد ہیں جنھیں مذکورہ کتاب میں '' آیت اللہ العظمیٰ رئیس الفقہاء الشیخ محمد حسین نائینی'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان سے رسومِ عزا کے بارے میں چند سوالات کئے گئے تھے جنکا جواب انھوں نے اپنے فتوے کی صورت میں دیا ہے۔ انکے اس تاریخی فتوے کو ہم نے مرکز قرار دیا ہے اور اسے ہم عبارت کے سرنامے کے طور پر نقل کریں گے۔

۲۔ اسکے بعد مختلف مراجعِ عظام کے وہ فتوے نقل کئے جائیں گے جو نائینی صاحب کے فتوے کی تائید میں دیے گئے ہیں۔

۳۔اسی تسلسل میں دیگر مراجع کے فتاویٰ پیش کئے جائیں گے جن میں زنجیر زنی کو نہ صرف جائز بلکہ مستحب قرار دیا گیا ہے۔

۴۔پھر وہ فتاویٰ نقل کئے جائیں گے جن میں زنجیر زنی اور قمہ زنی کو واجبِ کفائی قرار دیا گیا ہے۔

۵۔آخر میں بزرگ مراجع کے وہ فتوے درج کئے جائیں گے جو معترضین و مانعین زنجیر و قمہ زنی کی مذمت میں صادر کئے گئے ہیں۔اس توقع بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مذمت کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان سے ہمیں بری الذمہ سمجھا جائے گا کیونکہ فتووں کے ایک ایک لفظ کے ذمہ دار خود وہ مراجع ہیں جنھوں نے یہ فتوے صادر فرمائے ہیں۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ ہم تمام کے تمام فتوے نقل نہیں کر رہے ہیں بلکہ انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف ۳۲ فتووں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

آقائی نائینی کا فتویٰ

۱۔یہ فتویٰ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۶۹ تا ۷۱ پر درج ہے جسکا متعلقہ اقتباس ہم صفحہ ۷۰ سے پیش کر رہے ہیں:۔

''ذکر حسینؑ میں مزید اس حد تک طمانچہ مارنے اور سینہ زنی کرنے میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے کہ منھ اور سینہ سرخ یا سیاہ ہو جائیں بلکہ کندھوں اور پشت پر زنجیر زنی بھی جائز ہے بلکہ اگر مزید طمانچوں۔سینہ زنی اور زنجیر زنی سے خون بھی نکل آئے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔جہاں تک پیشانی سے تلوار وغیرہ جیسی چیز سے خون نکالنے کا تعلق ہے تو اقویٰ یہ ہے کہ جائز ہے''۔(یہ ایک طویل فتویٰ ہے جس میں اور بھی کئی چیزوں کو جائز قرار دیا گیا ہے مثلاً دورانِ جلوس دف بجانا یا واقعاتِ کربلا کو ڈرامے کی شکل میں پیش کرتے وقت مردوں کا عورتوں کی شبیہ بننا اور زنانہ لباس پہننا وغیرہ)

آقائی نائینی کی تائید

۲۔صفحہ ۷۶ پر آقائی محسن الحکیم کا یہ فتویٰ درج ہے:۔
''جو مطالب استاد محترم نے تحریر فرمائے ہیں وہ انتہائی واضح اور غیر مبہم ہیں۔حتّٰی کہ ان امور کے لئے مزید کسی فتوے کی ضرورت بھی نہیں ہے''۔

۳۔صفحہ ۷۸ پر جناب ابوالقاسم خوئی صاحب کا فتویٰ:۔
''استاد محترم نے اہالیانِ بصرہ کے سوالات کے جوابات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے صحیح ہے۔اسکے مطابق عمل کیا جائے''۔

۴۔صفحہ ۷۸ پر ہی شاہرودی صاحب کا فتویٰ:۔
''زیرِ نظر رسالے میں استاد محترم کے ارشاداتِ گرامی جو سوالات کے جوابات ہیں حق محقق ہیں''۔

صفحہ ۸۰ سے تین فتاویٰ پیش کیئے جارہے ہیں:۔

۵۔شیخ محمد حسین مظفر:۔''جو کچھ آیت اللہ نائینی نے تحریر فرمایا بلا شک وشبہ درست ہے''۔

۶۔شیخ محمد کاظم شیرازی:۔'' آیت اللہ نائینی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے درست ہے''۔

۷۔سید جمال الدین موسوی گلپایگانی:۔''جو کچھ آیت اللہ نائینی نے اپنے فتوے میں تحریر فرمایا ہے حرف بہ حرف درست اور ہمارے فتوے کے مطابق ہے''۔

۸۔صفحہ ۸۵ جناب محمد حسین آل کاشف الغطاء:۔'' جو فتویٰ حضرت آیت اللہ نائینی نے دیا ہے درست ہے''۔

۹۔صفحہ ۹۴ شیخ محمد باقر آشتیانی:۔''استاد الاساتذہ شیخ الفقہاء المتاخرین مرحوم آیت اللہ نائینی رضوان اللہ علیہ کے فتوے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔اکثر مناظرین علماء نے انکے فتوے کی تائید وتصدیق فرمائی ہے''۔

دیگر مراجع کے فتاویٰ

۱۰۔شیخ جعفر کاشف الغطاء فرماتے ہیں:۔

''جہاں تک ان مراسم کے از روئے شریعت حکم کا تعلق ہے تو سینہ زنی۔زنجیر زنی۔جلوس نکالنا۔انکی دستہ بندی کرنا۔عوامی راہوں اور سڑکوں پر آنا وغیرہ نہ صرف انکے جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ انکا باعثِ ثواب ہونا اور مستحب ہونا بھی خالی از اشکال ہے''۔(صفحہ۹۹)

۱۱۔سرکارِ علامہ شیخ خضر ابن شلال اپنی کتاب ابواب الجنان میں رقمطراز ہیں:۔

''تمام نصوص و احادیث اور اخبار و روایت سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غریب کربلا کی عزاداری میں جتنے بھی مراسمِ عزا بجالائے جاتے ہیں سب جائز ہیں۔حتیٰ کہ اگر موت کا یقین بھی ہو تو بھی جائز ہے''۔(صفحہ۱۰۰)

۱۲۔مصلحِ کبیر شیخ محمد حسین آلِ کاشف الغطاء کا فتویٰ:۔

''جہاں تک شمشیر زنی۔خنجر زنی وغیرہ جیسے خون والے آلاتِ ماتم کا تعلق ہے تو ''جب تک کسی چیز کی حرمت کا یقین نہ ہو'' کے قاعدہ کلیہ کے مطابق نہ صرف مذکورہ مراسم مباح ہیں بلکہ مراسمِ عزا کی تعظیم کے ارادے سے انکا بجالانا باعث ثواب اور مستحب ہے''۔(صفحہ۱۰۲)

۱۳۔جناب صادق روحانی کا نظریہ:۔

''اگر خنجر زنی۔چاقو زنی اور تلوار زنی وغیرہ سے انسان کی جان یا کسی عضو کے جانے کا یقین ہو تو بھی جائز ہے اور ان شعائر حسینی میں سے ہے جنکی تعظیم کا ہمیں حکم دیا گیا ہے''۔(صفحہ۱۰۷)

۱۴۔آقائی حاج شیخ عبدلکریم حائری کا ارشادِ گرامی:۔

''جہاں تک چاقو زنی وغیرہ کا تعلق ہے تو اگر یہ چیز اتلافِ جان کا باعث نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس سے منع کرے

بلکہ محبت غریب کربلا میں تمام مراسم عزا جائز ہیں''۔(صفحہ۱۳۷)

۱۵۔آقائی حاج سید شہاب الدین مرعشی:۔

''امام حسینؑ کا قیام الٰہی قیام ہے۔امت مسلمہ نے آپؑ پر مظالم کی انتہاء کردی ہے لہٰذا ماضی کی طرح معمول کے مطابق مجالس عزا کا انعقاد۔روضہ خوانی۔آل محمدؐ پر ہونے والے مصائب کا تذکرہ۔سینہ زنی۔زنجیر زنی وغیرہ سب کچھ کیا جائے بشرطیکہ محرمات شرعیہ نہ ہوں۔نہ صرف اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ عصر حاضر میں ان امور کی بجا آوری ضروریات سے ہے اور اجر وثواب میں اضافے کا باعث''۔(صفحہ۱۵۹)

۱۶۔علامہ عبداللہ مجید فقیہی بروجردی فرماتے ہیں:۔

''فضائل و مصائب اہل بیتؑ کی کتب لکھنا۔نشر کرنا اور انکے مصائب میں رونا محبت ہی کے افراد سے ایک فرد ہے۔مجالس عزا کا انعقاد۔انکی ولادات پر جشن مسرت منانا۔امام بارگاہیں بنانا۔انکی محبت میں کھانا کھلانا۔نوحہ خوانی کرنا۔مرثیہ سرائی۔سینہ زنی۔زنجیر زنی۔شبیہ سازی۔سیاہ لباس پہننا۔جلوس ہائے عزا مرتب کرنا۔چاقو زنی۔ایشیا اور افریقہ میں مرسوم آگ پر ماتم کرنا اور خون بہانا وغیرہ تمام مراسم عزا شعائر اللہ سے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ ہے''۔(صفحہ۲۵۲)

وجوب زنجیر وقمہ زنی کے بارے میں فتوے

۱۷۔آقائی ممقانی کا فتویٰ:۔

''مراسم عزا میں کسی قسم کا اشتباہ کرنا ہرگز درست نہیں ہے بلکہ اگر فقہاء جنھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ حصول فقہ میں گذارا ہے۔عصر حاضر میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اغیار ہر طرف سے ہر حیثیت سے اور ہر ذریعے سے نور اہل بیتؑ کو خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ان مراسم کے وجوب کفائی کا فتویٰ دیں تو زیادہ مناسب

ہوگا''۔(صفحہ۱۰۰)

۱۸۔علامہ سید تقی طباطبائی قمی فرماتے ہیں:۔

''تمام اہل ایمان وولایت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ غریب کربلا اور دیگر اہل بیت عصمت کی عزاداری اپنی تمام اقسام اور مراسم عزا از قسم مجالس۔نوحہ خوانی۔سرو سینہ زنی۔انجمنوں کی تشکیل۔جلوس ہائے عزا کا سڑکوں پر آکر سینہ زنی اور زنجیر زنی بلکہ تلوار زنی سب کچھ جو شیعہ کا معمول ہے نہ صرف جائز ہے بلکہ باعثِ ثواب۔شعائر دینیہ اور مکتب سید المرسلینؐ ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ عصرِ حاضر میں تمام مراسم عزا واجبِ کفائی ہیں تو بھی درست ہوگا۔بعض افراد کی طرف سے مراسم عزا کے خلاف جو باتیں کہی جارہی ہیں اور باعث وسواس اور پراگندگی اذہان بن رہی ہیں قطعاً غلط ہیں بلکہ ایسی باتوں کا کرنا حرام ہے''۔(صفحہ ۱۹۸)

۱۹۔جناب ناصر مکارم شیرازی کا ارشاد:۔

''تمام وہ مراسم عزا جو امام حسینؑ اور آپکے ساتھیوں کے مقدس مشن کے تحفظ اور شعائر اسلامی کی عظمت وسربلندی کے لئے کی جائیں شرعاً جائز ہیں بلکہ بعض اوقات واجب ہوجاتے ہیں''۔(صفحہ۲۰۲)

۲۰۔جناب محمد کرمی کا فرمان:۔

''امام حسینؑ کی قربانی کے سلسلے میں کئے جانے والے مراسِم عزا شعائر اللہ ہیں جو ہر دور میں ہر جگہ فرض ہیں''۔(صفحہ۲۲۵)

۲۱۔آقائی محی الدین ممقانی کا فتویٰ:۔

''زنجیر مارنا۔ماتم کرنا اور اس قسم کے باقی چیزیں جو سوگواری کی عظمت ہوں جائز ہیں اگر صاحب ضرر نہ ہوں اور موجودہ دور میں چونکہ رمز تشیع مذہب کی حفاظت میں ہے اس لئے یہ چیز بھی لازم الاجراء بلکہ واجب کفائی ہیں''۔(صفحہ۲۲۵ تا

(۲۳۶

۲۲۔آقائی سید محمد علی کاظمینی بروجردی کا فیصلہ:۔

''ہاں! جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے نہ صرف مراسم عزا جائز ہیں بلکہ مستحب ہی نہیں بلکہ لازمی ہیں''۔(صفحہ۲۶۱)

وہ فتاویٰ جو مانعینِ زنجیر وقمہ زنی کی مذمت میں صادر کئے گئے ہیں

ہم اپنی بات کو پھر دہراتے ہیں کہ مذمت کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان سے ہم قطعاً بری الذمہ ہیں اور انکی تمام تر ذمہ داری ان مراجع عظام پر ہے جنھوں نے یہ فتوے صادر فرمائے ہیں۔

۲۳۔آقائی سید مرتضیٰ فیروز آبادی کا فتویٰ:

''سینہ زنی وغیرہ جیسے مراسم عزا صدیوں سے شیعانِ اہل بیت میں رائج ہیں اور ان پر متواتر عمل ہو رہا ہے۔تمام محقق اور غیر محقق علمائے شیعہ نے ان تمام مراسم عزا کو جائز قرار دیا ہے۔نہ تو سابقاً یہ سنا گیا ہے اور نہ آئندہ یہ سنا جائے گا کہ علماءِ شیعہ میں سے کسی نے ان مراسم کو نا جائز قرار دیا ہو۔بطور فرض اگر ان مراسم عزا میں کسی کو اشتباہ ہوا ہو یا اپنی کج بحثی اور عقیدے میں کج روی کی وجہ سے کسی نے مراسم عزا کی مخالفت کی بھی ہو تو انکی مقدار اتنی کم ہے کہ اسے نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے اور ایسی تعداد یا ایسے افراد کسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بھی مراسم عزا کے جواز اور استحباب کے خلاف بحث کرے یا تو وہ عقل سے تہی دامن ہے یا وہ دین سے کوتاہ دست ہے اور یا اسکا نسب مخدوش ہے۔جہاں تک بلیڈ۔چاقو یا تلوار زنی کا تعلق ہے تو اسکا جواز مشروط ہے یعنی اگر موت کا خوف نہ ہو تو حتماً جائز ہے۔اس سلسلے میں

جناب مسافرۂ شامؑ کا وہ عمل متواترات سے ہے جس میں بی بیؑ نے اپنی پیشانی چوبِ خیمہ پر مار کر پیشانی زخمی کیا تھا اور اس سے خون بہہ نکلا تھا۔ بی بی کا یہ عمل جس میں جبینِ مبین سے خون نکل آیا تھا عزاداری میں اخراج خون کے جواز کی واضح دلیل ہے۔ مذکورہ شرائط کے ساتھ بلیڈ۔ چاقو اور تلوار زنی وغیرہ کی حرمت کا فتویٰ بلا دلیل ہے''۔ (صفحہ ۹۲ تا ۹۳)

۲۴۔ آقائی علی مدد نائینی کا ارشاد:۔

''جو کچھ استاد مرحوم آیت اللہ نائینی نے لکھا ہے بلا شک حق ہے اور **شکی مزاج** کے سوا ان میں کوئی بھی شک نہیں کرے گا''۔ (صفحہ ۹۷)

۲۵۔ آقائی سید محمد صادق روحانی کا فتویٰ:۔

''جو لوگ ملتِ شیعہ سے مربوط ہیں ان پر واجب ہے کہ سینہ زنی اور زنجیر زنی وغیرہ تمام مراسم عزا بجا لائیں۔ یقین کیجئے کہ آج جو یہ راگ الاپے جا رہے ہیں کہ سینہ زنی۔ زنجیر زنی اور چاقو زنی وغیرہ صحیح نہیں ہیں خلافِ شرع ہیں۔ یہ تمام اغیار اور علماء سوء کی تبلیغ ہے جو چند ٹکوں کے عوض بک چکے ہیں۔ یہ دشمنانِ دین کے خیالات کا ترجمہ ہے''۔ (صفحہ ۱۶۲)

۲۶۔ آقائی سید کرامت اللہ ملک حسینی کا فیصلہ:۔

''مراسم عزا اور مجالس عزا از قسم سینہ زنی۔ زنجیر زنی اور جلوس ہائے عزا وغیرہ کی افادیت سے دشمنانِ دین بھی واقف ہیں لہٰذا ہمیں ہر لحاظ سے مراسم عزا کو محفوظ رکھنا ہے۔ مراسم عزا اور عزاداری کے خلاف جو زبان کھلے یا تحریر آئے تو انکو سامراجی ایجنٹوں کا چبایا ہوا لقمہ سمجھ کر پھینک دینا چاہئے جو فتنہ انگیز اور دشمنانِ دین ہیں''۔ (صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۰)

۲۷۔ آقائی سید کاظم مرعشی کا فرمان:۔

''عزاداریٔ مظلومِ کربلا اور مراسم عزاداری کے سلسلے میں جو کچھ استاد محقق آیت

اللہ نائبنی اعلی اللہ مقامہ الشریف نے عزاداری کی مختلف صورتوں میں فرمایا ہے وہ انتہائی درست ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ البتہ دشمنانِ دین اور گمراہ کردہائے شیطانِ لعین جو مراسم عزا کی مخالفت میں تبلیغ کر رہے ہیں شیعانِ آلِ محمدؐ اور موالیانِ اہل بیتؑ کو اس سے کسی قسم کا اثر قبول نہیں کرنا چاہئے''۔(صفحہ۱۹۲)

۲۸۔آقائی شیخ علی غازی شاہرودی کا فرمان:۔

''عزاداری اور مراسم عزا کا منکر مذہب شیعہ کے ضروریات میں سے مذہبی ضرورت کا منکر ہے ''۔(صفحہ۱۹۳)

۲۹۔آقائی سید محمد مہدی موسوی خلخالی کا نظریہ:۔

''مراسم عزا کے سلسلے میں جو لوگ شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہیں وہ سوءِ فہم یا بدنیتی کا شکار ہیں''۔(صفحہ۲۰۸)

۳۰۔آقائی علی پناہ اشتہاردی کا فتویٰ:۔

''یہ بات حیرت اور تعجب کے قابل نہیں ہے کہ عزاداری اور مراسم عزا میں اشتباہات پیدا کئے جا رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں جدت بھی آ رہی ہے کیونکہ عزاداری اور مراسم عزا میں رخنہ اندازی شجرۂ خبیثہ کے فروع سے ہے جس نے آلِ محمدؐ کی مخالفت کی قسم کھا رکھی ہے''۔(صفحہ۲۱۰)

۳۱۔آقائی محی الدین ممقانی کا ارشاد:۔

''بہت افسوس کی بات ہے کہ زمانہ اس قدر آلودہ ہو چکا ہے اور شیعہ مذہب کے خلاف اس حد تک تبلیغات کی جا چکی ہیں کہ اب شعائرِ قطعیہ اور امورِ مسلمہ کے متعلق سوال ہونے لگے ہیں جن میں سے ایک عزاداریٔ سید الشہداء ہے۔ زنجیر مارنا۔ ماتم کرنا اور اس قسم کے باقی چیزیں جو سوگواری کی عظمت ہوں جائز ہیں اگر صاحب ضرر نہ ہوں اور موجودہ دور میں چونکہ رمزِ تشیع مذہب کی حفاظت

میں ہے اسی لئے یہ چیزیں بھی لازم الاجراء بلکہ واجب کفائی ہیں۔خداوندِ عالم سے التماس ہے کہ وہ اس مظلوم فرقۂ شیعہ امامیہ کو دشمنانِ اسلام کی تبلیغات سے محفوظ و مامون فرمائے اور امام زمانؑ کا ظہور فرمائے اور منافقین اگر قابلِ ہدایت ہیں تو انکی ہدایت فرمائے ورنہ انھیں نیست و نابود فرمائے''۔
(صفحہ ۲۳۵ تا ۲۳۶)

۳۲۔آقائی سید مہدی لاجوردی کا فتویٰ:۔

''جب تک اللہ کی خدائی موجود ہے شاہِ کربلاؑ کا پرچم لہرا رہا ہے۔ جو لوگ عزاداریٔ امام حسینؑ کے مراسم عزا اور آپؑ سے متعلق انجمنوں پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں بستے ہیں۔اعتراض برائے اعتراض کرتے ہیں۔دشمنانِ دین ہیں اور اعدائے آئین ہیں۔ایسے لوگ درسگاہِ شرف و کمال سے اعلانِ جنگ کررہے ہیں۔ایسے لوگ قرآن و دین حق کے راہنمایانِ حقہ کی لعنت کا طوق گلے میں ڈال رہے ہیں''۔(صفحہ ۲۴۹)

ہم نے پوری کتاب میں سے صرف ۳۲ فتاویٰ آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں جو متلاشیٔ حق کے لئے کافی و وافی ہیں حالانکہ زیرِ نظر کتاب ۲۶۶ صفحات پر محیط ہے جو تمام کی تمام عزاداری اور رسومِ عزاداری پر فتاوائے مراجع عظام پر مشتمل ہے جس میں آقائی خمینی کا یہ فتویٰ بھی شامل ہے۔''یومِ عاشور جلوس ہائے عزا میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوچنا بھی مت''۔(صفحہ ۱۳)

جو سوال ہم سے کیا گیا تھا اسکا مکمل جواب پیش کر دیا گیا لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جس فتوے کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے وہ فتویٰ نہیں بلکہ ایک ذہنیت ہے۔اول اس لئے کہ مفتی صاحب نے فتویٰ دیتے وقت دیدہ و دانستہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے زنجیر و قمہ زنی زمانہ حال ہی کا کوئی قصہ ہے اور یہ چیزیں اچانک اور ناگہانی طور پر وقوع پذیر

ہوگئی ہیں کہ کچھ لوگ تلواریں لیکر سڑکوں پر آگئے اور انھیں اپنے سروں پر مارنے لگے۔ چنانچہ اسی فتوے کے تسلسل میں فرماتے ہیں۔ ''گذشتہ چار پانچ سال میں اور جنگ کے بعد جس طریقہ سے قمہ زنی کو رائج کیا جارہا ہے اگر ایسا امام خمینی کی حیاتِ مبارک میں ہوتا تو وہ بھی اسکا مقابلہ کرتے۔ یہ ایک غلط کام ہے کہ بعض لوگ قمہ ہاتھ میں لیں۔ اپنے سر پر ماریں اور اپنا خون بہائیں۔ اس کام کا کیا مطلب ہے؟۔ یہ کام کس زاویے سے عزاداری ہے؟'' (فلسفۂ عزاداری صفحہ ۱۹) جبکہ آپ مندرجہ بالا فتاوٰی سے یہ اچھی طرح جان چکے کہ زنجیر و قمہ زنی آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے رائج ہیں اور جلوسِ عاشور کا ایک لازمی جزو رہی ہیں۔

اس ذہنیت کا اندازہ ایک اور بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مسئلہ صرف زنجیر و قمہ زنی ہی کا نہیں ہے بلکہ بات اور بھی آگے چلتی ہے جس سے باآسانی اس ذہنیت کا خاکہ سمجھ میں آجائے گا۔ کتاب فلسفۂ عزاداری کے صفحہ ۲۱ پر قبورِ ائمہؑ کی چوکھٹ پر بوسہ دینے میں بھی اشتباہ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے'' آپ نے کبھی سنا ہے کہ ائمہؑ یا علماء میں سے کوئی ایک شخص جب زیارت کرنا چاہتا ہو تو صحن کے دروازے سے جب داخل ہوتے ہیں وہاں سے زمین پر لیٹ کر سینے کے بل خود کو حرم تک پہنچاتا ہو؟ اگر یہ کام مستحسن مقبول اچھا اور مستحب ہوتا تو ہمارے بزرگ اس کام کو ضرور کرتے لیکن انھوں نے نہیں کیا۔ حتیٰ منقول ہے کہ مرحوم آیت اللہ العظمیٰ آقائی بروجردی وہ عالمِ بزرگ مجتہد قوی اور روشن فکر چوکھٹ کو بوسہ دینے سے منع کرتے تھے۔ باوجودیکہ یہ کام مستحب ہے پھر بھی وہ کہا کرتے تھے کہ یہ کام نہ کیجئے۔ کہیں لوگ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ ہم ائمہؑ کی قبروں پر سجدہ کرتے ہیں''۔

یہ تو تھا تصویر کا ایک رخ۔ اب دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔

کتاب ''عزاداری از دیدگاہِ مرجعیتِ شیعہ'' کے صفحہ ۴۰ پر جناب خمینی کا یہ فرمان درج ہے:۔

''طالقانی کی شہادت کے روز لوگ کیا کہہ رہے تھے؟۔کیا نعرے لگا رہے تھے؟۔ یہی نعرے تھے کہ ''اے نائب نبی تیری جگہ خالی ہے''۔لوگ طالقانی کو نائب نبی کے عنوان سے پہچانتے تھے۔تم لوگوں نے جس بیلچے اور تیشے سے قبر کھودی ہے لوگ اس بیلچے اور تیشے کو عزت واحترام اور عشق وعقیدت سے ایک دوسرے کو پیش کرتے تھے اور لوگ اس بیلچے اور تیشے کو چومتے تھے۔جو جذبہ ضریح ائمہ کو بوسہ لیتے وقت ایک زائر کا ہوتا ہے اسی جذبہ وعقیدت سے لوگ بیلچے اور تیشے کو چوم رہے تھے''۔

جس بیلچے اور تیشے سے طالقانی صاحب کی قبر کھودی گئی اسے چومنا تو ممدوح ٹھہرا لیکن ضریح معصومؑ کی چوکھٹ کو چومنے سے شرک کا اندیشہ لاحق ہے!! میں اس موقعے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

احسن الحدیث

یہ دو سوالات ہیں جو مجھ سے براہِ راست نہیں کئے گئے بلکہ ایک تیسرے فریق کے ذریعے مجھ تک پہنچے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ نے قرآن کو ''احسن الحدیث'' کہا ہے تو پھر احسن الحدیث کے ہوتے ہوئے کسی اور حدیث کی کیا ضرورت ہے؟۔ یہ سوال ایسا نہیں تھا جسکا مجھے جواب دینا پڑتا لیکن چونکہ آج کل ماشاءاللہ شیعوں میں بھی یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ احادیث کو اتنا مشتبہ بنا دیا جائے کہ کسی بھی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے آدمی کو سو مرتبہ سوچنا پڑے۔ مجتہدوں کی حد تک تو یہ بات محض اشتباہ ڈالنے تک ہی محدود ہے اور ابھی تک انھیں انکارِ حدیث کی جراءت نہیں ہوئی لیکن یہی رجحان جب انکے جاہل مقلدین کے ہاتھ میں آیا تو وہ بلا خوف وخطر احادیث کی ضرورت سے انکار کرنے لگے۔ انٹرنیٹ پر بہت سی ایسی باتیں اور ایسے سوالات آتے رہتے ہیں جن سے دل کو شدید دکھ اور اذیت ہوتی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ شیعوں کی غیرتِ ایمانی کہاں گئی اور معصومینؑ سے انکی محبت کے دعوے کیا ہوئے اور اطاعت معصومؑ سے منہ موڑنا انھوں نے کیونکر گوارا کرلیا۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ ''اگر آپ فرماتے ہیں کہ غیر معصوم کی اطاعت کرنے کا مطلب اسکی عبادت کرنا ہے تو آپ جب اصولِ کافی کی پیروی کرتے ہیں تو گویا آپ حضرت یعقوب کلینیؒ کی پرستش کرتے ہیں؟''۔ اس احمقانہ بات کا جواب دینا بجائے خود ایک حماقت ہے۔ میں نے انھیں صرف اتنا جواب دیا کہ ''جناب پہلی بات تو یہ کہ آپ نے جس قول کو میری طرف منسوب کیا ہے وہ میرا نہیں بلکہ امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اصول کافی میں درج احادیث پر عمل کرنے کا مطلب اسکے مولف کی پرستش کرنا ہے تو پھر یہ آپ بھی جانتے ہیں اور سارا زمانہ جانتا ہے

کہ قرآن مجید جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے اسکی جمع و تالیف خلیفۂ ثالث نے کی ہے اور اسے رائج بھی انھوں نے ہی کیا ہے۔ اگر آپ کے فارمولے کو صحیح مان لیا جائے تو پھر قرآن کی پیروی کا مطلب عثمان کی پرستش کرنا ہوگا لہٰذا پہلے تو آپ قرآن پر عمل کرنا چھوڑیں اور وہ قرآن لائیں جو اللہ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر نازل کیا ہوا سکے بعد ہی بات آگے بڑھے گی۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ یعقوب کلینیؒ نے اصول کافی تصنیف نہیں کی نہ انھوں نے اس میں اپنی رائے۔ اپنے احکام یا اپنے فتوے درج کئے ہیں۔ انھوں نے صرف احادیث معصومینؑ کو جمع کر کے ایک کتابی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ان احکام پر عمل کرنا یعقوب کلینیؒ کی پیروی نہیں بلکہ احکام معصومؑ پر عمل کرنا کہلائے گا اور یہی بات آپ پر گراں گذرتی ہے''۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ مذکورہ سوال اور اسکے جواب کی اہمیت ضرور محسوس کرلیں گے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں لیکن اس سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ بات ہی اصلاً غلط ہے کہ احسن الحدیث کے ہوتے ہوئے کسی اور حدیث کی ضرورت ہی نہیں۔ ''احسن'' صیغۂ تفضیل ہے اور یہ صیغہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی شے کا دیگر اشیاء سے موازنہ مقصود ہو۔ اس طرح خود لفظِ احسن الحدیث میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ اللہ دیگر احادیث کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ایک مقام پر اس نے خود کو احسن الخالقین کہا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے سوا باقی تمام خالقین کا انکار کردیا جائے؟۔ بندہ پرور! آپ تو ایک پیالی چائے بھی نہیں پی سکتے اگر کوئی برتن بنانے والا نہ ہو۔ لوگوں کو برہنہ ہی پھرنا پڑے اگر کوئی کپڑے کا خالق نہ ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ ''احسن الخالقین'' کے ہوتے ہوئے آپ دوسرے خالقین کا وجود تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ''احسن الحدیث'' کی موجودگی میں حدیث معصومؑ کا وجود آپکو گوارا نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ دشمنِ معصومؑ کون سے گوشے

میں چھپی ہوئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری گنجائش صرف اس لئے نکالی جا رہی ہے تا کہ کچھ سر پھرے اور متکبر لوگ قرآن مجید کی من مانی تاویل کر سکیں اور انکا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔

ضرورت حدیث

حدیث ہمارے لئے کیوں ضروری ہے یہ جاننے کے لئے چند باتوں کومدِ نظر رکھنا لازمی ہے۔

ا۔دنیا میں دو قسم کے نظریات ہوتے ہیں۔ایک وہ جن پر عمل کرنا ناممکن ہو اور دوسرے وہ جن پر عمل کرنا ممکن ہو۔پہلا نظریہ جو بالکل ناممکن العمل ہو ایک تخیلِ بے معنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اسلئے شعوری یا لاشعوری طور پر کبھی ایسے نظریات پر عمل نہیں کیا گیا۔مثلاً عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے کہ ''اگر کوئی تمھارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو تم دوسرے رخسار کو اسکی طرف کر دو''۔کیا دو ہزار برس کی طویل مدت میں کبھی یہ نظریہ اپنایا گیا ؟۔یعنی کیا کبھی عیسائیوں نے خود اس پر عمل کیا؟۔تاریخ بتاتی ہے کہ عیسائیوں نے ہزاروں بار خونریزیاں کیں اور اب بھی کر رہے ہیں جن میں بیشمار انسانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔یہ بات عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ناممکن العمل نظریات صرف اسی حد تک وجود رکھتے ہیں جب تک وہ ہونٹوں کی زینت بنے رہیں۔عملی زندگی میں انکا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لہٰذا ایسے نظریات پر بحث کرنا اپنا وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔اس بات کی بھی ضرورت نہیں کہ انھیں رد کیا جائے کیونکہ عملی دنیا میں آکر یہ خود ہی اپنے آپکو رد کر دیتے ہیں۔بالکل اسی طرح یہ نظریہ کہ ''صرف قرآن ہمارے لئے کافی ہے'' کسی دور میں بھی ممکن العمل نہیں رہا۔پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے قرآن کی ورق گردانی نہیں کرتا تھا نہ کوئی اپنے دماغ سے قرآن کے معنی و مطلب نکالتا تھا بلکہ تمام تر عمل خود آنحضرتؐ ہی کی ہدایات پر ہوتا تھا اور آپؐ کے بعد بھی کوئی

دور ایسا نہیں گذرا جب اس نظریئے پر عمل کیا گیا ہو۔ جب بھی کوئی خلیفہ برسرِ اقتدار آتا تھا تو پہلے اس سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ قرآن و سنت پر عمل کرے گا۔ جب عملی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ نظریہ نا قابلِ عمل ہے تو پھر ایسے سوالات اٹھانا اوران پر کج بحثی کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟۔ انسان کسی مطلب پر دو طریقوں سے استدلال کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ دلیل کی روشنی میں منزل تلاش کرتا ہے اور بلآخر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہلے مطلب قائم کیا جائے پھر اسکو ثابت کرنے کے لئے دلیل تلاش کی جائے اور آیتوں کا رخ اسکی طرف پھیرا جائے۔ دلیل سے نتیجہ نکالنے کے بجائے پہلے نتیجہ قائم کرلینا اور پھر اسکے دلائل ڈھونڈنا کجروی کی دلیل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تفسیر بالرائے کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

۲۔ جب آج کے ترقی یافتہ دور میں جبکہ علوم حاصل کرنے کے بیشمار ذرائع موجود ہیں آپ بغیر اپنے تشریحی بیانات کے صرف قرآن ہی کے الفاظ سے لوگوں کو قرآن مجید کا اپنا مفہوم نہیں سمجھا سکتے تو اس دورِ جاہلیت میں حضرت پیغمبر اکرمؐ نے کیونکر بغیر تشریح کے قرآن کا مفہوم لوگوں کو سمجھایا ہوگا؟۔ پیغمبرؐ کی بیان کی ہوئی تشریح قرآن کو ہی حدیث کہا جاتا ہے۔ آخر آپ قولِ رسولؐ و ائمۂ سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے قرآن کے الفاظ رسولؐ پر نازل کردیئے اور مفہوم آپ کے دماغ میں ڈال دیا؟۔ میں آپکو تنبیہ کردوں کہ یہی تفسیر بالرائے ہے جس نے مسلمانوں میں ہزاروں فرقے بنا ڈالے یہاں تک کہ ایک ''دو رکعتی'' فرقہ بھی وجود میں آگیا جس نے دعویٰ کیا کہ ازروئے قرآن ہر نماز صرف دو رکعات پر مشتمل ہے۔ تو کیا آپ تمام فرقوں کو صحیح مانیں گے؟ اور اگر نہیں تو پھر کس منہ سے انکی تردید کریں گے؟ کیونکہ جب آپ اپنی مرضی سے قرآن کی تفسیر کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں تو پھر یہی حق دوسرے فرقوں کو بھی دینا پڑے گا۔ بغیر مرکز کے دائرہ اپنا وجود قائم رکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر محمدؐ و آلِ محمدؑ کو

مرکز تسلیم نہ کیا گیا تو اسلام کے غبارے سے ہوا نکلنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی اور شاید آپ اسی وقت کے منتظر ہیں۔ میں اپنے قارئین کو بتاتا چلوں کہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ اس فتنے کی بنیاد ایران میں ایک شخص علی محمد باب نے ڈالی جس سے بابی نام کا فرقہ وجود میں آیا۔ پھر مرزا حسین علی بہا میدان میں آئے جنھوں نے سنتِ محمدی سے انحراف کیا اور اس طرح بہائی فرقہ پیدا ہوگیا۔ برصغیر میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے یہ فتنہ کھڑا کیا اور اسکے چالیس سال بعد حافظ اسلم جیراج پوری نے اس دبی ہوئی چنگاری کو پھر سے ہوا دی۔ آخر میں غلام احمد پرویز نے یہ محاذ سنبھالا۔ یہ صاحب جماعتِ اسلامی کے معاونینِ قلم میں شامل رہے ہیں اور آپکے مضامین مولانا مودودی کے رسالے ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پھر یہ مولانا مودودی سے ناراض ہوکر علیحدہ ہوگئے اور نیا مذہب جاری کردیا۔

۳۔ سورۂ نحل ۶۴۔ ''(اے رسولؐ) ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس غرض سے نازل کی ہے کہ جس جس بارے میں یہ لوگ اختلاف کر چکے ہیں تم اسے ان لوگوں کے لئے کھول کر بیان کردو''۔

سورۂ نحل ۴۴۔ ''اور ہم نے تیری طرف یہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے تا کہ اس میں جو کچھ لوگوں کے لئے نازل ہوا ہے تو انھیں اچھی طرح کھول کھول کر بیان کردے تا کہ وہ غور و فکر کریں''۔

مندرجہ بالا آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نازل کرنے سے اللہ کا واحد مقصد یہ تھا کہ اسکا رسولؐ لوگوں کے سامنے قرآن کے مطالب کو کھول کھول کر بیان کردے اور لوگوں تک اسکی وہ تشریح و تعبیر پہنچا دے جو مقصود و مشیتِ خداوندِ ذوالجلال ہے۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ عام لوگوں میں قرآن کے مطالب کو جاننے کی صلاحیت و استعداد موجود نہیں ہوتی اور اسی لئے انھیں یہ حق بھی نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنی رائے اور اپنے قیاس سے قرآن کی تعبیر و تشریح کرلیا

کریں ۔ یہ کہنا کہ یہ دورِ جہالت کے لوگوں کے لئے تھا اور آج کا انسان جو علمی بلندیوں کو چھو رہا ہے اس حکم سے مستثنٰی ہے اس لئے مسموع نہیں ہوسکتا کہ قرآن کوئی قصہٴ پارینہ نہیں ہے بلکہ قیامت تک نافذ العمل ہے اور اسکے ہر حکم اور ہر فیصلے کا اطلاق قیامت تک آنے والی تمام نسلوں پر ہوتا ہے ۔ جس طرح اس زمانے کے لوگوں میں نہ تو یہ استعداد تھی کہ وہ قرآن کو سمجھ سکتے اور نہ انکو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ ازخود قرآن کی تاویل کریں ۔ بالکل اسی طرح آج کے انسان یا آئندہ آنے والوں میں بھی نہ تو قرآن فہمی کی استعداد پیدا ہوسکتی ہے اور نہ انھیں تفسیر بالرائے کا حق دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں انسان کی خلقی کمزوری مانع ہے چاہے وہ کسی بھی دور کا انسان ہو ۔ یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن اپنے حروف والفاظ کے ساتھ کوئی اور چیز ہے اور اللہ کے رسولؐ نے حکمِ خدا کی بجا آوری کرتے ہوئے عام فہم زبان میں قرآن کی جو تفسیر وتعبیر وتشریح وتاویل بیان فرمائی ہے وہ قرآن سے الگ کوئی دوسری شے ہے اور اسی چیز کو حدیث کہتے ہیں ۔ اب یہ تو عجیب بات ہوگی کہ اللہ تو اپنے رسولؐ کو حکم دے کہ وہ لوگوں کے لئے احادیث بیان کرے تاکہ لوگ ان احادیث میں غور وفکر کریں اور لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ ضرورتِ حدیث ہی کا انکار کردیں اور خلافِ منشاءِ الٰہی یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ اللہ نے بیشک ہمیں طاقت نہ دی ہو لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہم میں یہ طاقت ہے کہ قرآنی مفاہیم کو سمجھ بھی سکیں اور سمجھا بھی سکیں ۔

۴۔ رہی یہ بات کہ ذخیرہٴ احادیث میں بہت سی جھوٹی اور وضعی احادیث بھی شامل کردی گئیں ہیں اور صحیح احادیث کی شناخت کرنا مشکل کام ہوگیا ہے تو یہ بھی کوئی ایسا عذر نہیں جس کی بناپر تمام کی تمام احادیث کو مشکوک اور ناقابلِ قبول قرار دے دیا جائے ۔ اگر سونے میں رانگ یا تانبے کی ملاوٹ ہوگئی ہو تو سونے کو اٹھا کر پھینک نہیں دیا جاتا ۔ ایسے طریقے موجود ہیں جن کے ذریعے کھرا سونا علیحدہ کیا جاسکتا ہے ۔ اسی طرح ایسے طریقے بھی موجود ہیں جن کے ذریعے صحیح احادیث کو

وضعی احادیث سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ جو شخص حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے اور مزاجِ معصومؑ سے آشنائی رکھتا ہے وہ صاف پہچان لے گا کہ کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی غلط۔ اپنی کاہلی اور نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے احادیث کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دینا اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھالینا ایک انصاف پسند انسان کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔

احسن الحدیث کا ماجرا

حدوث۔ احداث۔ حادث۔ حدیث۔ یہ سب ایک ہی مادّے سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں اور ان اشیاء کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جو پہلے وجود نہ رکھتی ہوں اور عدم سے وجود میں آئی ہوں۔ اہلِ علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کی طرف حدوث کی نسبت ہرگز نہیں دی جاسکتی لہٰذا حدیث کی نسبت بھی اللہ کی طرف دینا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ''احسن الحدیث'' اگرچہ بظاہر قرآن کی تعریف ہے لیکن حقیقتاً نطقِ رسولؐ کی تعریف ہے جیسا کہ الحاقہ ۴۰ میں قرآن ہی کے بارے میں ارشاد ہوا۔ ''انّه لقول رسولٍ کریم''۔ (یقیناً یہ (قرآن) عزت دار رسولؐ کا قول ہے)۔

کلام اور قول

کلام اس معنی کو کہتے ہیں جو متکلم کے ذہن میں ہوتا ہے اور جسے وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے جبکہ قول کا تعلق کچھ حروف و الفاظ اور آواز سے ہوتا ہے اور اسکے لئے زبان۔ تالو اور حلق کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر ان چیزوں کے قول وجود میں نہیں آسکتا اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ کے لئے اعضاء تجویز نہیں کئے جاسکتے اسی لئے قرآن مجید کو ہمیشہ ''کلام اللہ'' کہا گیا۔ آج تک کسی ایک نے بھی اسے ''قول اللہ'' نہیں کہا۔ قرآن قراءت سے مشتق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کلامِ خدا ''قرآن'' اسی وقت کہلایا جب وہ زبانِ رسولؐ پر جاری ہوا۔

جو بات سائل کو پریشان کر رہی ہے وہ الفاظ کی مماثلت ہے۔ میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ بعض الفاظ ایسے ہیں جو قرآن میں اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہیں لیکن حدیث کی اصطلاح میں آ کر انکا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ''شہید'' کو لے لیجئے۔ پورے قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اپنے لغوی معنی میں ہی استعمال ہوا ہے یعنی ''چشم دید گواہ''۔ لیکن یہی لفظ جب حدیث میں آیا تو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا اور اب اسکے معنی ہو گئے ''مقتول فی سبیل اللہ''۔ اب اگر کوئی قرآن کے شہید اور حدیث کے شہید کے ایک ہی معنی اخذ کر کے بحث شروع کر دے تو یہ اسکی نادانی ہوگی۔ اسی طرح لفظِ حدیث ہے۔ یہ قرآن میں تقریباً ۲۸ مقامات پر استعمال ہوا ہے اور جہاں بھی استعمال ہوا لغوی معنی میں ہی ہوا۔ حدیث کے لغوی معنی ہیں ''بات''۔ میں اس معاملے میں طوالت سے کام نہیں لے سکتا کیونکہ قرآن کے پڑھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی لفظ جب اصطلاح میں آیا تو اسکے معنی ہو گئے ''قولِ معصومؑ ۔عملِ معصومؑ اور تقریرِ معصومؑ''۔ لہٰذا قرآنی حدیث اور اصطلاحی حدیث میں موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ نساء ۷۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا''۔ (اور گواہی کے لئے اللہ ہی کافی ہے)۔ اب اگر اس آیت کا ترجمہ حدیث کی زبان میں کیا جائے تو کچھ یوں ہوگا کہ ''اپنی راہ میں قتل ہونے کے لئے اللہ ہی کافی ہے''۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جب قتل ہونے کے لئے اللہ ہی کافی ہے تو پھر کوئی اور کیوں قتل ہو؟ اور اس طرح فلسفۂ جہاد سے ہی دست بردار ہونا پڑے گا اور شریعتِ اسلامیہ سے احکامِ جہاد نکالنے پڑیں گے اور اس سے بڑھکر خود قرآن کا منکر ہونا پڑے گا کیونکہ خود قرآن نے ہی جہاد کا حکم دیا ہے۔ عرض صرف اتنی ہے کہ جب ''وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا'' کے ہوتے ہوئے بھی ہم جہاد کرنے کے پابند ہیں تو ''احسن الحدیث'' کی موجودگی میں ہم حدیثِ معصومؑ سے کیونکر بے نیاز ہو جائیں گے؟۔

معنی اور مفہوم

عام طور پر ان الفاظ کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ مختلف الفاظ ہیں اور مختلف معنی رکھتے ہیں۔ معنی کا تعلق بات کرنے والے سے ہوتا ہے یعنی وہ شے جو ایک متکلم الفاظ و آواز کی مدد سے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے جبکہ مفہوم کا تعلق سننے والے سے ہوتا ہے یعنی ان الفاظ سے جو ایک متکلم نے ادا کئے ہیں سننے والے جو مطلب سمجھتے ہیں وہ مفہوم کہلاتا ہے۔ آپ نے محسوس کرلیا ہوگا کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اصل بات وہی ہوتی ہے جو متکلم کے ذہن میں ہوتی ہے۔ مفہوم کا دارومدار سننے والے کی توجہ اور استعداد پر ہوتا ہے۔ ہر سننے والا اپنی اپنی ذہنی اور علمی سطح کے مطابق مفہوم اخذ کرتا ہے۔ اس طرح معنی ہمیشہ ایک ہوتے ہیں اور مفہوم ہزاروں اور اس بات سے بھی آپ یقیناً اتفاق کریں گے کہ بات کرنے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسکی اصل بات لوگوں تک پہنچے نہ کہ وہ اس بات پر راضی ہو جائیگا کہ جس کی سمجھ میں جو آئے اسے ہی بات کرنے والے سے منسوب کردے۔ اگر آپ کے سامنے دس آدمی بیٹھے ہوں اور آپکی بات کو سن کر وہ الگ الگ مفہوم لیں اور اپنا اپنا مفہوم لوگوں سے بیان کرتے پھریں اور ہر شخص اپنے اخذ کردہ مفہوم کو آپ سے منسوب کرے تو لوگوں کی سمجھ میں ہرگز نہیں آئے گا کہ حقیقتاً آپ نے کہا کیا ہے۔ یقیناً قرآن نازل کرنے سے اصل مقصودِ خداوندی یہی تھا کہ اسکے معنی لوگوں تک پہنچیں نہ کہ ہر شخص اپنا اپنا راگ الاپتا پھرے۔ اس نے وحدت و اتفاق کا حکم دیا ہے اور ایک ہی رسی سے متمسک رہنے کو لازم قرار دیا ہے۔ اگر ہر شخص کو یہ حق دے دیا جائے کہ جو کچھ اسکی سمجھ میں آتا ہے وہ اسے ہی قرآن سمجھ لے تو پورے عالمِ اسلام میں انتشار پھیل جائے گا اور اگر مفہوم کو ہی قرآن مان لیا گیا تو پھر کروڑوں بلکہ اربوں قرآن وجود میں آجائیں گے۔ آج جو مسلمانوں میں فرقہ بندیاں ہیں اسکا سبب یہی ہے کہ ہر فرقہ اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے قرآن سے اپنا پسندیدہ مفہوم اخذ کرلیتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے والا

کوئی نہیں ہوتا کہ کس کا اخذ کردہ مفہوم صحیح ہے اور کس کا غلط۔ یقیناً اللہ کا مقصد یہ انتشار پھیلانا ہرگز نہیں ہوسکتا نہ کوئی صحت مند عقل اس خرافات کو قبول کرسکتی ہے۔ جب اللہ نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا حکم دیا ہے اور جبکہ دین اسلام کا اصل ماخذ قرآن ہے تو اس علیم و حکیم سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ اتحاد کا حکم تو دے دے اور اسباب اختلاف کا تدارک نہ کرے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ہر بات کرنے والے کا مقصد اصلی یہی ہوتا ہے کہ وہ اس معنی کو سننے والوں تک پہنچائے جو اسکے ذہن میں ہیں اور اس بات کو یقینی بنائے کہ لوگ اس کی بات کا غلط مفہوم نہ نکال سکیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر ادارے اور ہر حکومت کا ایک ترجمان ہوتا ہے اور کسی بھی ادارے یا حکومت کی وہی بات مستند مانی جاتی ہے جو اسکے ترجمان کی زبان سے ادا ہو۔ ہر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مرضی سے مطلب نکال لے اور نہ کوئی ادارہ یا حکومت ایسی قیاس آرائیوں کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ مقننہ قوانین بناتی ہے تو انکی تعبیر و تشریح کا ذمہ دار عدلیہ کو بناتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شخص ملکی قوانین کی تعبیر و تشریح اپنے مفاد کے مطابق کرلیا کرتا اور اس طرح ایک فسادِ عظیم پیدا ہوجاتا۔ کیا کوئی گمان کرسکتا ہے کہ خالق کائنات اس اصول سے واقف نہ تھا؟۔ اگر قرآن میں اشتباہ پیدا ہوجائے یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو انسان کس کی طرف رجوع کرے گا کیونکہ جس کا یہ کلام ہے اس تک تو ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ لازماً ہر شخص کو سوچنا اور تلاش کرنا پڑے گا کہ اللہ کا ترجمان کون ہے اور پھر اختلاف کی صورت میں اسی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ کوئی کتابی بات نہیں بلکہ تقاضائے عقلی ہے اور مشاہدہ اسکا حکم لگاتا ہے۔ اللہ کا ترجمان کون ہے اسکا تعین بھی ہم خود نہیں کرسکتے کیونکہ یہ اختلاف کا سبب اور اتحاد کو مانع ہوگا۔ ہمیں خود قرآن سے ہی پوچھنا پڑے گا کہ اسکا شارح اور مفسر کون ہے۔ اس سلسلے میں سورہ نحل کی دو آیات پیش کی جاچکی ہیں جن میں اللہ نے عام لوگوں کو نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے رسول کو حکم دیا

ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کرے اور اسکے مطالب کو کھول کھول کر بیان کرے بلکہ قرآن نازل کرنے کا مقصد ہی یہ قرار دیا ہے کہ اسکی تعبیر وتشریح وتفسیر اسکے رسولؐ ہی کی زبانی ہو۔اسی طرح سورۂ جمعہ ۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے امّ القریٰ کے رہنے والوں میں انہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث کیا جو ان پر اسکی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے......الخ۔اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن ہم تک پہنچادے بلکہ یہ بھی اسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف قرآن سنائے بلکہ اسکی تعلیم بھی دے۔کیا یہ سمجھنا کوئی مشکل کام ہے کہ اسی تعلیم کو حدیث کہتے ہیں؟۔اس مطلب پر بہت سی آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم نے صرف اتنا ہی بیان کیا ہے جو سمجھنے کے لئے کافی ہو۔

حدیث کا قرآنی ثبوت

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ حدیث کے اصطلاحی معنی ہیں ''قولِ معصومؑ۔عملِ معصومؑ۔اور تقریرِ معصومؑ''۔قول کی اطاعت کی جاتی ہے اور عمل کا اتباع۔(یہ واضح رہے کہ تقریر بھی ایک عمل ہے یعنی معصومؑ کے سامنے کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے لیکن معصومؑ اس سے منع نہ کرے بلکہ خاموش رہے تو وہ بات یا عمل ہم پر حجت ہے)۔قرآن مجید میں رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے اور اتباع کا بھی لہٰذا حکمِ قرآن پر عمل کرنے کے لئے قولِ رسولؐ بھی موجود ہونا چاہئے اور عملِ رسولؐ بھی ورنہ قرآن کا حکمِ اطاعت واتباعِ رسولؐ بے معنی ٹھہرے گا۔

ا۔نساء ۵۹۔ ''اے وہ لوگوں جو ایمان لا چکے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اولی الامر کی''۔

(ہوسکتا ہے کہ اس مقام پر اللہ کی اطاعت سے کوئی اشتباہ پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اسکا جواب اسی سورۂ نساء کی آیت ۸۰ میں یوں دیا گیا ہے۔ ''جو کوئی

رسول کی اطاعت کرے گا اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی ہے......الخ)

۲۔آلِ عمران ۳۱۔"(اے رسولؐ ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو (پھر) تم کو اللہ بھی دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔

۳۔اعراف ۱۵۷۔"پس وہ لوگ جو اس (رسولؐ) پر ایمان لائے اور جنھوں نے اسکو قوت پہنچائی اور اسکی مدد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اسکے ساتھ ہی نازل ہوا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

(یہ واضح رہے کہ یہاں "نور" سے مراد قرآن نہیں لیا جا سکتا کیونکہ قرآن قول ہے اور قول کی اطاعت کی جاتی ہے نہ کہ اتباع)

مندرجہ بالا آیات سے ثابت ہو گیا کہ محمدؐ و آلِ محمد کی اطاعت بھی فرض ہے اور اتباع بھی اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے اس لئے لازم ہے کہ قیامت تک قولِ معصومؑ بھی باقی رہے اور عملِ معصومؑ بھی تاکہ قرآن کے حکم پر عمل کیا جا سکے۔انہی دو چیزوں یعنی اطاعت و اتباع معصومؑ کا نام حدیث ہے۔پس حدیث کا انکار کرنے والا حقیقتاً خود قرآن کا منکر ہے اور اسے نا قابلِ عمل سمجھتا ہے۔

کیا قرآن لاوارث ہے؟

امتِ محمدؐ نے قرآن کے ساتھ ہمیشہ وہ سلوک روا رکھا ہے جو کسی لاوارث یتیم کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ایسا یتیم جسکے باپ نے ایک بڑی جائیداد چھوڑی ہو اس لئے ہر شخص چاہتا ہو کہ اس بچے کو ہتھیا لے تاکہ جائیداد پر قبضہ ہو سکے۔اپنی دینی قیادت قائم کرنا اور پھر اسکی آڑ میں دنیا کمانا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک قرآن پر قبضہ نہ کیا جائے۔شاید اسی مقصد کے تحت رسول کی زندگی میں ہی "حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ لگایا گیا تھا۔لیکن اس تمام منصوبہ بندی سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا کیونکہ قرآنی حروف و الفاظ بذاتِ خود کسی کو کوئی فائدہ نہیں

پہنچاتے۔قرآن کی مثال تو ذوالفقار جیسی ہے جو صرف اسی وقت معجزہ بنتی ہے جب علیؑ مرتضیٰ کے ہاتھ میں آئے۔قرآن کا بھی یہی حال ہے کہ ع

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

قرآن کے ساتھ بہت کھیل کھیلا جا چکا۔اب لوگوں کو اپنی آنکھیں کھول لینی چاہئیں اور اعتراف کر لینا چاہئے کہ قرآن اکیلا نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوٹ کا مال ہے۔حدیث ثقلین کو سب مانتے ہیں لیکن اس میں بھی "عترتی اہلبیتی" کی جگہ "سنتی" رکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اشتباہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ بازی گری کے لئے میدان کھلا رہے۔مجھے شیعہ علماء سے بھی شکوہ ہے کہ انھوں نے اس حدیث پر ہمیشہ علم رجال کی روشنی میں ہی بحث کی ہے اور کبھی یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ اسکو قرآن کی کسوٹی پر جانچیں اور اسطرح "اہلبیتی" کو ثابت کریں جبکہ قرآن نے تو صاف صاف بتا دیا ہے کہ قرآن لاوارث نہیں ہے بلکہ اسکے وارث موجود ہیں یعنی قرآن کے مالک کچھ اشخاص ہیں جو ناطق ہیں نہ کہ "سنتی" جو کہ ایک بے ارادہ اور صامت شے ہے۔چنانچہ سورۂ فاطر ۳۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔"پھر ہم نے کتاب کا وارث اپنے مصطفیٰ بندوں کو بنایا......الخ۔پس خود قرآن نے ہی حدیث ثقلین کی وضاحت کر دی اور بتا دیا کہ قرآن ورثہ ہے اور اہل بیتؑ اسکے وارث۔آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وارث کو ورثے پر حق ملکیت حاصل ہوتا ہے اور اسکی اجازت کے بغیر اسکی ملکیت تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔اسطرح کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اہل بیتؑ کی اجازت کے قرآن کو ہاتھ بھی لگا سکے کجا یہ کہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے۔جو لوگ بغیر اہل بیتؑ کی اجازت کے قرآن سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں انکی مثال اس نقب زن کی سی ہے جو نقب لگا کر جب اندر پہنچتا ہے تو پولیس کو اپنا منتظر پاتا ہے اور اسطرح اسے حاصل حصول کچھ نہیں ہوتا البتہ جوتے ضرور کھانے پڑتے ہیں لیکن کچھ نقب زن ایسے بے وقوف ہوتے ہیں جو اسی عملِ جوتا خوری کو غنیمتِ علم سمجھتے ہیں اور اسی نسبت سے عالم ہونے کا

دعویٰ کرتے ہیں۔

دوسرا سوال

سائل کو عصمتِ انبیاءؑ کے بارے میں بھی کچھ ابہام معلوم ہوتا ہے اور انکا اصرار ہے کہ قرآن سے عصمتِ انبیاءؑ کو ثابت کیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی میں صرف اس لئے دے رہا ہوں کہ خود شیعہ علماء اس معاملے میں ایک گومگو کی حالت سے دوچار رہیں۔ وہ کہتے کچھ ہیں۔ کرتے کچھ ہیں اور لکھتے کچھ اور ہیں۔ علامہ محمد سبطین سرسوی اعلی اللہ مقامہ کی کتاب کشف الاسرار کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب و غریب انکشافات ہوتے ہیں۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی کتاب تنزیہہ الانبیاء دیکھئے تو کچھ اور ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ اگر سبطین صاحب مرحوم نے اس کتاب پر حاشیہ نہ لکھا ہوتا تو شیعہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

عصمتِ انبیاء کے بارے میں عقلی دلائل ہم اپنی کتاب کشف العقائد میں دے چکے ہیں جنھیں اب دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم قرآن سے عصمتِ انبیاءؑ ثابت کریں گے تا کہ اس فتنے کی سرکوبی ہو سکے اور جو لوگ محض رسمی طور پر اس عقیدے کے قائل ہیں انکے پاس بھی محکم دلائل آسکیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنی پہلی دلیل ''اطاعت'' کو قرار دیتے ہیں۔

اطاعت

قرآن مجید میں اللہ نے کچھ لوگوں کی اطاعت سے منع کیا ہے اور امتناع کا سبب چند خصوصیات کو بتایا ہے جو اطاعت کو مانع ہیں۔ قرآن ہی میں اللہ نے کچھ لوگوں کی اطاعتِ غیر مشروط کا حکم دیا ہے جس سے با آسانی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اللہ نے جنکی اطاعتِ غیر مشروط کو واجب قرار دیا ہے ان میں وہ صفات موجود ہونا محالِ عقلی ہے جو ان لوگوں میں موجود ہوں جن کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے ورنہ تضاد لازم آئے گا۔

جنکی اطاعت سے منع کیا گیا ہے

۱۔ دہر ۲۴۔ ''پس تو اپنے پروردگار کے حکم پر استقلال سے رہ اور ان میں سے کسی گناہگار اور ناشکرے کی اطاعت نہ کر''۔

۲۔ شعراء ۱۵۱۔ ''اور حد سے بڑھنے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو''۔

۳۔ قلم ۱۰۔ ''اور کسی بھی ذلیل اور حلاف کی اطاعت نہ کر''۔

۴۔ کہف ۲۸۔ ''اور نہ اسکی اطاعت کر جسکے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل پایا ہے اور اس نے اپنی ہی خواہش کا اتباع کیا ہوا ہے اور اسکا معاملہ حد سے گذر گیا ہے''۔

مندرجہ بالا آیات میں جن لوگوں کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے انکی خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ گناہگار۔

۲۔ ناشکرا۔

۳۔ حد سے بڑھنے والا (یعنی حدودِ خدا کو توڑنے والا)

۴۔ ذلیل

۵۔ حلاف

۶۔ جسکا دل ذکرِ خدا سے خالی ہو۔

۷۔ جو اپنی خواہشات نفسانی کا اتباع کرتا ہو۔

لہٰذا لازمی ہے کہ اگر اللہ کسی کی اطاعتِ غیر مشروط کا حکم دے تو وہ مندرجہ بالا تمام صفاتِ رذیلہ سے منزہ و مبرّا ہو اور ان صفات کے عدم کا ہی نام عصمت ہے۔

جنکی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے

۱۔ نساء ۶۴۔ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ خدا کے حکم کے بموجب اسکی اطاعت کی جائے''۔

۲۔آل عمران ۳۲۔ ''(اے رسولؐ) کہدو کہ تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو''۔
۳۔نساء ۸۰۔ ''جو کوئی رسول کی اطاعت کرے گا اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی ہے''۔
۴۔نساء ۵۹۔ ''اے وہ لوگوں جو ایمان لا چکے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ اور اولی الامرؑ کی''۔
مندرجہ بالا آیات میں جنکی اطاعت غیر مشروط کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔
۱۔اللہ تعالٰی
۲۔تمام کے تمام انبیاءؑ
۳۔خصوصاً خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیؐ
۴۔اولی الامرؑ
پس یہ لازم ٹہرا کہ یہ سب یعنی اللہ۔تمام انبیاءؑ۔خاص طور پر ہمارے نبیؐ اور اولی الامرؑ ان تمام مذموم صفات سے پاک ہوں جنکی بنا پر اطاعت حرام ہو جاتی ہے۔اللہ نے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ انکی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے تا کہ کسی معمولی سے معمولی اشتباہ کی بھی گنجائش نہ رہے لہٰذا عصمت انبیاءؑ و اولی الامرؑ ثابت ہے۔(اولی الامر کون ہوتا ہے اسکی تفصیل کے لئے ہماری کتاب کشف العقائد کا مطالعہ فرمایا جائے)
اب ہم قرآن مجید کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جو عصمت انبیاءؑ و ائمہؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں:۔
۱۔الحجر ۳۹ تا ۴۲۔ ''وہ (شیطان) بولا اے میرے پروردگار اس وجہ سے کہ تو نے مجھے نا امید کر دیا میں بھی انکے لئے زمین میں (خدا کی نا فرمانی کو) اچھا کر کے دکھاؤں گا اور ضرور میں ان سب کو بہکا دوں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے مخلص ہیں۔(اللہ نے) کہا یہی صراطِ مستقیم ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوائے انکے

جو گمراہ ہونے والوں میں سے تیری پیروی کریں"۔
۲۔بنی اسرائیل ۶۵۔ "یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا"۔
یہ واضح رہے کہ جہاں شیطان کی رسائی نہ ہو وہی مقامِ عصمت کہلاتا ہے۔
۳۔انبیاء ۷۲۔ "اور ہم نے تمام (انبیاءؑ) کو نیکو کار قرار دیا"۔
۴۔انبیاء ۸۶۔ "اور ہم نے انکو اپنی رحمت میں داخل کرلیا تھا یقیناً وہ سب نیکو کاروں میں سے تھے"۔
۵۔صٓ ۴۷۔۴۸۔ "اور وہ یقیناً ہمارے نزدیک مصطفیٰ اور اخیار (نیک) لوگوں میں سے تھے اور تو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا ذکر کر اور یہ سب اخیار (نیک لوگوں) میں سے تھے"۔
۶۔آلِ عمران ۱۶۴۔ "یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جبکہ اس نے انہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث کیا جو انھیں اسکی آیات پڑھکر سناتا ہے اور انکے نفسوں کو پاک کرتا ہے......الخ"۔
یہاں یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ تمام گناہوں کا مرکز نفس ہوتا ہے اور رسولؐ کا فریضہ نفس کو پاک کرنا ہے اور نفس کو وہی پاک کرسکتا ہے جسکا اپنا نفس گناہوں سے پاک ہو بالکل اسی طرح جیسے پانی صرف اسی صورت میں نجس اشیاء کو پاک کرسکتا ہے جبکہ وہ خود پاک ہو۔نجس پانی کسی شے کو پاک نہیں کرسکتا لہٰذا رسولؐ کا ہر ظاہری اور باطنی گناہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔
۷۔نجم ۲ تا ۴۔ "تمھارا ساتھی (محمدؐ) نہ گمراہ ہوا اور نہ بہکا اور وہ اپنی خواہش سے بولتا ہی نہیں۔یہ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر کر دی گئی ہوتی ہے"۔
انسان کی پوری زندگی صرف دو چیزوں پر مشتمل ہے۔قول اور عمل۔رسولؐ کے عمل

کی ضمانت اللہ نے مندرجہ بالا آیات میں دے دی اور اس آیت میں قول رسولؐ پر بھی وحی کی مہر لگا دی۔ اب رسولؐ کی زندگی کا کونسا گوشہ ایسا ہوسکتا ہے جہاں (معاذاللہ) عصیان کا گذر بھی ہو سکے۔

۸۔ بقرہ ۱۲۴۔ "جب ابراہیمؑ کے رب نے اسکا امتحان لے لیا چند کلمات سے تو اس نے انھیں پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا میں تمھیں سب انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا اور میری ذریت میں سے؟ خدا نے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا"۔

اس آیت سے اولادِ ابراہیمؑ کے لئے امامت تا قیامت ثابت ہے لیکن ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ امام صرف وہی ہوگا جو ظالم نہ ہو۔ ظلم عدل کی ضد ہے۔ پس ہر امام کا نقطۂ عدل پر قائم رہنا ضروری ہے اور عدل ہر قسم کے گناہ کو مانع ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے عصمتِ ائمہؑ ثابت ہے کیونکہ جب بھی وہ کوئی گناہ کرے گا اس وقت وہ نقطۂ عدل سے ہٹا ہوا ہوگا اور اس طرح شرطِ امامت ٹوٹ جائے گی۔

۹۔ احزاب ۳۳۔ "ماسوا اسکے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ اے اہلِ بیتؑ وہ تم سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھے اور تمھیں ایسا پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے"۔

"انما" کلمۂ حصر ہے جسکا مطلب ہے "بس اور بس"۔ اور اسکو مدِنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ارادۂ خداوندی اعلانِ طہارتِ اہلِ بیتؑ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صاحبانِ علم واقف ہیں کہ خلقتِ کائنات جتنی ہو چکی اور جتنی آئندہ ہوگی وہ ارادۂ خدا سے ہی ہوگی یعنی مقصدِ خلقتِ کائنات کچھ نہیں سوائے اسکے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ طہارتِ اہلِ بیتؑ کا اعلان کرتا رہے۔ یہ طہارتِ مطلقہ ہے جہاں کسی بھی قسم کی نجاست کی رسائی نہیں خواہ وہ ظاہری نجاست ہو یا باطنی۔ گناہ کوئی بھی ہو نجاست ہوتا ہے لہٰذا یہ آیت عصمتِ مطلقۂ اہلِ بیتؑ کی محکم ترین دلیل ہے۔

اتحاد بین المسلمین

یہ ایک بہت مفید اور بنیادی سوال ہے جسکی اصل عبارت تو خاصی طویل ہے لیکن خلاصہ یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود مسلمانوں میں باہمی اتفاق و اتحاد اور یگانگت پیدا نہیں ہوسکی۔ جب اللہ نے ہمیں متحد رہنے کا حکم دیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ جب ہم کسی سے اسکا مسلک پوچھتے ہیں تو وہ اپنے مذہب کا نام بتاتا ہے۔ اسلام کا ذکر نہیں کرتا؟

سائل کی یہ خواہش قابلِ قدر اور قرین عقل ہے۔ دنیا بھر میں کسی بھی شخص سے پوچھا جائے کہ اتفاق اچھا ہے یا اختلاف تو بلا استثنٰی ہر کوئی یہی جواب دے گا کہ یقیناً اتفاق اچھا ہے۔ جب فطرتِ انسانی اتحاد و اتفاق کا تقاضا کرتی ہے تو خالقِ فطرت کیونکر نہ چاہے گا کہ اسکے بندوں میں اتفاق رہے اور وہ منتشر نہ ہوں۔

اس حد تک میں اپنے کرم فرما سے سو فیصد متفق ہوں لیکن سوال کی نوعیت بتاتی ہے کہ وہ دین و مذہب اور انکے باہمی فرق کا مکمل ادراک نہیں رکھتے لہٰذا پہلے ان چیزوں کی وضاحت ہو جانا چاہئے۔

دین چند عقائد کے مجموعے کا نام ہے لیکن چونکہ قوانین کی طرح عقائد بھی ہمیشہ مجمل ہوتے ہیں اور محتاجِ تاویل و تشریح ہوتے ہیں اس لئے جب تک عقائد کی صحیح تعبیر متعین نہ ہو جائے اس وقت تک دین سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی اسی تاویل و تشریح کا نام مذہب ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے دین کی تفصیل و تشریح و تاویل اپنے بندوں سے چھپالی۔ بلکہ اس نے یہ تفصیل اپنے انبیاء کے سپرد کردی جنکا فریضہ ہی یہ تھا کہ وہ عقیدے کی تاویل و

تشریح لوگوں سے بیان کریں تا کہ دین کے بارے میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ اگر مسلمان اپنے نبی کی بیان کردہ تفصیل و تشریح کو جوں کا توں قبول کر لیتے تو نہ تو کسی اختلاف کا امکان باقی رہتا اور نہ کوئی جواز۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا اور یہ بات صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر امت کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے اور اسکا سبب وہ تخلیقی کمزوریاں ہیں جو انسان کے وجود کا حصہ ہیں۔ انسان اقتدار کا بھوکا ہے۔ زر و مال کا حریص ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے اور ہمیشہ زندہ رہنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ وہ ایک نیا مکتبِ فکر ایجاد کرے تا کہ اسکے نام لیوا ہر زمانے میں موجود رہیں اور اسطرح اسکا نام بھی لوحِ دنیا سے محو نہ ہونے پائے۔

دین اور مذہب کی جو وضاحت بیان کی گئی اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر مذہب کے دین کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ ہر مسلمان اللہ و رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے لیکن اگر آپ ایک عام سروے کریں اور انفرادی طور پر ہر مسلمان سے بات کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہر مسلمان کا خدا بھی الگ ہے اور رسول بھی کیونکہ فکرِ انسانی کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ جب ایک مرتبہ آدمی مرکز سے ہٹ جائے تو پھر ہر شخص اپنی اپنی استعدادِ عقلی اور سطحِ ذہنی کے مطابق ہی عقائد کی تشریح و تعبیر کرے گا اور اسطرح خود بخود نئے نئے مذاہب ایجاد ہوتے رہیں گے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میرا کوئی مذہب نہیں ہے اور میں صرف مسلمان ہوں وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہے کیونکہ اسلام ایک دین ہے اس لئے محتاجِ تشریح و تعبیر بھی ہے لٰہذا مذہب کے بغیر اسلام کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔

اب یہ بات محتاجِ دلیل نہیں رہی کہ اختلافات ہمیشہ مذہب پر ہوتے ہیں دین پر نہیں۔ دنیا کا ایک بھی مسلمان دینِ اسلام سے انکار نہیں کرتا۔ اسطرح نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے مسلمانوں میں دین پر کوئی

اختلاف نہیں۔اگر اختلاف ہے تو مذہب پر ہے لہٰذا دینی اعتبار سے روزِ اول سے لیکر آج تک تمام مسلمان متحد ہیں اور جو لوگ پہلے ہی متحد ہوں انکو اتحاد کی دعوت دینا ایک احمقانہ سوچ ہے۔ ہاں اگر اتحاد کی ضرورت ہے تو مذہب پر ہے اور وہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب تمام مسلمان کسی ایک مذہب پر اتفاق کرلیں جو عملاً ناممکن ہے اس لئے جان لینا چاہئے کہ "اتحادِ بین المسلمین" ایک دل خوش کن نعرے کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مذہب پر اتحاد کیسے ہو؟

اللہ نے انسان کے لئے کوئی حجت باقی نہیں چھوڑی چنانچہ اگر اللہ نے مسلمانوں کو اتحاد کا حکم دیا تو وہ طریقہ بھی بتادیا جس سے حقیقی اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔ساری دنیا جانتی ہے کہ دین کا تعلق نبی سے ہوتا ہے اور مذہب کا تعلق امام سے ہے۔ نبی پر مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے دین پر بھی کوئی اختلاف نہیں۔امام پر چونکہ امت کا اختلاف ہے اس لئے مذہب پر بھی اختلاف ہے۔اگر اللہ امام کی نشاندہی نہ کرتا تو پھر تو امت کو بری الذمہ قرار دیا جاسکتا تھا لیکن اس نے جب اتحاد کا حکم دیا تو فرمایا۔"اور اللہ کی رسی (حبل اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقہ فرقہ نہ ہوجاؤ"۔(آلِ عمران ۱۰۳)۔اب یہ ذمہ داری مسلمانوں کی تھی کہ حکمِ خدا کی اطاعت کرتے اور اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وہ اس بات کی جستجو کرتے کہ "اللہ کی رسی (حبل اللہ)" سے کیا مراد ہے کیونکہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا تمام تر دارومدار اسی پر ہے۔یہ بھی طے ہے کہ اس رسی کو متفق علیہ ہونا چاہئے ورنہ بہت سی رسیاں ہونے کی صورت میں اتحاد نہ ہوسکے گا۔پس معلوم ہوا کہ سارے اختلافات کی بنیاد "حبل اللہ" کی عدم معرفت ہے۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کسی شے سے تمسک کا حکم دے اور یہ نہ بتائے کہ وہ شے ہے کیا۔لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ

مسلمانوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اللہ نے اپنے نمائندوں کے ذریعے ''حبل اللہ'' کا کیا مطلب بتایا ہے۔انھوں نے انکی طرف رجوع کرنے کے بجائے خود کو ہی مسندِ قضاء پر جلوہ افروز فرمالیا اور ہر پگڑی اور عبا و قبا والے نے یہ طے کرلیا کہ احکام خدا کی تعبیر و تشریح کرنا اسکا پیدائشی حق ہے اور کشمکشِ اقتدار کا منطقی نتیجہ وہی ہوسکتا تھا جو آج اختلاف در اختلاف کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔حالت یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی روح تو کہیں نظر نہیں آتی لیکن آپس میں دست و گریباں ہونا۔ایک دوسرے کو گالیاں دینا۔کافر کہنا اور قتل کرنا فرمانِ امروز بن چکا ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' کے بمصداق ساری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب آج بھی دیکھے جارہے ہیں اور شاید اسی کو اسلام کا مقصد قرار دیا جارہا ہے۔اس موقعہ پر یہ ناانصافی ہوگی اگر میں جناب سید شاہد زعیم فاطمی کی کتاب ''سیدنا علیؑ ابنِ ابی طالبؑ اور انکے سیاسی حریف'' کے صفحہ ۵۰ سے ایک خوبصورت اقتباس پیش نہ کروں۔فاطمی صاحب فرماتے ہیں:۔

''یہودیوں نے کہا تھا ''نحن ابناء اللہ و احباءہ'' (ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور ہم اللہ کے پیارے ہیں)۔یہی دعویٰ آج اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں کے نوکِ زبان پر ہے۔ خدا نے انکو ہسپانیہ کے مرغزاروں سے ذلیل و خوار کرکے نکالا لیکن انکی شانِ محبوبیت میں فرق نہیں آیا۔خدا نے انکو صلیبی جنگوں کے ہزار صد سالہ خطرناک دشمن کی چیرہ دستیوں کا نخچیر بنادیا لیکن یہ پھر بھی ''خیر امتہ'' (بہترین امت) کا طغرائے امتیاز گلے میں ڈال کر دندناتے پھر رہے ہیں۔انکی سلطنتوں کا شیرازہ درہم برہم کردیا گیا۔ذلت و مسکنت ان پر طاری کردی گئی اور دنیا کی حقیر قومیں انکے ساتھ وہ کھیل کھیلنے لگیں جو بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے مگر انکی آن میں فرق نہیں آنے پایا۔مسلمانوں کا سب سے بڑا ہتھیار نعرۂ تکبیر ہے۔ہلاکو خاں نے انکی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر انکے نعرۂ تکبیر کی گھن گرج قائم رہی۔بنی

اسرائیل کے لئے تو ایک ہی بخت نصر کافی ہوگیا تھا مگر انکی ضیافت طبع کے لئے بیشار بخت نصر اٹھے جنھوں نے دل کھول کر انکی عزت و آبرو لوٹی مگر صاحب! نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اور پتہ نہیں کس گارے سے انکی فطرت کا خمیر اٹھا ہے کہ انکے دم خم بدستور قائم ہیں۔ شکست کھا کر خود کو فاتح سمجھنا اور پٹ کر بھی احساسِ فتح مندی کے نشے میں بدمست رہنا خدا کے ان لاڈلوں کی خاص ادا ہے۔ زیاں کاری میں سودمندی کا سرور اور محکومیت کو محبوبیت کا رنگ دینا کوئی ان حرماں نصیبوں سے سیکھے۔ کیا سکندر کا نصیب ان لوگوں نے پایا ہے اور کیا بختِ جواں انکے حصہ میں آیا ہے"۔ (اقتباس ختم ہوا)۔

غالباً یہی "فساد فی سبیل اللہ" اور دنیا بھر کو فتح کرنے کا خواب ہے جو بادل ناخواستہ ان موقعہ پرستوں کی زبانوں سے اتحاد بین المسلمین کا نعرہ بلند کروا رہا ہے ورنہ حقیقیت یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں۔ اور یہ سنجیدہ ہو بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ اگر کہیں مسلمانوں میں اتحاد ہو گیا تو انکی اپنی اپنی دینی قیادتوں کا کیا بنے گا؟ لیکن ہاں۔ کچھ سادہ لوح ایسے ضرور ہیں جو سنجیدگی سے اس بارے میں سوچتے ہیں اور مسلمانوں کے باہمی افتراق کو دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر واقعی یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتحاد ہو جائے تو انکا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ملاؤں سے اپنی جان چھڑائیں اور بالکل غیر جانبداری کے ساتھ "حبل اللہ" کی تلاش شروع کریں کیونکہ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جسکی مدد سے مسلمانوں میں اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔

حبل اللہ کون ہے؟

اس سے مراد اللہ تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ "حبل" مضاف ہے اور "اللہ" مضاف الیہ۔ اس لئے یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس سے مراد رسول بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ رسولؐ پر تو پہلے ہی سارے مسلمانوں کا اتحاد ہے اسکے باوجود اختلاف ہے کہ رفع ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اسی طرح اس سے مراد قرآن اور

کعبہ بھی نہیں ہوسکتے اس لئے کہ ان دونوں پر مسلمانوں کا مکمل اتفاق بھی فرقہ بندیوں کا تدارک نہیں کرسکا۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور ہی شے ہے جس سے یا تو نظر چرائی جارہی ہے یا پھر اسکی کھوج ہی نہیں لگائی جارہی۔ اگر مسلمانوں کے پاس اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ جانیں اور انکے محدثین۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مذہب حقۂ شیعہ اثناء عشری کے پاس جبل اللہ کے بارے میں نصِ صریح موجود ہے جو آپکے لئے ہدیہ کی جارہی ہے۔

۱۔ تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ جبل اللہ آلِ محمدؐ ہیں جنکے ساتھ اعتصام کرنے کا حکم خداوند عالم نے دیا ہے۔

۲۔ اسی تفسیر میں امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں کہ جبل اللہ سے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ مراد ہیں۔

۳۔ امالی میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ہم جبل اللہ ہیں۔

لوگ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ انکی چودھراہٹ بھی قائم رہے۔ آلِ محمدؐ سے جان بھی چھوٹی رہے اور اسکے بعد اگر اتحاد ہوسکتا ہے تو ہوجائے۔ لیکن اللہ نے اپنی حجت نا تمام نہیں چھوڑی۔ اللہ کی رسی کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دامن میں سوائے ''رسہ کشی'' کے اور کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ اسی رسی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت رب العزت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں ارشاد فرماتا ہے۔ ''پس جو شخص طاغوت سے کفر اختیار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایسی مضبوط رسی کو تھام لیا ہے جسکے لئے ٹوٹنا ہے ہی نہیں''۔

اس آیت کی تفسیر میں صافی صفحہ ۷ پر حضرت رسول خداؐ فرماتے ہیں۔ ''جو کوئی یہ چاہے کہ وہ ایسی رسی کو پکڑے جو کبھی نہ ٹوٹے تو اسے چاہئے کہ میرے بھائی اور میرے وصی حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت سے تمسک کرے اس لئے کہ جو شخص علیؑ سے محبت اور تولا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک نہیں ہونے دیگا اور جو

اس سے بغض رکھے گا اسے نجات نہ دے گا''۔اس آیت سے جہاں اللہ کی رسی کی مزید توضیح ہو جاتی ہے وہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کی نگاہ میں انسان مومن صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ علیؑ اور اولادِ علیؑ سے تمسک رکھتا ہو بصورتِ دیگر وہ طاغوت کا پجاری ہے۔ میں عرض کردوں کہ تمسک کے معنی محبت اور اطاعت کے ہیں لہٰذا ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانا چاہئیں جو دعوے تو بڑے لمبے چوڑے کرتے ہیں مگر عملاً اہلِ بیتؑ کی اطاعت کو چھوڑ کر ہرایرے غیرے کا دامن تھامے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انکے اعمال کی قبولیت کا دارومدار انہی ایروں غیروں پر ہے نہ کہ محبت و اطاعتِ اہل بیتؑ پر۔

آپ جان گئے کہ حبل اللہ سے مراد امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ اور انکی ذریتِ طاہرہ ہی ہے اور از روئے قرآن اگر مسلمانوں میں اتحاد ہو سکتا ہے تو اسکے لئے نقطۂ اتحاد فقط اور فقط ولایتِ امیر المومنینؑ و ائمہ طاہرینؑ ہی ہو سکتی ہے۔ان سے ہٹ کر اتحاد کی کوشش کرنا قرآن سے ضد باندھنا اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔تو پھر کیا کہا جائے ان شیعہ مولویوں کو جو اس نام نہاد اتحاد کی خاطر خود ولایت علیؑ کو ہی قربان کر دینے کو تیار ہیں؟ اور جو ٹی وی پر آکر دنیا بھر کے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ شیعوں کا کلمہ وہی ہے جو باقی مسلمانوں کا ہے۔علی'' ولی اللہ تو وہ محض تبرکاً کہتے ہیں جسے بوقتِ ضرورت ترک بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان القاب کی متحمل نہیں ہو سکتی جو اللہ نے ان مولویوں کے لئے قرآن میں مختص کر رکھے ہیں مگر ان ہوشیاروں کو کم از کم ایک بار تاریخ پر تو نظر ڈال لینا چاہئے تھی اور اس بات کا ادراک کر لینا چاہئے تھا کہ اگر لاالٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ پر اتحاد ممکن ہوتا تو کبھی کا ہو چکا ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود زمانہ حیاتِ پیغمبرؐ سے لیکر آج تک کوئی ایک دن

بھی ایسا نہیں گذرا جب اس کلمے کی بنیاد پر مسلمان متحد ہو سکے ہوں۔ مگر یہ اقتدار کے پجاری دنیاوی مفاد کی خاطر اپنا ایمان اور عقیدہ تک قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ لوگ کربلا میں ہوتے تو نظریۂ ضرورت کے تحت یزید ملعون سے بھی اتحاد کرنے میں دیر نہ لگاتے کیونکہ کلمتین تو بہر حال وہ بھی پڑھتا تھا۔

پس چہ باید کرد

پھر آخر کیا کیا جائے؟۔ کیا مسلمانوں کو اسی طرح دست و گریبان رہنے دیا جائے؟۔ یہ بات تو وہی لوگ سوچ سکتے ہیں جنکا پیشہ ہی مسلمانوں کو آپس میں لڑانا ہے لیکن اتنا جان لینا چاہئے کہ اسکے لئے اتحاد کا لفظ استعمال کرنا دانشمندی نہیں کیونکہ یہ ایک ناممکن العمل نظریہ ہے اور کسی ناممکن العمل چیز کا پرچار کرنا انہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو حقیقتاً وہ کام کرنا ہی نہ چاہتے ہوں۔ ہاں ''جیو اور جینے دو'' کی بنیاد پر ایک سمجھوتہ ضرور ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہئے جسکے رہنما اصول رواداری۔ مذہبی آزادی۔ عدم جارحیت اور عدم مداخلت ہوں اور یہ کام تمام فرقوں کے مخلص دانشور ہی مل بیٹھ کر کر سکتے ہیں۔ یہ ذمہ داری مولویوں کے سپرد ہرگز نہیں کی جاسکتی کیونکہ مولوی کا تو کاروباری مفاد اسی بات میں ہے کہ مسلمان ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں اور یہ بات تاریخ نے اچھی طرح ثابت کر دی ہے۔

معرفتِ عمل

عمل ایک ایسی چیز ہے جسکے بغیر نہ دنیا کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ آخرت کا۔زیرِ نظر سوال اسی حوالے سے کیا گیا ہے جو یہ ہے:۔

''میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں کیونکہ آپ نے قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے کہ نجات کا دارومدار صرف اور صرف ایمان پر ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن میں بیشتر مقامات پر اللہ نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے تو ساتھ ساتھ عمل کی بھی شرط لگائی ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں گے؟''

یہ سوال اتنا قیمتی ہے کہ اگر یہ مجھ تک نہ پہنچتا تو یہ کتاب لکھنے کا مقصد ہی ادھورا رہ جاتا کیونکہ عمل کی عدم معرفت ہی وہ شے ہے جسکی وجہ سے شیاطین کو یہ موقعہ ملتا ہے کہ وہ عقیدے یعنی ایمان میں رخنہ ڈالیں اور رفتہ رفتہ انسان کو ایک روبوٹ بنا دیں اور اسے ایسے افعال میں مشغول کر دیں جنکی مثال ایک جسدِ بے روح کی سی ہو۔لہذا یہ ہمارا دینی فرض بنتا ہے کہ اس سوال پر ضروری توجہ دیں۔ہم انشاءاللہ آپکے لئے ایمان بھی بیان کریں گے اور اسکی اقسام وخصوصیات بھی۔ہم مومن کا بھی تعارف کرائیں گے اور اسکے خصائص کا بھی۔ہم عمل کی بھی تفصیلات بیان کریں گے اور اسکی حقیقت بھی۔

ایمان کی تعریف

ہر شے اپنی تعریف سے پہچانی جاتی ہے اس لئے ایمان کے بارے میں جاننے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اسکی تعریف تلاش کرنا ہوگی اور اسکے لئے ہم عالمِ تشیع کی معتبر ترین کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

۱۔اصول کافی ۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۴۴۔حدیث ۱۔
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔''ایمان نام ہے زبان سے اقرار۔دل سے اعتقاد اوراعضاء سے عمل کرنے کا''۔
۲۔نہج البلاغہ قول ۲۲۷۔جناب امیرؑ نے فرمایا۔''ایمان دل سے پہچاننا۔زبان سے اقرار کرنا اوراعضاء سے عمل کرنا ہے''۔
۳۔کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۶۴۔جناب امیرؑ نے فرمایا''ایمان اقرار بالمعرفت کا نام ہے۔اسلام محض اقرار کا نام ہے''۔
۴۔اصول کافی ۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۴۲۔حدیث ۲۔
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔''ایمان اقرار اور عمل دونوں کا نام ہے اوراسلام اقرار ہے بلا عمل کے''۔
۵۔اصول کافی ۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۴۶۔حدیث ۱۔
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔''ایمان کل عمل ہے اورقول اسکا ایک جزو ہے''۔
۶۔اصول کافی ۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۴۲۔حدیث ۳۔
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔''ایمان نہیں ہوتا مگر عمل سے ۔عمل اسکا جزو ہے ۔بغیر عمل ایمان ثابت ہی نہیں ہوتا''۔
۷۔حق الیقین (اردو) ج ۲ صفحہ ۲۴۰۔''احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ اصل ایمان ایک قلبی امر ہے اور دل کے اعمال سے ہے''۔
مندرجہ بالا احادیث سے کم از کم پانچ باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔
۱۔ایمان کوئی مفرد شئے نہیں ہے بلکہ تین چیزوں سے مرکب ہے جن میں سے اگر کسی ایک کو بھی ترک کردیا جائے تو آدمی کافر ہوجاتا ہے۔
۲۔ایمان کل کا کل (تمام کا تمام) عمل ہے۔
۳۔بغیر عمل کے ایمان ثابت ہی نہیں ہوتا۔
۴۔ایمان ایک قلبی عمل ہے اور یہ عمل ایسا ہے کہ انسان کے چہرے۔اسکے اعضاء

اور اسکی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا ہے۔

۵۔معرفت شرطِ ایمان ہے۔

اب معرفتِ عمل کی طرف ہمارا سفر شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے ہم اس بات پر تدبر کرتے ہیں کہ آخر وہ عمل کونسا ہے جو جزوِ ایمان ہی نہیں بلکہ عینِ ایمان ہے اور جسے اگر ایک لمحے کے لئے بھی ترک کر دیا جائے تو انسان کافر ہو جائے۔ یہ تو ایک کم عقل سے کم عقل انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس عمل سے مراد ظاہری اعمال مثلاً نماز و روزہ و حج و زکوۃ وغیرہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اول اس لئے کہ ایمان کا ہر لمحہ آپ کے ساتھ رہنا لازمی ہے جبکہ یہ ظاہری اعمال ہمہ وقت آپکے ساتھ نہیں رہتے نہ انکے عدم سے کفر لازم ہوتا ہے۔ دوئم اس لئے کہ اگر یہ اعمالِ ظاہری ہی وہ عمل ہوتے جو عینِ ایمان ہے تو پھر اصول و فروع کو جدا جدا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور نہ ہی ان دونوں کی تعاریف الگ الگ ہوتیں۔ علامہ حلیؒ احسن العقائد صفحہ ۱۱۵ پر فرماتے ہیں (یہ ایک جملہ ہے لیکن میں نے آپکی آسانی کے لئے اسے دو الگ الگ جملوں میں لکھا ہے):۔

۱۔اصولِ دین وہ ہیں جن پر دین کی بنیاد قائم ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دیا جائے تو اصل دین ہی ختم ہو جائے (اصولِ دین ہی کو ایمان کہا جاتا ہے)۔

۲۔فروع کچھ افعال و اعمال کا نام ہے جنکے ترک کرنے سے اصلِ دین ختم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ جس عمل کو عین ایمان کہا گیا ہے وہ ایسا عمل ہے جس پر دین کی بنیاد قائم ہے اور جسکے ترک کر دینے سے آدمی فوراً دین سے خارج ہو جاتا ہے اور فروعِ دین (اعمالِ ظاہری) اس عمل کے علاوہ ایک علیحدہ واجب ہے جسکے ترک کرنے سے انسان دین سے خارج نہیں ہوتا۔

ترکِ عمل

اتنا تو بہر حال ثابت ہو گیا کہ اس عمل سے جو عین ایمان ہے یہ اعمال ہرگز مراد نہیں ہیں جو فروع دین کے اجزاء ہیں اور جنکا تعلق اصلاحِ بدن۔ اصلاحِ معاشرت اور اصلاحِ معیشت سے ہے نہ کہ آخرت سے۔اسی لئے علامہ رشید ترابی اعلی اللہ مقامہ اپنی کتاب ''طبِ معصومینؑ'' کے صفحہ۹ پر فرماتے ہیں۔

''احکام شریعت تک لئے ہم کو ارشاد ہوا کہ یہ سب دنیا میں صحت انسانی کے قیام کے لئے ہیں ورنہ معرفتِ الٰہی ان تمام قیود وعبادات سے منزہ ومبرا ہے۔حکم نماز و روزہ جسمِ انسانی کی اصلاح سے متعلق ہے۔ادائے حقوق اور زکوٰۃ وخمس کے احکام اصلاحِ مال کے لئے مفید ہیں۔جہاد اپنے حقوق کی بقا اور مذہب حقہ کی علم داری کا قیام ہے''۔اگر یہ اعمال وہی عمل ہوتے جو جزوِ ایمان ہے تو اللہ کبھی یہ گوارا نہ کرتا کہ یہ ایک لمحے کے لئے بھی ہم سے جدا ہوں لیکن جب ہم حقیقتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کچھ اور ہی منظر نظر آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حالات میں اللہ ان اعمال کی بجا آوری سے زیادہ انکے ترک کو ترجیح دیتا ہے چنانچہ اصولِ کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۵۹ کی چوتھی حدیث میں امام محمد باقرؑ ایک حدیث قدسی بیان کرتے ہیں جس میں اللہ فرماتا ہے۔''میرے مومن بندوں میں کچھ ہیں جو میری عبادت میں اپنے نفسوں کو تعب میں ڈالتے ہیں لہٰذا ایک رات یا دو رات کے لئے میں ان پر نیند مسلط کر دیتا ہوں اپنے رحم وکرم کی وجہ سے جو اس پر ہے اور اسکی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے۔پس وہ صبح تک سوتا رہتا ہے۔پھر بیدار ہوتا ہے دراں حالیکہ اپنے نفس سے ناخوش ہوتا ہے اور اسکو ملامت کرتا ہے۔اور اگر میں اسکو عبادت جاری رکھنے پر چھوڑ دوں تو اس سے خود پسندی آجائے گی جو اسکو فریفتہ کر دے گی اسکے اعمال پر۔پس اسکا اپنے اعمال پر فریفتہ ہونا اور اپنے نفس سے راضی ہو جانا اسکے لئے باعثِ ہلاکت ہوگا

اور وہ گمان کرنے لگے گا کہ وہ اپنی عبادت میں عابدوں پر فوقیت لے گیا ہے''۔اسی طرح اصول کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۳۲۲ کی حدیث ۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے ایک شخص نے کہا ''میں آپ پر فدا ہوں۔ میں ایک عرصے سے ایک گناہ کیے چلا جا رہا ہوں۔چاہتا ہوں کہ اسے چھوڑ کر اسکی ضد کی طرف رجوع کروں لیکن اس پر قابو نہیں پاتا''۔فرمایا۔''اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو بیشک اللہ تجھے دوست رکھتا ہے اور اس نے اپنی مصلحت سے اس طرف نہیں آنے دیا ہوگا کہ مبادا تجھ میں خود پسندی نہ آجائے جو بدترین گناہ ہے''۔ان دونوں احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات اللہ اپنے بندوں کی بہتری کے لئے ان سے خود ہی ترک عمل کراتا ہے لہٰذا یہ عمل ہرگز ہرگز جزوِ ایمان نہیں ہوسکتا۔

خود پسندی

اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس عمل کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی عجز و انکسار و شرمساری کی ہے کیونکہ وہ مفضول کی خاطر افضل کو ترک نہیں کراسکتا۔اس سلسلے میں ہم چند اور احادیث پیش کرتے ہیں تا کہ بات واضح ہو جائے۔

۱۔ اصول کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۲۵۳۔حدیث ۱۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''اللہ جانتا ہے کہ مومن کا گناہ اسکی خود پسندی سے بہتر ہے۔اگر ایسا نہ ہوتو مومن گناہ میں کبھی مبتلا ہی نہ ہو۔

۲۔ اصول کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۲۵۳۔حدیث ۴۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''ایک شخص گناہ کرتا ہے پھر اس پر نادم ہوتا ہے۔پھر کوئی اور عمل کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے اور خود پسندی اس سے ظاہر ہوتی ہے۔پس اگر وہ اپنے عمل سے پہلے والے حال پر قائم رہتا تو اس موجودہ حال سے بہتر تھا''۔

۳۔نہج البلاغہ قول ۴۶۔جناب امیرؑ نے فرمایا۔''وہ گناہ جسکا تمھیں رنج ہو اللہ کے نزدیک اس نیکی سے کہیں اچھا ہے جو تمھیں خود پسند بنادے''۔

۴۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۱۶۳۔حدیث ۳۔امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔''بنی اسرائیل کا ایک شخص چالیس سال سے عبادت کر رہا تھا۔پھر اس نے قربانی کی جو قبول نہ ہوئی۔اس نے اپنے نفس سے کہا کہ جو کچھ ہوا تیری وجہ سے ہوا۔گناہ تیرا ہی ہے۔خدا نے اسے وحی کی کہ تیرا اپنے نفس کی مذمت کرنا افضل ہے تیری چالیس سالہ عبادت سے''۔

جو عمل جزوِ ایمان ہے اسکی تلاش کرنے سے پیشتر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے دونوں قسم کے اعمال کے درمیان ایک حدِ تمیز قائم کی جائے۔

ذکرِ جلی اور ذکرِ خفی

ان اعمال کو جنکا تعلق فروعِ دین سے ہے''ذکرِ جلی'' کہا جاتا ہے اور اسکا تعلق مادّیت سے ہوتا ہے اور ان اعمال کو جنکا تعلق روح اور قلب سے ہوتا ہے ''ذکرِ خفی'' کہا جاتا ہے جسکا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ ادیان اور ان ادیان کے ماننے والے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے جنھوں نے اصلِ دین ذکرِ جلی کو ہی سمجھ لیا اور روحانیت سے خالی رہے۔دنیا میں ہزاروں ادیان نے جنم لیا اور فنا ہو گئے۔آج تاریخ میں انکا نام و نشان تک نہیں ملتا۔اسکے برخلاف وہ ادیان باقی رہے جو روحانیت کے حامل تھے اگر چہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہوں۔مسلمہ امر ہے کہ عوام اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔آج جو آپ دیکھتے ہیں کہ سعودی عرب کی بڑی آبادی وہابی مذہب کی پجاری ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ سے وہابی ہی تھے؟۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جب آلِ محمد ابن عبدالوہاب اور آلِ سعود میں یہ معاہدہ ہو گیا کہ سیاسی اقتدار آلِ سعود کے پاس

رہے گا اور دینی اقتدار آلِ محمد ابن عبدالوہاب کے پاس اور اس طرح جب حکومت آلِ سعود کے قبضے میں آ گئی تو پورا سعودی عرب وہابی ہوگیا۔ اسی طرح ایران کی مثال لے لیں۔ وہاں شیعہ آٹے میں نمک کے برابر تھے اور شیعہ دشمنی عروج پر تھی لیکن جیسے ہی صفوی خاندان برسرِاقتدار آیا تو چونکہ شاہانِ صفوی کا مذہب شیعہ تھا اس لئے کچھ ہی عرصے میں پورا ایران شیعہ ہوگیا۔

لیکن اب میں ایک ایسی تاریخی مثال پیش کرتا ہوں جس سے مندرجہ بالا مسلمہ اصول کی نفی ہوتی ہے۔ عرب کے مسلمانوں میں سے کچھ لوگ نقلِ مکانی کر کے دوسرے ممالک میں پہنچے۔ ایک گروہ مغرب کی طرف گیا اور دوسرا مشرق کی طرف۔ مسلمانوں کی اگر کوئی طویل ترین حکومت ہوئی ہے تو وہ اسپین میں ہوئی ہے جو ساڑھے آٹھ سو سال پر محیط ہے۔ ساڑھے آٹھ سو سال کی مدت ایک بڑی مدت ہوتی ہے۔ اس عرصے میں تو اسلام کو اسپین میں جڑیں پکڑ لینی چاہئے تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب تک مسلمان برسرِ اقتدار رہے تب تک بظاہر وہاں اسلام بھی تھا اور مسلمان بھی۔ لیکن جیسے ہی مسلمانوں کی حکومت کو زوال آیا تو آج یہ حالت ہے کہ اسپین میں ایک بھی مسلمان نظر نہیں آتا۔ آخر یہ ساڑھے آٹھ سو سال کی حکومت کا اثر کیا ہوا؟۔ اسکے برخلاف مشرق میں چاہے حکومت کسی کی بھی رہی ہو لیکن آج تک اسلام بھی باقی ہے اور مسلمان بھی۔ اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں جو مسلمان گئے وہ بنی امیہ تھے اور دشمنانِ علیؑ تھے اور جو علیؑ کا دشمن ہو اسکے پاس روحانیت کا کیا کام؟۔ اس لئے چونکہ اسپین پر حکومت کرنے والوں کے دامن میں صرف ذکرِ جلی یعنی ظاہری عبادات۔ پوجا پاٹ اور مادیت تھی۔ روحانیت نہیں تھی اس لئے اتنی طویل حکومت کے باوجود وہاں اب اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہیں کیونکہ وہاں اس تمام عرصے میں لوگوں کو محض ظاہری عبادات میں مشغول رکھا گیا اور روحانیت سے بے بہرہ۔

اس لئے حکومت یا مذہب کی تبدیلی سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ انھیں تو فقط

پرستش کا نشہ پورا کرنا ہوتا تھا سووہ آج بھی کر رہے ہیں۔طریقہ کوئی بھی سہی۔ اسکے برخلاف مشرق کی طرف جو مسلمان آئے وہ محبانِ علی تھے اوراپنے ساتھ روحانیت لیکر آئے تھے اس لئے انکے ذریعے جو اسلام پھیلا وہ آج تک باقی ہے اور وہ اسلام حکومت واقتدار کا تابع نہیں ہے۔حکومت چاہے انگریز کی ہو یا ہندو کی۔مسلمان تب بھی باقی رہے اور آج بھی باقی ہیں۔لہٰذا ذکرِ جلی جسکا تعلق مادّیت سے ہوتا ہے وہ ہمیشہ دنیاوی اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتا رہتا ہے جبکہ ذکرِ خفی جسکا تعلق روح اور قلب سے ہوتا ہے وہ قائم رہنے والا ہوتا ہے اور نجات صرف اسی شے پر ہوسکتی ہے جو قائم رہنے والی ہو۔بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ رنگ بدلنے والی چیز پر نجات کا دارومدار ہرگز نہیں ہوسکتا۔

مجاز اور حقیقت

یہ ایک کلیہ ہے کہ مجاز بذاتِ خود اصل مقصد نہیں ہوتا بلکہ حقیقت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ تخلیقِ کائنات کی بنیاد محبت ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا۔''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔مجھے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے ایک خلق کو خلق کیا''۔اسی محبت کے گرد پورا نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے اور اسی لئے ارشاد ہوا۔''(اے رسولؐ) کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت (کرنے کا دعویٰ) کرتے ہو تو میرا اتباع کرو پھر خود اللہ تم سے محبت کرے گا''۔یہاں چونکہ بات محبت سے شروع ہو کر محبت پر ہی ختم ہو رہی ہے اس لئے اتباع سے مراد محبت میں اتباع ہوگا نہ کہ دیگر چیزوں میں اور مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہو تو ان سے محبت کرو جن سے میں محبت کرتا ہوں اور ان سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم حبیب سے محبوب بن جاؤ گے اور اسی لئے اجرِ رسالت بھی محبت کو ہی قرار دیا گیا ہے۔یہ حقیقی محبت ہے جو مطلوب ومقصودِ خداوندی ہے لیکن اس حقیقی محبت تک پہنچنے کے لئے اللہ نے ہمیں مجازی محبت کا ذائقہ چکھایا تا کہ ہم محبت کی مختلف کیفیات سے آشنا

ہوسکیں اور پھر حقیقی محبت کا سفر شروع کرسکیں اور خود ہی یہ فیصلہ کرسکیں کہ ہم اپنے دعوائے محبت میں کس حد تک سچے ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری اصل منزل حقیقی محبت ہے نہ کہ مجازی محبت ۔ مجازی محبت فقط حقیقی محبت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے ۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ فوج میں پریڈ کرائی جاتی ہے ۔ جنگی مشقیں کرائی جاتی ہیں ۔ دشمن کے فرضی ٹھکانوں پر حملے کرائے جاتے ہیں ۔ یہ مجاز ہے جو بذاتِ خود مقصد نہیں ہے بلکہ اصل میدانِ جنگ میں مہارت اور ثابت قدمی کو یقینی بنانے کا ایک ذریعہ ہے ۔ مشقیں کرتے وقت فوجیوں کے ذہن میں وہ فرضی نشانے نہیں ہوتے بلکہ میدانِ جنگ ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ فوج میں اس لئے بھرتی نہیں ہوئے کہ یہ مشقیں کرتے رہیں بلکہ انکا مقصد میدانِ جنگ میں مہارت و شجاعت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے ۔ اسی طرح عملِ حقیقی وہ ہے جو جزوِ ایمان ہے اور اعمالِ ظاہری مجاز ہیں جنکا مقصد فقط یہ ہے کہ ہم عملِ حقیقی کی طرف متوجہ ہوسکیں ۔ پس مجاز کبھی ذریعۂ نجات نہیں بن سکتا ۔ ذریعۂ نجات فقط وہ حقیقی عمل ہے جسکی یاددہانی یہ اعمالِ ظاہری کراتے ہیں ۔

یہاں تک یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس عمل کو اللہ نے شرطِ نجات قرار دیا ہے وہ اعمالِ ظاہری نہیں بلکہ عملِ حقیقی ہے اور اب ہم اس حقیقی عمل کی تلاش شروع کرتے ہیں لیکن پہلے ہمیں مقصدِ عمل جان لینا چاہئے ۔

مقصدِ عمل

۱ ۔ نہج البلاغہ قول ۹۷ ''یقین کی حالت میں سو جانا شک کی حالت میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے'' ۔

یہاں سے ثابت ہوا کہ مقصدِ عمل منزلِ یقین تک پہنچنا ہے ۔

۲ ۔ نہج البلاغہ قول ۱۴۵ ''بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنھیں روزوں کا ثمر بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور بہت سے عابد شب زندہ دار (تمام رات عبادت کرنے والے) ایسے ہیں جنھیں عبادت کے نتیجے میں جاگنے اور زحمت اٹھانے

کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ زیرک و دانا لوگوں کا سونا اور روزہ نہ رکھنا بھی قابلِ ستائش ہوتا ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مقصد عمل زیرکی اور دانائی حاصل کرنا ہے۔

۳۔ نہج الاسرار جلد ۲ صفحہ ۴۱۰۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ "تمھیں چاہئے کہ عمل کی بہ نسبت قبولِ عمل کے لئے شدید کوشش کرو"۔

اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مقصد عمل یہ جاننا اور تلاش کرنا ہے کہ عمل کس طرح اور کس ذریعے سے قبول ہوتا ہے۔

احسنِ عمل

جب ہم نے قرآن کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ نجات کے لئے اللہ نے بہت سے اعمال کی شرط نہیں لگائی بلکہ ہم سے صرف ایک عمل کا مطالبہ کیا ہے جسکو اس نے "خوبصورت ترین عمل" سے تعبیر کیا ہے اور سمجھایا ہے کہ مقصد خلقت یہی خوبصورت ترین عمل بجالانا ہے۔ یہ لفظ یعنی "احسنِ عمل" قرآن مجید میں چھ مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ کہف ۷۔ کہف ۳۰۔ ہود ۷۔ نمل ۱۹۔ زمر ۱۷۔ ۱۸ اور ملک ۲۔

لیکن ہم یہاں صرف سورۂ ملک کی آیت ۲ پیش کر رہے ہیں کیونکہ اسی ایک آیت سے ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

" الّذی خلق الموت و الحیوٰۃ لیبلو کم ایّکم احسنُ عملاً و ھو العزیز الغفور"۔

ترجمہ:۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ وہ تمھاری آزمائش (کر کے ظاہر) کر دے کہ تم میں سے کون احسن عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست اور بڑا بخشنے والا ہے"۔

اس آیت میں عمل کے لئے صیغۂ واحد استعمال کیا گیا ہے یعنی "صرف ایک

عمل ''اور اسی ایک عمل پر ہمیں آزمایا جاتا ہے اور یہی ایک عمل ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ یہ احسنِ عمل ہی وہ شے ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان مغفرت کا حقدار بنتا ہے اور اسی عمل پر اللہ نے نجات کی ضمانت دی ہے اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں عملِ صالح کا ذکر ہوا ہے اور جس پر مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہی احسن عمل ہے ورنہ اگر اس سے بہت سے اعمال مراد لئے گئے تو پھر قرآن میں تضاد ثابت ہوگا جو محال ہے اور چونکہ احسن عمل کو مقصد خلقت قرار دیا گیا ہے اس لئے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ''وما خلقت الانس و الجنّ الّا لیعبدون'' میں عبادت سے مراد یہی ''ایک عمل'' ہے اور یہی عمل ہے جس سے مطلوبہ مقاصد کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہر اس شخص پر جو مغفرت اور نجات کا طالب ہے یہ واجب ہو گیا کہ وہ احسن عمل کو تلاش کرے کیونکہ نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے۔

حسنہ

جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ جس شے پر ہماری نجات کا دارومدار ہے وہ فقط ایک ہی عمل ہے تو اب ہم قرآن سے ہی اس عمل کا پتہ پوچھتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اللہ سورۂ نمل کی آیات ۸۹۔۹۰ میں بتا رہا ہے کہ تمام نیکیوں کا خلاصہ صرف ایک نیکی ہے اور تمام برائیوں کا خلاصہ صرف ایک برائی ہے۔ صرف اسی ایک نیکی پر نجات کا دارومدار ہے اور صرف اسی ایک برائی پر ہلاکت وعذابِ دائمی کا انحصار ہے۔ اب آپ آیات ملاحظہ فرمایئے اور پھر انکی تفسیر:۔

''من جآء با لحسنة فله خيرٌ مّنها و هم من فزع يّو مئذٍ اٰمنون ۝ ومن جآء با لسّيئة فكبّت وجو ههم فى النّار هل تجزون الّا ما كنتم تعملون۝''

ترجمہ:۔ ''جو ایک نیکی لایا پس اسکے لئے اسکا بہتر عوض ہے اور وہ اس دن کے خوف سے امن والے ہونگے ۔اور جو ایک برائی لایا پس وہ اوندھے منہ جہنم میں ڈالے جائیں گے ۔کیا جو کچھ (عمل) تم کیا کرتے تھے اسکے سوا تمھیں کوئی اور بدلہ دیا جائے گا؟''۔

بات آئینے کی طرح صاف ہوگئی کہ تمام اعمال نیک صرف ایک نیکی کا نام ہےاورتمام اعمال بدصرف ایک برائی کا نام ہےاورانہی دونوں پرثواب دائمی اورعذابِ دائمی کاانحصار ہےاوراسی ایک نیکی کے بجالانے والوں کواللہ نے سورۂ یونس ۲۶ میں یوں خوشخبری دی ہے۔''جن لوگوں نے نیکی کی اور اسکے ساتھ زیادتی بھی کی ہے (یعنی گناہگار بھی ہیں) انکے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی نہ ذلت ۔وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں ایسے اعمال کا ذکر ہے جن پر بخشش وعذاب کے وعدے کئے گئے ہیں ان سے مراد یہی ایک نیکی اور یہی ایک برائی ہے ۔رہی یہ بات کہ یہ ''ایک نیکی'' اور ''ایک برائی'' کیا ہے یہ میں آپ کو معصومینؑ کی زبانی سنواتا ہوں ۔شیعوں کی کتابوں سے بھی اور اہلِ سنت کی کتابوں سے بھی:۔

۱۔تفسیر صافی صفحہ ۳۷۵ پر امام جعفر صادقؑ سے بروایت امام محمد باقرؑ منقول ہے کہ جناب امیر المومنینؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔''الحسنہ'' ہم اہلبیتؑ کی ولایت کی معرفت اور ہماری محبت ہےاور''السیئہ'' ہم اہلبیتؑ کی ولایت کا انکار ہےاورہم سے بغض وعداوت ہے ۔پھر حضرتؑ نے یہی آیت تلاوت فرمائی ۔

۲۔تفسیر قمی میں بھی یہی روایت منقول ہے۔

۳۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۱۶۱۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ ''تمھیں ایک نیکی کے متعلق آگاہ کروں گا۔اگر انسان اسکو بجالائے گا تو اللہ اسکو جنت میں داخل کرے گا۔ اور ایک برائی کے متعلق آگاہ کردوں ۔اگر انسان وہ برائی کرے گا تو اللہ اسے منہ

کے بل آگ میں ڈالے گا اور اس برائی کے ہوتے ہوئے اسکا کوئی عمل قبول نہ کرے گا۔ فرمایا۔ نیکی سے مراد ہماری محبت ہے اور برائی سے مراد ہم سے بغض رکھنا ہے''۔

۴۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۴۳۵۔ امام حسینؑ فرماتے ہیں۔ ''نیکی کرنا ہم اہلبیتؑ سے محبت کرنا ہے''۔

محبت

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے یہاں عام بول چال میں جو لفظ ''محبت'' بولا جاتا ہے اسکا نام محبت نہیں ہے۔ وہ یا تو عشق ہوتا ہے یا ہوس کاری۔ عشق دیوانگی کا نام ہے اور یہ اندھا ہوتا ہے لیکن محبت اندھی نہیں ہوتی۔ محبت آنکھیں رکھتی ہے۔ محبت عقل ہی عقل ہے۔ میں نے کتاب ''مروج الذہب'' میں حکیم جالینوس کا ایک قول پڑھا جو سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''محبت دو عقلمندوں کے درمیان انکی عقل میں مشابہت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ محبت ہمیشہ کمال سے ہوتی ہے۔ نقص سے کبھی نہیں ہوتی۔ جتنا جتنا کسی کا کمال ہم پر ظاہر ہوتا جائے گا اتنی اتنی اس سے ہماری محبت بڑھتی جائے گی۔ اسی لئے معرفت پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اگر آدمی بغیر معرفتِ امامؑ حاصل کئے مرجائے تو کفر و نفاق کی موت مرے گا کیونکہ جسکو معرفت ہی حاصل نہ ہوئی وہ محبت کیسے کرے گا اور چونکہ محبت نام ہے ایمان کا اس لئے عدمِ محبت سے عدمِ ایمان ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی علیؑ کی محض اتنی ہی معرفت رکھتا ہے کہ انھوں نے مرحب کو پچھاڑ دیا تو وہ علیؑ سے صرف اتنی ہی محبت کرے گا جتنی ایک بڑے پہلوان سے۔ اور اگر کوئی علیؑ کی فقط اتنی معرفت رکھتا ہے کہ وہ احکامِ شرعی بیان فرمایا کرتے تھے تو وہ ان سے اتنی ہی محبت کرے گا جتنی ایک عام مولوی سے۔ لہٰذا اپنے سفرِ معرفت کو کبھی ختم نہ ہونے دیں۔ یاد

رکھئے کہ معرفت ایک عمل ہے اور عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

محبت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت ایک کیفیت ہے اور اسکی لذت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جو کرب محبت سے گذرا ہو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مجاز ایک ذریعہ ہے جس سے حقیقت تک پہنچا جا تا ہے۔ اگر آپ مجازی محبت پر ہی تھوڑا سا غور کر لیں تو سمجھ میں آجائے گا کہ دعوائے محبت کرنا کتنا کٹھن کام ہے۔ محبت جدائی گوارا نہیں کرتی۔ اگر محبوب اسکے پاس نہ بھی ہو تو بھی وہ ہر وقت اسکے خیالوں میں بسا رہتا ہے۔ بقول جگر مرحوم

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

پس علیؑ سے محبت کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جسکے دل و دماغ میں ہر وقت علیؑ موجود رہتا ہو۔ وہ خود چاہے کہیں بھی ہو مگر اسکی روح نجف کا طواف کرتی رہتی ہو۔ محبت کا تقاضا ہے کہ آدمی جہاں بھی بیٹھے اپنے محبوب کا ذکر کرے چاہے سننے والا اس میں دلچسپی لے رہا ہو یا نہ لے رہا ہو۔ اس لئے علیؑ کے ذکر سے پہلو تہی کرنے والے کسی بھی صورت میں علیؑ کے محب نہیں ہو سکتے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کے دوستوں سے دوستی رکھے اور محبوب کے دشمنوں سے دشمنی رکھے۔ علیؑ سے محبت کرنے والے علیؑ کے دشمنوں سے اتحاد قائم نہیں کیا کرتے۔ کسی زاہد خشک نے ایک عجیب و غریب نظریہ ایجاد کیا ہے اور وہ یہ کہ ''اطاعت لازمۂ محبت ہے''۔ اطاعت کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ نظریہ محبت سے ذرہ برابر میل نہیں رکھتا۔ اطاعت تو نوکر چاکر۔ غلام اور ماتحت بھی کیا کرتے ہیں لیکن محبت اپنے محبوب کے قدموں میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دینے کا نام ہے۔ اگر دیکھا جائے تو محبت تو محبت کرنے والے کو شوخ بنا دیتی ہے اور یہ نتیجہ ہوتا ہے اپنے محبوب پر

بھرپورا اعتماد کا۔حضرت قنبرؒ سے بڑھکر بھلا کون علیؑ کا مطیع وفرمانبردار ہوسکتا ہے؟
لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولاؑ کے پاس ایک سائل آتا ہے اور روٹی کا سوال کرتا
ہے۔آپؑ فرماتے ہیں ''قنبرؒ! سائل کو روٹی دے دو''۔قنبر اس وقت اونٹ پرسوار
تھے۔کہنے لگے۔''مولاؑ! روٹی تو گٹھڑی میں رکھی ہوئی ہے''۔(پہلی شوخی)۔
آپؑ نے فرمایا ''پوری گٹھڑی دے دو''۔قنبر بولے ''مولاؑ! گٹھڑی تو دوسرے
اونٹ پر رکھی ہے''۔(دوسری شوخی)۔آپؑ نے فرمایا ''اونٹ سمیت دے دو''۔
قنبر نے کہا ''مولاؑ! اونٹ تو قطار میں ہے''۔(تیسری شوخی)۔آپؑ نے فرمایا
''پوری قطار دے دو''۔یہ سنتے ہی قنبر اونٹ سے کود پڑے۔مولاؑ نے پوچھا
''اب کیوں اترے؟''۔قنبر بولے ''میں نے سوچا کہ دریائے جودوسخا جوش پر ہے
ایسا نہ ہو کہ آپؑ اونٹوں کی قطار مجھ سمیت سائل کو عطا کردیں''۔
آپ نے محبت کی جھلک دیکھی؟۔ویسے تو قنبرؒ شوخیاں کرتے رہے لیکن جیسے
ہی محبوب سے جدائی کا امکان پیدا ہوا تو ساری شوخی کافور ہوگئی۔

اس محبت کو سمجھئے کیونکہ یہی محبت ایمان ہے جیسا کہ اصول کافی۔کتاب ایمان و
کفر۔باب ۱۸۸ کی پانچویں حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔کسی نے امام جعفرصادقؑ
سے پوچھا کہ کیا محبت اور دشمنی کا تعلق ایمان سے ہے؟۔فرمایا۔'' کیا ایمان
محبت اور دشمنی کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے؟''۔

ہم نے اچھی طرح ثابت کردیا کہ اللہ نے نجات کے لئے جس عمل کی
شرط لگائی ہے وہ اعمالِ ظاہری نہیں بلکہ محبتِ اہلبیتؑ ہے۔آخر میں ہم ایک حتمی
حدیث پیش کرتے ہیں جس میں معصومؑ نے کھلے الفاظ میں عمل کی تعریف بیان
فرمائی ہے۔

سورۂ مریم ۹۶۔''بیشک جو لوگ **ایمان** لا چکے اور انھوں نے **نیک عمل** کئے
(خدائے) رحمن انکے لئے عنقریب ایک **محبت** قرار دے گا''۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''جن دو (یعنی ایمان اور عمل صالح) کا ذکر خدا نے کیا ہے وہ ولایتِ امیر المومنینؑ ہے''۔ (اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۷۔ حدیث ۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ جس شے کو ہم عبادت کہتے ہیں وہ حضرت امیر المومنینؑ اور انکی اولادِ طاہرہ کی ولایت و محبت ہی کا نام ہے اور سورۂ یٰسین کی آیت ۶۱۔ سورۂ احزاب کی آیت ۷۱ اور سورۂ فاطر کی آیت ۱۰ اس پر دلیل ہے۔

۱۔ یٰسین ۶۱۔ ''اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرو یہ صراطِ مستقیم ہے''۔

اس آیت میں عبادت کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے اور احادیث کثیرہ سے یہ بات ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد جناب امیر المومنینؑ ہیں۔ تفصیلات کے لئے ہماری کتاب کشف العقائد کی طرف رجوع فرمایا جائے۔

۲۔ احزاب ۷۱۔ ''وہ تمھارے اعمال کو تمھارے لئے درست کر دے گا اور تمھارے لئے تمھارے گناہ بخش دے گا اور جس نے اللہ اور اسکے رسولؐ کی اطاعت کی پس یقیناً وہ بہت بڑی مراد کو پہنچا''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اطاعت خدا و رسولؐ سے مراد ولایت علیؑ اور انکے بعد دیگر ائمہؑ کی ولایت ہے''۔ (اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۷۔ حدیث ۸)

۳۔ فاطر ۱۰۔ ''اسی کے حضور میں پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل بھی کہ وہ اسکو بلند کرتا ہے''۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''اعمالِ نیک ہم اہلبیتؑ کی ولایت ہیں'' (اصول کافی۔ کتاب حجت۔ باب ۱۰۷۔ حدیث ۸۵)

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی اطاعت و نافرمانی کا معیار ذاتِ علیؑ کو بنایا ہے۔ کوکبِ دری صفحہ ۱۶۳ پر یہ حدیث قدسی موجود ہے جو ہمارے دعویٰ کی محکم دلیل بنتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ''جس نے علیؑ کا حق پہچانا وہ پاک اور خوش ہوا اور جس

نے اسکے حق کا انکار کیا وہ ملعون ہوا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ جو شخص اسکی نافرمانی کرے گا اسکو دوزخ میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری اطاعت کرتا ہو اور جو شخص اسکی فرمانبرداری اور اطاعت کرے گا اسکو بہشتِ بریں میں داخل کروں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرتا ہو''۔ اسی طرح کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۲۷۵ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں ''عرش کے گرد ستر ہزار فرشتے ہیں جو نہ تسبیح کرتے ہیں اور نہ کوئی عبادت کرتے ہیں۔ وہ صرف علیؑ ابن ابی طالبؑ کی اطاعت کرتے ہیں۔ آپؑ کے دشمنوں سے بیزاری کرتے ہیں اور آپؑ کے شیعوں کے حق میں دعائے استغفار کرتے ہیں''۔

فرشتوں کی تسبیح

جب اللہ نے خلافتِ آدمؑ کا اعلان فرمایا تو فرشتوں نے خلافت کے بارے میں اپنا استحقاق اسطرح بیان کیا:۔

''(تمام فرشتوں نے) کہا کیا تو ایسے کو (خلیفہ) بنائے گا جو اس (زمین) میں فساد کرے گا اور خون گرائے گا حالانکہ ہم (وہ ہیں جو) تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں''۔(بقرہ ۳۰)

ذرا ہم دیکھیں تو سہی کہ آخر وہ کونسی تسبیح تھی جس پر فرشتوں کو اتنا گھمنڈ تھا اور جس نے انھیں خدائے ذوالجلال کے سامنے یہ جراءت دلائی کہ وہ اپنی تسبیح کو جتلائیں۔ حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''بہ تحقیق کہ میری ولایت اہلِ آسمان پر بھی اسی طرح لازم کی گئی ہے جیسا کہ اہلِ زمین پر اور بیشک ملائکہ میری فضیلت کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور خدا کے نزدیک یہی انکی تسبیح ہے''۔

اس تمام گفتگو کے بعد جب یہ واضح ہوگیا کہ عمل دراصل ایمان ہی کا دوسرا نام ہے تو اب ہم ایمان کے بارے میں چند تفصیلات کی طرف توجہ کرتے ہیں جنکا جاننا انتہائی ضروری ہے۔

اقسام ایمان

جو کچھ ہم آپ کے لئے بیان کرنے جارہے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کے لئے ایک اہم ترین شے ہے اور ہر شخص کے لئے اسکا جاننا بے حد ضروری ہے اس لئے ہماری خصوصی درخواست ہے کہ اسے انتہائی توجہ اور انہماک سے پڑھا اور سمجھا جائے۔اکثر لوگوں کو یہ گمان رہتا ہے کہ وہ تو مومن ہیں اسلئے انھیں نہ دنیا میں کوئی ڈر ہے نہ موت۔قبر اور محشر کا کوئی خوف۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مومن کو واقعی کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ایمان کیا چیز ہے اور کس کے پاس کونسا ایمان ہے اس وقت تک کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا باعث ہلاکت بھی بن سکتا ہے۔لہٰذا پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ مومن کس قدر کمیاب شے ہے۔وہ کبھی بھی اکثریت میں نہیں ہوسکتا۔وہ ہمیشہ قلیل ہی رہا ہے اور رہے گا جب تک ظہور قائمؑ نہ ہوجائے۔مومن کے بارے میں معصومینؑ کے ارشادات پڑھکر کبھی کبھی تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس دنیا میں مومن کا وجود ہے بھی یا نہیں؟۔

۱۔اصول کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۲۲۸ حدیث ۴۔

''ایک شخص امام جعفر صادقؑ کو خروج کرنے کی ترغیب دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس وقت تقریباً آدھی دنیا شیعہ ہے لہٰذا اتنے مددگاروں کے ہوتے ہوئے آپؑ کو فوراً خروج کر دینا چاہئے۔یہ سن کر امامؑ خاموش ہوگئے اور اس شخص سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ایک مقام پر نماز کے لئے سواری سے اترے۔وہاں ایک لڑکا بکریاں چرا رہا تھا۔امامؑ نے فرمایا اگر میرے شیعہ اتنے بھی ہوتے جتنی یہ بکریاں ہیں تو میں خروج کر دیتا۔وہ شخص کہتا ہے کہ جب میں نے بکریوں کو شمار کیا تو وہ کل سترہ (۱۷) تھیں''۔

یہ بات سوچنے کی ہے کہ ایسے دور میں جبکہ یہ دعویٰ کیا جارہا تھا کہ آدھی دنیا شیعہ ہے اس وقت دنیا میں سترہ مومن بھی موجود نہیں تھے اور اسی بات سے ہم اپنے

زمانے میں شیعوں کی تعداد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۲۔اس باب کی دوسری حدیث میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''تمام لوگ چوپائے ہیں (تین بار فرمایا) مگر مومن جو بہت کم پایا جاتا ہے (تین بار فرمایا)''۔

۳۔اسی باب کی پہلی حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''مومنہ کمیاب ہے بہ نسبت مومن کے اور مومن کمیاب ہے یاقوتِ سرخ سے۔ پس تم میں کون ہے جس نے یاقوتِ سرخ دیکھا ہو؟''۔

اگر اتنی بات آپ تک پہنچ گئی ہے تو ہم اصل مطلب پر آتے ہیں اور اقسام ایمان بیان کرتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ ایمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایمانِ مستقر اور ایمانِ مستعار۔ ایمانِ مستقر وہ ہوتا ہے جو دل میں قرار پکڑے ہوئے ہوتا ہے۔ جس شخص کے پاس ایمانِ مستقر ہو اس سے دنیا کی کوئی طاقت ایمان کو جدا نہیں کر سکتی۔ ایمانِ مستعار وہ ہوتا ہے جو کسی کو عارضی طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے جدو جہد کی۔ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا اور لغزشوں سے خود کو بچائے رکھا تو اللہ اسکے ایمان کو مستقر کر دیتا ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ زندگی بھر وہ شخص مومن دکھائی دیتا ہے لیکن جب مرتا ہے تو یہ ایمان اس سے سلب کر لیا جاتا ہے اور وہ کافر ہو کر مرتا ہے۔ اپنے بیان کی دلیل کے طور پر ہم حق الیقین (اردو) جلد۲ سے دو احادیث پیش کرتے ہیں:۔

۱۔صفحہ ۲۵۰۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''خدائے تعالیٰ نے کچھ مخلوق کو ایمان کے لئے پیدا کیا ہے جو ان سے کبھی زائل نہیں ہوتا۔ اور کچھ مخلوق کو کفر کے لئے پیدا کیا ہے جو کبھی ان سے برطرف نہیں ہوتا۔ اور کچھ مخلوق کو ان دو حالتوں کے درمیان پیدا کیا ہے۔ ان میں سے بعض کو ایمان سپرد کیا ہے۔ اگر خدا چاہتا ہے تو انکے لئے تکمیل فرماتا ہے اور اگر چاہتا ہے کہ ان سے سلب کرے تو سلب کر لیتا ہے۔ ایک بندہ ہے جو صبح و شام کافر ہے۔ اور ایک بندہ ہے جو صبح کو کافر ہوتا ہے اور شام

کومومن ہو جاتا ہے اور ایک گروہ ہے کہ ایمان اسے عاریتاً (ادھار) دیا گیا ہے اور ان سے سلب کرلیا جاتا ہے"۔

میں آپ کے لئے اس حدیث کی تھوڑی سی تشریح کردوں تا کہ اسکا صحیح مفہوم آپ تک پہنچ سکے۔ائمہؑ کے زمانے میں بھی اور آج بھی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی یا تو مومن ہے یا کافر۔ایسا نہیں ہے اور ائمہؑ نے بار بار لوگوں کو سمجھایا ہے کہ ایمان و کفر کے درمیان بھی ایک شے ہے اور وہ ہے اسلام۔اسلام کا تعلق صرف دنیا سے ہے۔آخرت سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔یعنی یہ کہ ایسے شخص کے ساتھ رہنا سہنا۔کھانا پینا۔نکاح کرنا۔ورثہ دینا اور ورثہ لینا جائز ہو جاتا ہے۔اسکا خون بہانا حرام ہو جاتا ہے اور اسکا مال اور عزت وآبرو محفوظ ہو جاتے ہیں اور بس۔آخرت کا تعلق صرف اور صرف ایمان سے ہے۔ثواب صرف ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔نجاتِ اخروی صرف ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔اب ایسے درمیانی لوگوں میں سارے مسلمان شامل ہیں۔ایسے درمیانی لوگوں میں سے بعض کو ایمان عاریتاً سپرد کیا گیا ہے یعنی وہ بظاہر شیعوں سے مشابہ ہیں اور عقائد سے لیکر اعمالِ ظاہری تک وہ مومن لگتے ہیں۔ایسے لوگوں کو اللہ نے کیوں پیدا کیا اس کی تفہیم ائمہ معصومینؑ نے یوں کرائی ہے کہ ہر دور میں مومن اتنی قلیل تعداد میں ہونگے کہ تنہائی کی وحشت سے انکا کلیجہ پھٹ جائے۔انکے دل کو بہلانے اور قوی کرنے کے لئے اللہ نے ایسی قوم کو پیدا کیا ہے جو بظاہر مومن سے مشابہ ہوتی ہے اور انھیں دیکھ دیکھ کر مومن بہلتا اور خوش ہوتا ہے۔پھر ایسے لوگوں میں بھی دو طبقات ہیں۔ایک وہ جن سے مرتے وقت ادھار دیا ہوا ایمان واپس لے لیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو کوشش کرتا ہے اور اللہ کے سامنے گڑگڑاتا ہے تو اللہ اسکو ایمان پر باقی رکھتا ہے۔

میں تنبیہ کرتا ہوں کہ ان درمیان کے لوگوں سے ہوشیار رہنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ آدمی دھوکا ایسے ہی لوگوں سے کھاتا ہے۔

۲۔صفحہ۲۵۱۔امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ بعض مومنوں کواللہ نے ایمان پر پیدا کیا جو کبھی مرتد نہیں ہوتے اور ان میں سے بعض کو عاریتاً دیا گیا ہے۔وہ اگر دعا کرے اور دعا میں خدا سے گڑگڑائے تو ایمان پر قائم رہے گا۔

خصائصِ ایمان

۱۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۷۵۔حدیث ۱۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"صبر ایمان کا سر ہے"۔

صبر کے معنی ہیں استقامت۔جم جانا۔ڈٹ جانا۔لہٰذا ایمان کی پہلی خصوصیت یہ ٹھہری کہ آدمی ایمان کو پہچان کر اسے اپنائے اور پھر اس پر جم جائے۔ہوا کا کوئی جھونکا اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔کسی کا رعب سیاسی اسکے قدموں میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔اسکی مزید وضاحت کے لئے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔کیا آج سے چند دہائیاں پہلے شیعوں کی حالت وہی تھی جو آج ہے؟۔کیا اس سے پہلے شیعہ فرمائشاتِ معصومینؑ کو سبک سمجھ کر نظر انداز کرتے تھے؟۔کیا اس سے پہلے آپ نے کسی شیعہ کے منہ سے عزاداری کے خلاف کوئی بات سنی تھی یا کوئی شیعہ ایسا دیکھا تھا جو عزاداری کے خلاف کوئی کتاب لکھتا ہو؟۔اب فیصلہ آپ خود کریں لیکن اتنا تو پتہ چل گیا کہ اگر استقامت نہ ہو تو ایمان کا وجود ہی ممکن نہیں کیونکہ صبر ایمان کا سر ہے اور اگر کسی کا سر کاٹ دیا جائے تو اسکا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۷۹۔حدیث ۸۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔"راست گوئی (سچ بولنا) زبانِ دلیل ہے دعویٰ ایمان کی صداقت پر"۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں وہ سچ مراد نہیں ہے جو ہم عام زندگی میں بولتے ہیں کیونکہ یہ سچ تو غیر مسلم اقوام بھی بولتی ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ بولتی ہیں۔اگر اسی سچ کو دلیلِ ایمان مان لیا جائے تو انکو بھی مومن ماننا پڑے گا اس لئے کہ وہ بھی

دعویٔ ایمان رکھتی ہیں۔ یہاں سچ سے مراد امورِ ایمان میں صداقتِ قول وعمل ہے جسکی دلیل میں اصولِ کافی۔ کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۱۳۔حدیث ۱سے اخذ کررہاہوں۔امام جعفر صادقؑ سے کسی نے پوچھا۔''یہ کیسے جانا جائے کہ اس میں کون ناجی ہے؟''۔فرمایا۔''جسکا فعل اسکے قول کے موافق ہو اسکی نجات کی گواہی ثابت ہے اور جسکا قول اور فعل یکساں نہ ہو وہ عارضی ایمان والا ہے''۔اب آپ اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو زبان سے اہلبیتؑ کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور مجالس میں بیٹھ کر آنسوؤں کے دریا بہاتے ہیں لیکن انکے افعال سے دشمنیٔ اہلبیتؑ ظاہر ہوتی ہے۔

۳۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۸۶۔حدیث ۲۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔''جسکو نرم دلی مل گئی اسکو ایمان مل گیا''۔

پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ نرم دلی اور رحم دلی میں فرق ہے۔یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔نرم دلی سے مراد حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے کہ جیسے ہی انسان پر حق ظاہر وثابت ہو وہ اسے قبول کرنے میں ایک لحہ بھی تاخیر نہ کرے اور سخت دلی اسے کہتے ہیں کہ انسان حق کو جانتے اور پہچانتے ہوئے بھی اسے قبول نہ کرے اور اپنی ضد پر اڑا رہے۔اس سے آپ ان لوگوں کو پہچان سکتے ہیں جو قولِ معصومؑ کو جانتے ہوئے بھی اسکا انکار کرتے ہیں اور غیرِ معصوم کے قول کو قولِ معصومؑ پر ترجیح دیتے ہیں۔

۴۔حق الیقین (اردو) جلد ۲ صفحہ ۲۱۹۔رسول اللہؐ نے فرمایا۔''جسکو نیکی خوش کرتی ہے اور گناہ اسکو آزردہ کرتا ہے وہ مومن ہے اور جو شخص کسی گناہ سے پشیمان نہ ہو جسکا مرتکب ہوتا ہے تو وہ مومن نہیں''۔

نیکی کیا ہے اور گناہ کیا۔اسکی وضاحت کی جاچکی ہے لیکن اگر اس سے عام نیکیاں اور عام گناہ بھی مراد لے لئے جائیں تب بھی اتنا تو ماننا پڑے گا کہ سب سے بڑی نیکی اہلبیتؑ کے حق میں نیکی ہے اور سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو اہلبیتؑ کے حق

میں کیا جائے۔ جب عام نیکیوں پر خوش نہ ہونے والا اور عام گناہوں پر پشیمان نہ ہونے والا مومن نہیں ہوسکتا تو اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فضائلِ اہلبیتؑ سے کراہت کرنے والا اور توہینِ اہلبیتؑ کرنے والا۔ سننے والا اور اس پر راضی و خوشنود رہنے والا کس طرح مومن ہوسکتا ہے؟۔

۵۔اصولِ کافی ۔کتاب ایمان وکفر ۔باب ۲۲۲۔حدیث ۴۔

فرمایا صادقؑ آلِ محمدؐ نے ۔"دین کو رضائے الٰہی کے لئے اختیار کرو نہ کہ لوگوں کی رضا کے لئے"۔

یہ حدیث اس قدر واضح ہے کہ اسکی مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ۔اگر ساری دنیا ناراض ہوتی ہے تو ہوجائے لیکن رضائے الٰہی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ازروئے قرآن اللہ کی تمام کی تمام رضا علیؑ مرتضٰی کے پاس ہے جو انھوں نے اپنا نفس بیچ کر خریدی ہے ۔لہٰذا ہماری زندگی کا مقصد صرف یہی ہونا چاہئے کہ علیؑ ہم سے راضی رہے ۔اب یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ کون ہے جو دین کو علیؑ کی رضا کے لئے اختیار کیئے ہوئے ہے اور کون ہے جو لوگوں کی رضا کی خاطر کلمۂ علی ولی اللہ تک کو چھوڑنے کے لئے تیار ہے؟۔

۶۔اصولِ کافی ۔کتاب ایمان وکفر ۔باب ۲۲۴۔حدیث ۲۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"امیر المومنینؑ نے اپنے اصحاب کو وصیت کی تھی کہ جب تم پر کوئی بلا آئے تو اسے مال کے ذریعے اپنے نفسوں سے دور کرو نہ کہ دین کھو کر"۔

اب تو بات بالکل واضح ہوگئی کہ اگر کسی کے دنیاوی مفاد اور دینی مفاد میں تصادم ہوجائے اور اسے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو اسکا فرض ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ دے مگر دین کو ضائع نہ ہونے دے ۔یاد رکھئے کہ عمر ابن سعد ملعون بھی امامتِ حسینؑ کا منکر نہیں تھا لیکن جب رے کی حکومت سامنے آئی تو اس نے دین کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کرلیا۔ ہر کم ظرف کی ایک قیمت ہوتی ہے جس

پر وہ بک جاتا ہے ۔عمر ابن سعد کی قیمت رَے تھی لیکن لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو محض چند سکوں کے عوض دین کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں ۔

علاماتِ ایمان

۱۔اصولِ کافی ۔کتاب ایمان وکفر ۔باب ۲۲۷ ۔حدیث ۲۷ ۔

امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ ہم کیسا برتاؤ کریں ان لوگوں کے ساتھ جو بظاہر شیعہ ہیں ۔فرمایا۔'' ان میں علامتیں ہیں ۔ انکے حالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں ۔باہمی اختلاف ان میں تفرقہ ڈال دے گا (امامؑ یہ بات ان نام نہاد شیعوں کے بارے میں فرمارہے ہیں جو ہر تیز ہوا کے رخ پر مڑ جاتے ہیں اور ہر پکارنے والے کے پیچھے ہو لیتے ہیں ۔اسکے بعد اپنے حقیقی شیعوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں) ہمارے شیعہ وہ ہیں جو کتوں کی طرح بھونکتے نہیں اور کوے کی طرح لالچی نہیں ہوتے اور چاہے بھوک سے مر جائیں لیکن دشمن سے سوال نہیں کرتے (کجا یہ کہ ان سے اتحاد کرلیں اور انکے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو جائیں)''۔راوی نے کہا کہ میں آپؑ پر قربان ۔ایسے خالص شیعہ کو ہم کہاں پائیں؟ ۔فرمایا۔''وہ اطرافِ زمین میں پائے جاتے ہیں ۔انکی زندگی اطمینان سے گذرتی ہے ۔اگر وہ موجود ہوں تو مردِ غریب ہونے کی وجہ سے پہچانے نہیں جاتے اور غائب ہوں تو تلاش نہیں کئے جاتے کیونکہ لوگ ان سے واقف نہیں ہوتے''۔

۲۔اصولِ کافی ۔کتاب ایمان وکفر ۔باب ۲۲۷ ۔حدیث ۹ ۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔'' بچو اس پست فطرت انسان سے جو خود کو شیعہ کہتا ہے''۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر کوئی شخص کمینہ ہے لیکن شیعہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اس سے بچنے کی اتنی تاکید نہیں ہے لیکن جو شخص شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو مگر

کمینہ ہو اس سے بچنے کی سخت تاکید ہے جسکا واضح مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص سے ضرر پہنچنے کا احتمال بہت زیادہ ہے خاص طور پر امورِ دین میں۔

۳۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۲۲۷۔حدیث ۱۵۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"مومن کی تین علامتیں ہیں۔اول معرفتِ باری تعالیٰ۔دوسرے یہ جاننا کہ خدا کس کو دوست رکھتا ہے (امامِ برحق کی معرفت) اور تیسرے یہ کہ وہ کس کو دشمن رکھتا ہے (گمراہ کرنے والے امام سے دشمنی)۔

۴۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۲۲۲۔حدیث ۴۔

فرمایا امام جعفر صادقؑ نے۔"خدا جسکے لئے امرِ دین میں داخلے کے لئے لکھ دیتا ہے وہ اسکی طرف اس سے زیادہ تیز جاتا ہے جتنا ایک طائر اپنے گھونسلے کی طرف"۔

۵۔اصولِ کافی۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۲۲۲۔حدیث ۵۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"خدا نے ایک قوم کو حق کے لئے پیدا کیا پس جب وہ امرِ حق کے کسی دروازے کی طرف سے گزرتے ہیں تو انکے دل اسکو قبول کر لیتے ہیں اگرچہ وہ اسکی علت نہ جانتے ہوں۔اور ایک قوم انکے علاوہ پیدا کی ہے۔ جب وہ کسی امرِ باطل کی طرف سے گذرتے ہیں تو انکے دل اسکو قبول کر لیتے ہیں اگرچہ اسکی علت نہ جانتے ہوں"۔

ان احادیث سے ایمان اور عدمِ ایمان کی واضح نشانیاں سامنے آتی ہیں۔جہاں آپ دیکھیں کہ انسان قبولِ حق میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا رہا تو سمجھ لیجئے کہ وہاں ایمان ہے اور جہاں مندرجہ ذیل چیزیں پائی جاتی ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہاں ایمان نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے:۔

۱۔عقائد میں تبدیلی ہوتے رہنا۔

۲۔عقائد و اعمال میں باہمی اختلاف۔

۳۔دھونس دھمکی۔

۴۔لالچ
۵۔شہرت پسندی
۶۔کمینہ پن
۷۔باطل امام سے محبت۔
۸۔حق کو قبول کرنے میں لیت ولعل کرنا اور باطل کو فوراً قبول کر لینا۔
۹۔دنیاوی مفاد کی خاطر دین کو فراموش کر دینا۔

آخر میں ہم ایک ایسا محکم معیار پیش کرتے ہیں جسکے بغیر ایمان ثابت ہی نہیں ہوتا۔

خوف ورجاء

خوف کے معنی ہیں کسی شے سے اسکا علم نہ ہونے کی وجہ سے ڈرنا اور رجاء کے معنی ہیں امید۔ یہ علم الاخلاق کا ایک مستقل موضوع ہے جو فرمائشاتِ معصومینؑ سے ماخوذ ہے۔ بعض چیزیں ہیں جن سے انسان کو ڈرنا چاہئے اور بعض چیزیں ہیں جن کے بارے میں انسان کو اچھی امید رکھنی چاہئے۔ بشارت ونذارت اسی کا نام ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں امید رکھنی چاہئے انکی بشارت دی جائے اور جن چیزوں سے ڈرنا چاہئے انکی نذارت کی جائے۔ یہ بات دل پر نقش کر لیجئے کہ مومن نہ تو ناامید ہوتا ہے اور نہ بے خوف۔ یعنی جو شخص ناامید نظر آئے یا دوسروں کو ناامید کرے وہ مومن نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ شخص مومن ہو سکتا ہے جو بے خوف رہتا ہو۔ اصولِ کافی۔ کتاب ایمان وکفر۔ باب ۱۶۱۔ حدیث ۱۲ میں امام جعفر صادقؑ اپنے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا۔ ”کوئی بندۂ مومن ایسا نہیں جسکے قلب میں دو نور نہ ہوں۔ نورِ خوف اور نورِ رجاء۔ اگر ان دونوں کو وزن کیا جائے تو ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ ہوگی“۔ معصومؑ کی اس نصِ صریح کے ہوتے ہوئے اپنے ایمان پر نازاں ہونا اور بے خوف ہو جانا مومن کی شان کے خلاف ہے۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ

مومن کس چیز سے ڈرتا ہے۔

۱۔مومنون ۶۰ ۔''اور وہ لوگ جو (راہِ خدا میں) دیتے ہیں جو کچھ کہ انھوں نے دیا اس حال میں کہ انکے دل ڈرنے والے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

جناب امیر المومنینؑ نے فرمایا۔''اسکا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی اطاعت کا ثبوت مع ہماری ولایت کے دیا اور پھر بھی وہ اس میں ڈرتے رہے مگر انکا خوف شک کا خوف نہیں بلکہ انکو اس بات کا خوف رہا کہ کہیں وہ ہماری ولایت اور محبت میں قاصر تو نہیں رہے''۔

۲۔ اصولِ کافی ۔کتاب ایمان و کفر۔باب ۱۶۱۔حدیث ۱۲ میں امام جعفر صادقؑ نے لفظ بہ لفظ یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اس سے ہر مومن کو اچھی طرح سمجھ لینا اور یقین کر لینا چاہئے کہ اہلبیتؑ اطہار کا حق ادا کرنا اور انکی معرفت کے تقاضے پورے کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان اس بارے میں چاہے کچھ بھی کر لے مگر پھر بھی قاصر ہی رہتا ہے اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایمان کی طرف سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ ہر لمحے ڈرتا رہے اور اعتراف کرتا رہے کہ اس سے اہلبیتؑ کا حق ادا نہیں ہو سکا۔

بشارت و نذارت

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان علماءِ حق اور علماءِ سوء میں واضح طور پر فرق محسوس کر سکتا ہے۔اس بات کو ہمیشہ دھیان میں رکھئے کہ جو کام ہادیٔ برحق کرتا ہے بعینہٖ وہی کام شیطانِ رجیم بھی کرتا ہے۔ہادیٔ برحق بھی بشارت و نذارت کرتا ہے اور شیطان رجیم بھی بشارت و نذارت ہی کرتا ہے لیکن ان دونوں کا طریقۂ عمل ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہے۔ ہادیٔ برحق جس چیز سے ڈراتا ہے شیطان رجیم اس شے کی خوشخبری دیتا ہے اور جس چیز کی ہادیٔ برحق

خوشخبری دیتا ہے اس سے شیطان ڈراتا ہے۔ اگر مومن تھوڑا سا بھی غور کرے اور ہادیٔ برحق کی نذارت کو سمجھے تو ساری زندگی عالمِ خوف میں گذارے جیسا کہ مومنون ۶۰ میں اللہ نے اسکی شان بیان فرمائی ہے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ بشارت تو کرتے ہیں لیکن نذارت کبھی نہیں کرتے تو میں نے انھیں یہی جواب دیا کہ لوگ اگر نہ سمجھیں تو یہ انکی کوتاہی ہے ورنہ جو نذارت میں نے کی ہے اسکو اگر وہ سمجھ لیتے تو ساری زندگی خوف سے کانپتے ہوئے گذارتے مثلاً کشف العقائد کے صفحہ ۵۰ پر میں نے مناقب ابن شہر آشوب سے یہ روایت نقل کی ہے:۔

راوی کا کہنا ہے کہ ہم نے جابر ابن عبداللہ انصاری کو عصا کا سہارا لئے ہوئے دیکھا۔ آپ مدینے کی گلیوں اور لوگوں کی مجالس کی جگہ پر گھوم کر یہ اعلان کر رہے تھے۔ "اے گروہِ انصار! اپنی اولاد کے اندر علیؑ ابن ابی طالبؑ کی محبت ڈالو۔ جو شخص آپؑ کی شان کا انکار کرے اسے اپنی ماں کی حالت پر غور کرنا چاہئے"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۶۵ پر میں نے یہ حدیثِ رسولؐ درج کی ہے:۔

"جو کوئی علیؑ کا حق نہ پہچانے وہ تین حال سے خالی نہیں۔ یا تو منافق ہے۔ یا ولدالزنا۔ یا اسکی ماں نے حیض کی حالت میں حاملہ ہو کر اسکو جنا"۔

اسکے باوجود اگر کسی کے نزدیک صحتِ نسب کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو تو وہ اس نذارت کو کیونکر سمجھے گا؟۔ ہادیٔ برحق حضرت ختمی مرتبتؐ نے ایسی عظیم نذارت فرمائی ہے کہ مومن کے لئے زندگی گذارنا ایسا ہو گیا ہے جیسے کانٹوں پر چلنا جبکہ آپؐ نے فرمایا۔ "جو مر گیا اس حالت میں کہ اس نے اپنے امام زمانہؑ کی معرفت حاصل نہ کی ہو تو وہ جاہلیت و کفر و نفاق کی موت مرا"۔ یہ بات ظاہر ہے کہ تمام عبادتیں اور ریاضتیں مشروط بہ ایمان ہیں۔ اگر کسی شخص کو ایمان و کفر کی نہ تو پہچان ہو اور نہ کوئی فکر ہو تو ایسا شخص اگر سجدے کر کر کے اپنی پیشانی بھی شق کر لے تو کیا فرق پڑتا ہے؟۔ ان لوگوں کے نزدیک تو یہی چیز محبوب ہے کہ کوئی گھنٹے دو گھنٹے تک منبر پر

بیٹھا ہوا انکو نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ میں کوتاہی سے ڈراتا دھمکاتا رہے اور حق اہلبیتؑ کا ذکر تک نہ کرے۔ انکو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ نسب خطرے میں پڑتا ہے یا ایمان۔ انھیں تو فقط اپنا نشہ پورا کرنا ہوتا ہے اور اس نشے کی پڑیاں بیچنے کے لئے شیطان رجیم نے اپنے کارندے چار دانگِ عالم میں پھیلا رکھے ہیں۔ مومنین کو سوچنا چاہئے کہ جن چیزوں میں کوتاہی سے نہ انسان کا نسب مشکوک ہوتا ہو اور نہ ایمان زائل ہوتا ہو ان چیزوں سے ڈرانے اور جن چیزوں میں کوتاہی سے انسان مخدوش النسب اور کافر و منافق و جہنمی بن جائے ان سے غافل رکھنے سے ان نام نہاد مصلحین کا مقصد کیا ہے؟۔

ہم دنیا میں رہ کر ہر قسم کا گناہ کرتے ہیں جن میں ترکِ واجبات اور ارتکابِ محرمات بھی شامل ہیں۔ لیکن جو ہمارا خالق ہے وہ ہماری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے اسی لئے اس نے ان چیزوں کو نہ تو معیارِ ایمان بنایا اور نہ شرطِ نجات۔ بلکہ اس نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا جسکے ہوتے ہوئے کوئی بد بخت و شقی ہی ہوگا جو نجات سے محروم رہ جائے اور وہ دروازہ ہے "توبہ"۔ پھر وہ ایسا رحمٰن و رحیم اور ایسا غفار و کریم ہے کہ اس نے یہ تک گوارا نہ کیا کہ اسکا مومن لمحے بھر کے لئے بھی اپنی نجات کی طرف سے مایوس ہو۔ چنانچہ سورۂ زمر ۵۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "(اے رسولؐ) کہدو کہ اے میرے بندوں جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی (یعنی گناہ کئے) اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو یقیناً اللہ سارے کے سارے گناہوں کو بخش دے گا یقیناً وہ بڑا بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے"۔

اب ذرا اسکی تفسیر بھی دیکھ لیں:۔

۱۔ تفسیر صافی صفحہ ۴۴۰ پر بحوالہ قمی لکھا ہے کہ <u>یہ آیت خاص طور پر شیعانِ علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے</u>۔ اور کافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں "اے میرے بندوں" فرمایا کہ تمھارا (شیعوں

کا) ذکر کیا ہے ۔پھر فرمایا ۔خدا کی قسم اس آیت میں اس نے تمھارے سوا کسی اور کا ارادہ نہیں کیا ہے ۔
۲۔معانی الاخبار اور تفسیر قمی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ اللہ نے یہ آیت خاص طور پر اولادِ فاطمۃ الزہراءؑ کے شیعوں کے بارے میں نازل فرمائی ۔
۳۔المحاسن میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ملتِ ابراہیم پر تمھارے سوا کوئی قائم نہیں ہے اور تمھارے سوا کسی کے عمل قبول نہ کئے جائیں گے اور تمھارے سوا کسی کے گناہ نہ بخشے جائیں گے۔
۴۔تفسیر مجمع البیان میں آنحضرتؐ سے مروی ہے کہ دنیا و آخرت میں اس آیت سے بڑھکر مجھے کچھ محبوب نہیں ہے ۔
آپ نے اچھی طرح محسوس کر لیا ہوگا کہ اللہ کے نزدیک یہ مقامِ بشارت ہے جہاں وہ مومنوں کی دلداری کر رہا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شیطان لعین اور اسکے کارندے لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے اور خوفزدہ کرتے ہیں ۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک تحفۃ العوام کے ابتدائی صفات پر ان لوگوں کے لئے شدید ترین نذارت پڑھی ہے جن سے نمازیں چھوٹ جاتی ہیں ۔ یہ نظم کی صورت میں ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ جس نے ایک نماز چھوڑ دی اس نے ایک نبی کو قتل کر دیا ۔کیا نبی کو قتل کرنے والے کی بخشش ہو سکتی ہے؟ پھر کہاں گیا اللہ کا وعدہ؟ ۔اسکے بعد دو نمازیں اور تین نمازیں چھوڑنے والوں کے لئے ایسی ہی تنبیہات ہیں ۔ جو شخص چار نمازیں چھوڑ دے اسکے لئے کہا گیا ہے کہ وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے

زنا اپنی مادر سے ہفتاد بار
کیا عین کعبے میں اے ہوشیار

اللہ اکبر! اللہ اکبر! کیا اسکے بعد بھی نجات کی کوئی امید باقی رہ جاتی ہے؟ ۔آپ

اس بات پرغور فرمائیں کہ جس مقام پر اللہ امید دلا رہا ہے اور مغفرت کا وعدہ فرما رہا ہے اس مقام پر شیطان کے یہ کارکنان انسانوں کو مایوس کررہے ہیں جبکہ اللہ کہہ رہا ہے کہ ہرگز ہرگز مایوس نہ ہونا۔

اسی طرح جہاں اللہ نے ڈرایا ہے اور نجات و مغفرت کے دروازے بند کردیئے ہیں وہاں یہ لوگ امید دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس کلمہ یاد کرلو۔ بارہ اماموں کے نام رٹ لو۔ یہی معرفت ہے اور یہی کافی ہے آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک علامہ صاحب کو منبر سے یہ کہتے سنا کہ آلِ محمدؐ سمندر ہیں اس لئے سمندر کے کنارے کنارے رہو گے تو ٹھیک ہے ورنہ اگر آگے بڑھے تو غرق ہوجاؤ گے۔ اس بے وقوف کو کون بتائے کہ غرق ہوجانے کا ڈر اسے ہوتا ہے جسکے پاس کشتی نہ ہو۔ ہمارے پاس تو کشتیٔ نجات موجود ہے ہم تو بیچ سمندر میں جائیں گے۔ جو لوگ سفینۂ اہلبیتؑ میں سوار ہوں انھیں موجوں کا کیا خوف ہوسکتا ہے۔ موتی نکال کر وہی لوگ لاتے ہیں جو سمندر کی شناوری کرتے ہیں اور اسکی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔ کنارے پر ٹہلنے والے تو محض تماش بین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جو رحمتِ خدا سے مایوس کرتے ہیں اور غضبِ خدا سے بے خوف کرتے ہیں آپکے دوست ہیں یا دشمن؟ ۔ یہ فیصلہ آپکو خود کرنا ہے۔

ہم نے ایمان اور عمل کے بارے میں ضروری گذارشات اپنے قارئین تک پہنچادیں اور اپنی گفتگو کو مکمل کرنے کے لئے ہم مختصراً اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں ظاہری اعمال کی اسقدر تاکید کیوں کی گئی ہے۔

ظاہری اعمال کی تاکید کیوں؟

پہلے ہی عرض کیا جاچکا ہے کہ اعمالِ ظاہری کا مقصد انسان کی انفرادی۔ معاشرتی اور معاشی اصلاح ہے۔ یہاں ہم انفرادی اصلاح کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اس تاکید کا پہلا سبب گناہ کا فطری اثر ہے۔ آپ نمک کی ایک چٹکی بھی اگر زبان پر رکھیں تو اسکا بھی ایک اثر ہونا لازمی ہے۔ اسکو آسان طریقے پر یوں سمجھئے کہ پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس رکھا ہے اور اس پانی میں زہر ملا ہوا ہے۔ ایک شخص کو معلوم ہے کہ اس پانی میں زہر ہے لیکن جانتے بوجھتے وہ یہ پانی پی جاتا ہے تو یہ خودکشی کہلائے گی۔ وہ شخص حرام موت مرے گا اور مستحق جہنم ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو اس بات کا علم نہیں کہ اس پانی میں زہر موجود ہے۔ وہ پیاسا ہے اور محض پانی سمجھ کر اسے پی جاتا ہے۔ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور نہ وہ عذاب آخرت کا مستحق ہوگا۔ لیکن کیا زہر اس پر اثر نہیں کرے گا؟ زہر اس پر بھی وہی اثر کرے گا جو پہلے شخص پر کیا تھا۔ اسی طرح اگر ایک شخص ایک عمر تک شراب پیتا رہتا ہے اسکے بعد توبہ کر لیتا ہے اور اللہ اسکی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ عذاب آخرت سے مامون ہو جاتا ہے لیکن اسکے باوجود یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ توبہ کر لینے اور توبہ قبول ہو جانے سے وہ تمام اثرات بھی ختم ہو جائیں جو شراب نے اسکے پھیپھڑوں اور جگر پر مرتب کئے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ایمان کوئی ایک جیسی حالت پر رہنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ ''وا اذا تلیت علیھیم ا یا تہ زاد تہم ایمانا''۔ (جب ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو انکا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے)۔ ''الذین ا منوا ثم کفروا ثم ا منوا ثم کفروا ثم ازدادو کفرا''۔ (وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں پھر کافر ہو جاتے ہیں پھر ایمان لاتے ہیں پھر کافر ہو جاتے ہیں پھر انکے کفر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر کس کو معلوم کہ یہ ناقص ایمان شیطانی وسوسوں سے زائل نہ ہو جائے۔ خدا کی اطاعت اور اسکی عبادت (اگر سمجھ کر کی جائے تو) شیطانی وسوسوں سے حفاظت کے لئے ایمان کا قلعہ ہیں۔ اگر آپ کوئی انتہائی قیمتی شے کسی صندوق میں بند کر کے رکھ دیں تو پھر اس صندوق کو بے حفاظت ہرگز

نہیں چھوڑ سکتے بلکہ ہر لمحے اسکی نگرانی کریں گے۔ یہ حفاظت دراصل آپ اس صندوق کی نہیں کر رہے بلکہ اس قیمتی شے کی کر رہے ہیں جو اسکے اندر ہے۔ چنانچہ حق الیقین (اردو) جلد۲ صفحہ ۲۳۲ پر امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان درج ہے۔ ''اللہ نے صالحین کے ایک گروہ کا تذکرہ فرمایا ہے جو اسکی بارگاہ میں فریاد کرتے رہے ہیں کہ اے پروردگار باطل کی طرف ہمارے دلوں کو مائل نہ ہونے دے اسکے بعد جبکہ تو نے ہماری ہدایت فرمائی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ ان صالحین نے اس لئے دعا کی کہ وہ جانتے تھے کہ بعض قلوب ہدایت پانے کے بعد باطل کی طرف مائل ہو جاتے ہیں''۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جنکا مرتکب ہوتے ہی آدمی سے ایمان سلب کر لیا جاتا ہے۔ اقوالِ ائمہؑ میں ایسے گناہوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے مثلاً ماں باپ کا عاق کر دینا۔ کسی مومن کو عمداً قتل کرنا۔ کسی مومنہ عورت پر اتہام لگانا وغیرہ۔ چنانچہ اصول کافی۔ کتاب ایمان و کفر۔ باب ۱۹۳۔ حدیث ۶ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''جو نیکی کا ارادہ کرے چاہئے کہ وہ اس میں جلدی کرے۔ تاخیر روا نہ رکھے کیونکہ بندہ بعض اوقات ایسے کام بھی کرتا ہے کہ خدا اس سے کہتا ہے کہ میں نے تیرے گناہ بخش دئے اور اب تیرے گناہ نہ لکھوں گا۔ اور جو برائی کا ارادہ کرے چاہئے کہ وہ اسے عمل میں نہ لائے کیوں کہ بعض اوقات وہ ایسے گناہ بھی کر بیٹھتا ہے کہ خدا کہتا ہے۔ قسم ہے اپنی عزت و جلال کی۔ اسکے بعد تجھے نہ بخشوں گا''۔

چوتھا سبب برزخ ہے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اعمال ظاہری کا تعلق آخرت سے نہیں ہے بلکہ دنیا سے ہے تاکہ ایک صحت مند۔ پرامن اور عادلانہ معاشرہ قائم کیا جا سکے۔ اور برزخ بھی اسی دنیا میں ہے۔ برزخ موت سے لیکر قیامت تک کے وقفے کو کہتے ہیں اور یہ ایک طویل سفر ہے جو انسان کو طے کرنا ہے۔ جب آپ کسی سفر پر جاتے ہیں تو اپنا کھانا۔ پانی۔ بستر اور دیگر

ضروریات کی اشیاء ضرور اپنے ہمراہ لیتے ہیں تا کہ سفر آرام سے کٹے۔ اگر آپ نے یہ چیزیں جنھیں زادِ راہ کہتے ہیں اپنے ساتھ نہ لیں تو منزلِ مقصود تک تو آپ پہنچ جائیں گے لیکن سفر بہت تکلیف میں گذرے گا۔ یہ اعمالِ ظاہری بھی زادِ راہ ہیں جنکے ذریعے انسان برزخ کی تکالیف سے بچ جاتا ہے۔ جناب امیرؑ فرماتے ہیں۔ "اپنے اعمال نیک کو جو تمھاری راہ آخرت کا توشہ ہیں اپنے ساتھ لے لو کیونکہ راستوں میں بہت سی خوفناک اور دشوار گذار راہیں ہیں جو تمھیں پیش آنے والی ہیں اور جنھیں تمکو عبور کرنا لازمی ہے"۔ (نہج الاسرار جلد ا صفحہ ۳۶۱)۔ اسی طرح امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ عمر بن یزید نے انکی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپؑ فرماتے تھے کہ ہمارے تمام شیعہ بہشت میں ہونگے اگر چہ گناہگار ہوں۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ میں نے سچ کہا اور خدا کی قسم سب بہشت میں ہونگے۔ میں نے عرض کی میں آپؑ پر فدا ہوں۔ بہت سے شیعوں کے ذمے گناہِ کبیرہ ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا لیکن روزِ قیامت تم سب پیغمبرؐ واجب الاطاعت اور انکے واجب الاطاعت وصیؑ کی سفارش سے داخلِ بہشت ہوگے۔ لیکن میں تمھارے لئے برزخ کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ (حق الیقین (اردو) جلد ۲ صفحہ ۸۴)

سنہرے اصول

یہ چند مختصر مختصر سوالات ہیں لیکن چونکہ اہم ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ انھیں شاملِ کتاب کردیا جائے تاکہ میرے تمام قارئین استفادہ کرسکیں۔

پہلا سوال

میرے ایک کرم فرمانے سوال کیا ہے کہ اگر کوئی نہ کوئی مذہب اختیار کرنا ضروری ہے تو اسلام میں بہت سے مذاہب موجود ہیں جن میں سے کوئی بھی مذہب اختیار کیا جا سکتا ہے کیونکہ مقصد سب کا ایک ہے یعنی حصولِ بہشت۔ ہر مذہب کے ماننے والے یہی کہتے ہیں کہ جنت کا راستہ ہمارے پاس ہے اور ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ کسی بھی مذہب کے اس دعوے کو جھٹلا سکیں کیونکہ اگر ہم اسے جھٹلائیں گے تو وہ ہمیں جھٹلائے گا۔ اسطرح ایک عام مسلمان کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ کون سا مذہب اختیار کرے۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم مذہب شیعہ ہی اختیار کریں اور باقی مذاہب کو نظر انداز کردیں؟

آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ یہ کس قدر اہم اور بنیادی سوال ہے جو ہر بیدار مغز انسان کے ذہن میں ہمہ وقت موجود رہتا ہے خواہ اسکا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ میری خواہش ہے کہ ہر شیعہ کے ذہن میں بھی یہی سوال پیدا ہو کیونکہ جو شخص بھی شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف اسی صورت میں شیعہ کہلائے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے جبکہ اسکے پاس مذہب شیعہ کی حقانیت کی واضح دلیل موجود ہو جسکی بنا پر مذہب شیعہ کو دیگر مذاہب پر ترجیح دی جاسکے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس پر خود بہ خود لفظ

شیعہ کا لیبل لگ گیا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر محض تقلید آباء میں خود کو شیعہ کہتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کسی لیبل کا نام نہیں ہے بلکہ چند مخصوص عقائد اور انکی مخصوص تشریح و تعبیر کا نام ہے اور شیعہ وہی ہے جو انکو جان کر اور سمجھ کر انکو اختیار کرے اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ انکو دیگر نظریات پر کیوں ترجیح دے رہا ہے۔

اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ ہزارہا مناظرے برپا ہو چکے ہیں اور لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر کوئی شخص واقعی تحقیق کرنا چاہے تو اسکے لئے حقیقت تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن انسان کی مدت عمر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات اگر ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہے کہ کوئی شخص تمام مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کر کے انکا آپس میں موازنہ کرے اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکے۔ پھر عملی بات یہ بھی ہے کہ جب انسان کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرتا ہے تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ کتابیں کھول کھول کر دکھا سکے اور اگر بالفرض دکھا بھی دے تو پھر حوالوں اور رراویوں پر بحث چھڑ جاتی ہے اور معاملہ جوں کا توں رہتا ہے لہٰذا کیوں نہ ایک کلیدی بات کی جائے جس سے انکار ممکن ہی نہ ہو۔ ہم نے بھی جو جواب منتخب کیا ہے وہ انتہائی مختصر مگر جامع ہے اور جس حوالے سے سوال کیا گیا ہے اسی حوالے سے جواب بھی دیا جا رہا ہے یعنی حصولِ بہشت۔

یہ حقیقت ہے کہ صحیح مذہب اختیار کرنے کا مقصد حصول بہشت ہی ہوتا ہے لہٰذا جو مذہب بہشت میں لے جانے کا صرف دعویٰ ہی نہ کرتا ہو بلکہ ضمانت بھی دیتا ہو وہی صحیح قرار پائے گا۔ اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ مذہب کا تعلق امام سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے بہتر (۷۲) فرقوں اور شیعہ فرقہ میں بنیادی فرق امام ہی کا ہے۔ قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ آخرت کا تعلق امام ہی سے ہوگا چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل ۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے "یوم ندعوا کلّ اناسٍ بامامہم"۔ ترجمہ:۔ "(یاد کرو) اس دن کو جبکہ ہم سب لوگوں کو انکے

امام کے ساتھ بلائیں گے''۔پس ثابت ہوا کہ آخرت کا تعلق امام سے ہےاور ہر شخص کواپنے اپنے امام کے ساتھ ہی محشور ہونا ہےاور یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی کا امام صحیح ہے تو اسکا انجام بھی صحیح ہےاور وہ یقیناً نجات پانے والا ہےاور جسکا امام غلط ہے اسکا انجام بھی غلط ہےاور وہ یقیناً ہلاک ہونے والا ہے کیونکہ آیت بتا رہی ہے کہ میدانِ حشر میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ پیچھے کون ہے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ آگے کون ہے یعنی امام کون ہے۔لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کونسا امام صحیح ہےاور کونسا غلط تا کہ غلط امام کو چھوڑ کر صحیح امام کو اختیار کیا جائے اور حسبِ وعدۂ قرآن اسی کے ساتھ محشور ہوکر نجات حاصل کی جائے جو ہمارا اصل مقصد ہےاور اس صحیح اور غلط کا فیصلہ بھی ہم خودنہیں کریں گے بلکہ قرآن سے پوچھیں گے کہ صحیح امام کون ہےاور غلط امام کون۔

پورے قرآن میں اماموں کی صرف دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔ان دو کے علاوہ کوئی تیسری قسم قرآن میں موجودنہیں لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ انہی دو اقسام میں سے کسی ایک قسم کے امام کو اختیار کریں۔اسکے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارۂ کار ہے ہی نہیں۔

۱۔انبیاء۷۳۔''اور ہم نے انھیں امام قرار دیا ہے کہ وہ ہمارے امر کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں''۔

یہ امام کی پہلی قسم ہےاور یہ ایسے امام ہیں جو منجانب اللہ ہیں اور اللہ ہی کے امر سے ہدایت کرتے ہیں۔انکی اپنی مرضی یا لوگوں کی پسند ناپسند کا امر ہدایت میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

۲۔قصص ۴۱۔''اور ہم نے انھیں ایسے امام قرار دیا جو جہنم کی طرف بلاتے ہیں''۔یہ امامت کی دوسری قسم ہے۔

پس جو شخص امام کی اول الذکر قسم سے تعلق نہ رکھتا ہو وہ یقیناً دوسری قسم کی

امامت کے زمرے میں آئے گا کیونکہ قرآن میں امامت کی کوئی تیسری قسم ہے ہی نہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امامت کی پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے امام کون ہیں اور ایسی امامت کا دعویٰ کس کس نے کیا ہے اور یہ جاننے کے بعد ہم ان میں موازنہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ لیکن اگر اس امامت کا مدعی کوئی نہ ہو سوائے ایک فریق کے تو پھر ہمارے پاس کوئی متبادل راستہ باقی نہیں رہ جاتا اور ہم مجبور ہیں کہ اس فریق کے دعوے کو تسلیم کریں کیونکہ کوئی اور دعویٰ موجود ہی نہیں کہ ہمیں موازنہ اور تقابل کی ضرورت درپیش آئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی امام ہمیں لازمی طور پر اختیار کرنا ہے تاکہ اسکے ساتھ محشور ہو سکیں۔

یہاں تک طے ہو گیا تو بس اب آخری بات۔

یہ چیلنج ہے پوری دنیا کو کہ وہ ائمہؑ اہلبیتؑ کے علاوہ کسی اور کا دعویٰ پیش کرے اور تاریخ میں ہمیں دکھائے کہ ان بارہ ائمہؑ کے علاوہ کسی ایک شخص نے بھی بعد وفات رسولؐ "امامت منجانب اللہ" کا دعویٰ کیا ہو اور کسی ایک شخص نے بھی اپنی پیروی کی صورت میں جنت کی ضمانت دی ہو سوائے ائمہؑ اہلبیتؑ کے جن میں سے ہر امام نے اپنے اپنے زمانے میں یہ ضمانت دی ہے۔

اگرچہ صرف ایک ہی مدعی ہونے کی صورت میں اسکے دعوے کو دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی کج بحث اس مقام پر بھی دلیل طلب کرتا ہے تو میں عرض کروں گا کہ دلیل امامت وہی ہوتی ہے جو دلیل نبوت کیونکہ دونوں کا بھیجنے والا ایک ہی ہے۔ دونوں صورتوں میں دلیل معجزہ ہوا کرتا ہے اور جس طرح ہمارے نبی کے معجزات سینۂ تاریخ پر ثبت ہیں بالکل اسی طرح ائمۂ اثناء عشر کے معجزات سے بھی مسلمانوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور آج تک کوئی انکی تردید

کرنے کی جراءت نہیں کر سکا۔

پس یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ مذہب جو نجات کی ضمانت دیتا ہے صرف اور صرف مذہب شیعہ اثناء عشریہ ہے جو "ائمۃً یہدون بامرنا" یعنی بارہ ائمہ اہلبیتؑ کو اپنا امام مانتا ہے اور انشاء اللہ انہی کے ساتھ محشور ہوگا۔

دوسرا سوال

یہ ایک عجیب وغریب سوال ہے اور دیکھنے میں انتہائی بچکانہ لگتا ہے لیکن میری نگاہ میں بہت اہم ہے اور ایسا سمجھنے پر مجھے موجودہ شیعہ معاشرے نے مجبور کیا ہے جہاں ایک عرصے سے یہ رسمِ بد رواج پا گئی ہے کہ علیؑ کو اسی حد تک مانو جہاں تک تمھاری عقل کی حد ہے۔ اس سے آگے اگر کسی نے بیان کردیا تو وہ نصیری ہے۔ خدا اپنا عذاب نازل کرے ان "بندگلی کے قیدیوں" پر جنھوں نے اپنی قیادت کو فروغ دینے کی خاطر ائمہ معصومینؑ کے مرتبہ و منزلت کو گھٹانا اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ اسی ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لئے میں نے اس سوال کا انتخاب کیا ہے۔ جو سوال کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "نصیری اور مومن میں فرق کیا ہے؟"۔

سوچنا یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو ایک نصیری مانتا ہے اور ایک مومن نہیں مانتا؟ بلکہ مومن تو نصیری سے کہیں بڑھکر علیؑ کو مانتا ہے۔ نصیری تو علیؑ کو خدا کہکر فارغ ہوجاتا ہے اور پھر خدا کی حد بندی بھی خود ہی کرتا ہے کہ خدا وہ ہے جو یہ کرتا ہے اور خدا وہ ہے جو وہ کرتا ہے۔ لیکن مومن تو اگر معرفت کے آخری کنارے تک بھی پہنچ جائے تو اسکی انتہا اعترافِ عجز ہی ہوتی ہے۔ معرفت کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین حاصل ہوجائے کہ وہ علیؑ کے حقیقی فضائل کو جان ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک سادہ سی بات ہے لیکن یہ یقین حاصل کرنا کس قدر مشکل کام ہے یہ ایک عارف ہی جانتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ الفاظ کے

ذریعے علیؑ کی جو بھی تعریف کی جائے گی وہ ناقص ہوگی کیونکہ الفاظ مخلوق ہیں اور علیؑ انکا خالق اور مخلوق کسی بھی صورت میں اپنے خالق کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ نصیری غریب کو کیا پتہ کہ علیؑ کیا ہے۔ وہ تو علیؑ کو خدا کہکر ہی پھولے نہیں سماتا۔ اسے کیا خبر کہ جو خدائی وہ علیؑ کو دے رہا ہے وہ خدائی تو علیؑ نے کبھی کی ٹھکرا دی۔ ایسی خدائی تو علیؑ کے غلام کیا کرتے ہیں۔ دراصل کسی کو نصیری کہنا یا خود کو نصیری کہلوانا آج کل ایک فیشن بن گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ معلوم کسی کو بھی نہیں کہ نصیری کیا ہوتا ہے۔ نصیری کی تعریف اگر آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں تو اسکی سیدھی سادی تعریف یہ ہے کہ نصیری وہ ہے جو علیؑ کو تو خدا مانتا ہے مگر علیؑ کے خدا کو نہیں مانتا یعنی اپنے خدا کی بات بھی نہیں مانتا اور مومن وہ ہے جو علیؑ کو بھی مانتا ہے اور علیؑ کی بات بھی مانتا ہے۔ جب علیؑ نے کہہ دیا کہ "میرا کوئی خدا ہے" تو پھر ہے اور یہی اصل توحید ہے جو مومن کو نصیری سے جدا کرتی ہے۔

یہ مذکورہ سوال کا ایک سادہ اور عام فہم جواب تھا لیکن اسکا فیصلہ کن جواب حاصل کرنے کے لئے ہم اپنے امائم سے طلب استعانت کرتے ہیں اور رجوع کرتے ہیں اصولِ کافی۔ کتاب توحید۔ باب ۵ کی دوسری حدیث کی طرف جس میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

"پس جس نے معنی کو چھوڑ کر اسم کی عبادت کی اس نے کفر کیا اور کسی کی بھی عبادت نہ کی اور جس نے اسم و معنی دونوں کی عبادت کی اس نے شرک کیا اور دونوں کی عبادت کی اور جس نے معنی کی عبادت کی نہ کہ اسم کی تو یہ توحید ہے"۔

توحید کی ایسی جامع تعریف کون کرسکتا ہے سوائے مظہرِ توحید کے۔ اس حدیث کو سمجھنے کے لئے ہم لفظ "اسم" پر مختصر سی گفتگو کرتے ہیں۔

اسم

ہر وہ شے جس سے کسی کا تعارف ہوتا ہو اسکا اسم کہلاتی ہے۔ مثلاً انسان ایک

معنی ہے اور اسکا تعارف اسکے جسم سے ہوتا ہے اس لئے اسکا جسم اسکا اسم ہے۔ معنی اور اسم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا چنانچہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنا اسم (یعنی جسم) ساتھ لیکر آتا ہے اور جب اسکو موت آتی ہے تو جسم بھی اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فانی کا اسم بھی فانی ہوتا ہے لیکن جو لافانی ہو اسکا اسم بھی لافانی ہوتا ہے۔ اگر معنی کی کوئی ابتداء نہیں ہے تو اسم کی بھی کوئی ابتداء نہیں ہے اور اگر معنی کی کوئی انتہاء نہیں ہے تو اسم کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ کیونکہ معنی اور اسم میں تفریق کرنا محال ابدی ہے۔ عملی زندگی میں جب ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو کسی کے بھی ذہن میں یہ نہیں ہوتا کہ ہم معنی سے گفتگو کر رہے ہیں بلکہ ہر کسی کا مخاطب جسم ہی ہوتا ہے۔ انسان کی اسی کمزوری کے پیشِ نظر اللہ نے اپنا تعارف کرانے کے لئے قرآن میں اپنی آنکھ۔ اپنی زبان۔ اپنے کان۔ اپنے چہرے۔ اپنے ہاتھ اور اپنے پہلو کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ وہ جسم و جسمانیت سے منزہ ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ بغیر اسم کے معنی کا تعارف ہو ہی نہیں سکتا اسی لئے اس نے سورۂ اعراف ۱۸۰ میں ارشاد فرمایا۔ ”اور اللہ کے خوبصورت نام ہیں پس اسے انہی سے پکارو“۔

اللہ کا اسم کون ہے؟

اللہ کا اسم وہی ہے جسکو اس نے اپنا ہاتھ۔ اپنا پہلو۔ اپنا کان۔ اپنا چہرہ۔ اپنی آنکھ اور اپنی زبان کہا ہے۔ یہی سمجھانے کے لئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ”وہ (اللہ) اسکا محتاج نہیں کہ اسکی ذات کا نام رکھا جائے لیکن اس نے کچھ نام اپنے لئے منتخب کئے جو اسکی ذات کا غیر ہیں۔ وہ انہی ناموں سے پکارا جاتا ہے کیونکہ اگر کسی نام سے نہ پکارا جاتا تو اسکی معرفت نہ ہوتی۔ پس سب سے پہلے اس نے اپنا نام علی العظیم رکھا (یعنی ظاہر کیا کیونکہ یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ معنی اور اسم میں جدائی ممکن نہیں) کیونکہ وہ (یعنی علی العظیم) تمام چیزوں سے اعلیٰ ہے۔ اسکا

(یعنی علی العظیم کا) **معنی** اللہ ہے۔علی العظیم اسکا اسم ہے۔وہ اسکا سب سے پہلا نام ہے۔وہ (علی العظیم) ہر شے سے بلند و برتر ہے''۔(اصول کافی۔کتاب توحید۔باب ۱۵۔حدیث ۲)

اسم اور معنی کے بارے میں ایک اجمالی خاکہ یقیناً آپکے اذہان تک پہنچ گیا ہوگا۔رہی یہ بات کہ اللہ کا وہ اسم کون ہے جو سب سے پہلے ظاہر کیا گیا اور جو سب سے بلند و برتر اور اعلیٰ ہے۔یہ جاننے کے لئے جب ہم نے خطبۃ البیان پر ایک نظر ڈالی تو اسم اللہ کو یہ فرماتے ہوئے پایا۔

''میں اللہ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اسم ہوں جو اعظم و اعلیٰ ہے''۔

اس تمام توضیح کے بعد امام جعفر صادقؑ کی حدیث کا مفہوم سمجھ میں آجانا چاہئے اور یہ ادراک ہوجانا چاہئے کہ مومن فقط معنی کی عبادت کرتا ہے۔اسم کی نہیں۔اسم فقط معنی کے تعارف کا ذریعہ ہوتا ہے۔جب یہ واضح ہوگیا کہ اللہ معنی ہے اور علیؑ اسم تو پھر یہ بھی ثابت ہوگیا کہ عبادت اللہ کی ہوگی علیؑ کی نہیں یہ اور بات ہے کہ معنی کے تمام صفات و کمالات اسم سے ہی ظاہر ہوتے ہوں۔اللہ نے بے جسم ہوتے ہوئے بھی اپنے اعضاء کا جو ذکر کیا ہے اسکا مقصد ہی یہ سمجھانا ہے کہ اسکی صفت بصیر کا ظہور عین اللہ سے ہوگا۔اسکی صفت سمیع کا ظہور اُذن اللہ سے ہوگا۔اسکی صفتِ تکلم کا ظہور لسان اللہ سے ہوگا۔اسکے حسن و جمال و جلال کا ظہور وجہ اللہ سے ہوگا۔اسکی صفتِ قدرت و خلاقیت و رزّاقیت و ربوبیت کا ظہور ید اللہ سے ہوگا لیکن اسکے باوجود معنی معنی رہے گا اور اسم اسم رہے گا۔نہ معنی اسم بن سکتا ہے اور نہ اسم معنی بن سکتا ہے۔یہی مفہوم ہے اس حدیثِ معصومؑ کا جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔''اللہ کے ساتھ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ کبھی ہم وہ بن جاتے ہیں اور کبھی وہ ہم بن جاتا ہے۔اسکے باوجود وہ وہ رہتا ہے اور ہم ہم رہتے ہیں''۔مومن معنی اور اسم کے اس نازک فرق کو پہچانتا ہے۔وہ عبادت صرف

معنی کی کرتا ہے اور وسیلہ اسم کو بناتا ہے جبکہ نصیری صرف اسم کی پرستش کرتا ہے اور اسم و معنی میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔

تیسرا سوال

یہ بھی ایک مختصر مگر اہم سوال ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ اس زمانے میں علماءِ خیر کون ہیں اور کہاں ہیں اور انھیں کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جلاءِ قلب و روح کے لئے صحبتِ عالم سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ اسی لئے امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا ہے۔ ''عالموں کے ساتھ مزبلوں (وہ مقام جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے) پر بیٹھنا بہتر ہے جاہل کے ساتھ مسندوں پر بیٹھنے سے''۔ (اصول کافی۔ کتاب العقل۔ باب ۹۔ حدیث ۲)۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھنا سال بھر کتابیں پڑھتے رہنے سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ عبادات کی اہمیت اپنی جگہ مگر فضیلتِ علم کا کوئی متبادل نہیں۔ جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''عالم کا اجر روزہ دار۔ نماز گذار اور فی سبیل اللہ غازی سے زیادہ ہے''۔ (کافی)۔ اور کافی ہی میں امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے۔ ''جب کوئی مومن عالمِ دین مر جاتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پڑتا ہے جسے کوئی شے بند نہیں کر سکتی''۔

عالم کون ہے؟

یہ بات ہم کشف الحقائق میں ثابت کر آئے ہیں کہ عالم سے مراد ائمہٴ طاہرینؑ ہیں اور باقی تمام مومنین طالبِ علم ہیں چاہے انکی علمی حیثیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ لہٰذا جو شخص ائمہٴ معصومینؑ سے علم لے گا وہی عام لوگوں کی نسبت سے عالم کہلائے گا اور معصومینؑ سے علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ احادیث ہیں جو ان سے وارد ہوئی ہیں لہٰذا عالم وہ ہوگا جو احادیث معصومینؑ سے واقف ہو نہ کہ علومِ

خادمہ مثلاً صرف ونحو ۔منطق ۔کلام ۔رجال اور اصول فقہ کا ماہر بن کر اپنے ظن و قیاس ہی کو علم سمجھتا ہو اور نہ ہی کثرتِ عبادت و ریاضت دلیلِ علم بن سکتی ہے ۔ذیل میں ہم دو احادیث نقل کر رہے ہیں جن سے ظاہر ہو جائے گا کہ عالم کا منصب کیا ہوتا ہے ۔

۱۔اصولِ کافی ۔کتاب عقل ۔باب ۳۔حدیث ۹ ۔

''راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے کہا کہ ایک شخص آپؑ کی احادیث کی روایت کرتا ہے اور انکو لوگوں میں مشہور کرتا ہے اور لوگوں کے اور آپؑ کے شیعوں کے قلوب کی اصلاح کرتا ہے ۔ دوسرا شخص عابد ہے مگر وہ روایت نہیں کرتا آپؑ کی احادیث کو ۔ان میں افضل کون ہے؟ ۔فرمایا ۔''ہماری احادیث کا روایت کرنے والا اور ہمارے شیعوں کے قلوب کی اصلاح کرنے والا ہزار عابدوں سے بہتر ہے''۔

۲۔اصول کافی ۔کتاب عقل ۔باب ۳۔حدیث ۸ ۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ۔''جو عالم اپنے علم سے فائدہ حاصل کرتا ہے وہ ستر ہزار عابدوں سے بہتر ہے''۔

ان احادیث سے ظاہر ہوا کہ عالم کے دو کام ہوتے ہیں ۔احادیث معصومینؑ کو حاصل کر کے اپنی اصلاحِ قلب کرنا اور پھر انھیں لوگوں سے بیان کر کے لوگوں کی اصلاحِ قلب کرنا ۔پس سمجھ لینا چاہئے کہ جو شخص مدعی علم ہو لیکن لوگوں کے دلوں کو ذکرِ اہلبیتؑ سے دور کرتا ہو اور عمل کے نام پر انھیں عقائد سے غافل کرتا ہو ۔اہلبیتؑ کے حق میں مقصر ہو اور انکے بعض فضائل کا انکار کرتا ہو وہ ہرگز ہرگز عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے ۔اب رہا اصل سوال کہ حقیقی علماء کون ہیں اور کہاں ہیں تو کون اور کہاں کا تو جواب نہیں دیا جا سکتا البتہ ہم چند اصول بیان کئے دیتے ہیں جنکو کسوٹی بنا کر ہر مدعی علم کو پرکھا جا سکتا ہے اور اصلی اور جعلی کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے اور یہ اصول ہم اس لئے بیان کر رہے ہیں تا کہ ہر سطح کی عقل

اس فرق کو پہچان سکے اور گمراہی سے خود کو بچا سکے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کسی کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ایک گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جو فوراً یہ بھانپ لیتی ہے کہ جو شخص عالم ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے وہ کتنے پانی میں ہے۔

وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ:۔

۱۔ کیا وہ شخص اپنے لئے یا کسی اور کے لئے کوئی ایسے القاب تو استعمال نہیں کر رہا جو صرف معصومینؑ کے لئے مخصوص ہیں؟ کیونکہ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ خود کو معصومینؑ کا غلام سمجھتا ہے یا مدِ مقابل۔ اور اسکی دلیل جناب امیر المومنینؑ کا وہ قول ہے جو آپؑ نے اپنے خطبہ نورانیہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ ''پس ویل اور دوزخ وعذاب ہے اس شخص کے لئے اور کامل ویل و عذاب و دوزخ ہے اسکے لئے جو ہمارے فضائل کا انکار کرتا ہے اور ہماری خصوصیات کو عام کرتا ہے اور ہمارے خطابات کو عام کرتا ہے''۔

۲۔ کیا وہ شخص معصومینؑ کے فضائل کو بے چون و چرا قبول کرتا ہے؟ یا کچھ کو تسلیم کرتا ہے کچھ میں توقف کرتا ہے اور کچھ کا انکار کرتا ہے؟ اور اسکی دلیل مندرجہ بالا خطبے ہی کا ایک اور قول ہے جس میں مولائے کائنات فرماتے ہیں۔ ''مومن کامل وہ شخص ہے کہ اسکو جب ہمارا کوئی امر پہنچے تو فوراً اسکو خوشی سے قبول کرے۔ ہرگز چون و چرا نہ کرے اور ذرہ برابر شک نہ کرے اور رد نہ کرے۔ پھر فرمایا۔ یعنی ہم کو ہی خدا مت سمجھ لو اور اسکے سوا جو چاہو ہماری تعریف و توصیف کرو پھر بھی تم ہماری اصل حقیقت کو درک نہیں کر سکو گے۔ اور جو شخص ان باتوں میں شک کرے اور عناد کر لے اور انکار کرے یا ٹھہر جائے (توقف کرے) قبول کرنے سے یا متحیر ہو جائے کہ ہیں! یہ کیا اوصاف ہیں پھر شبہات پیدا کرے تو وہ شخص مقصر ناصبی ہے چاہے وہ ہماری ولایت کا اقرار ہی کیوں نہ کرتا ہو''۔

۳۔ کیا وہ شخص تشہدِ نماز میں شہادتِ ثالثہ یعنی علیؑ ''ولی اللہ کو لازم جان کر پڑھتا

ہے؟ جسکی دلیل مذکورہ خطبے میں جناب امیرؑ کا ایک اور قول ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''جو شخص میری ولایت کا اقرار نہیں کرے گا اسکو محمدؐ کی نبوت کے اقرار سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آگاہ رہو کہ یہ دونوں شہادتیں لازم وملزوم ہیں''۔ نیز امالی صدوق میں امام رضاؑ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا۔ ''میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو قبول نہیں کروں گا جب تک وہ احمدؐ کی رسالت کے ساتھ علیؑ کی ولایت کا اقرار نہ کرے''۔

یہ بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد اب ہم وہ اصول بیان کرتے ہیں جنکی مدد سے صحیح عالم کو پہچانا جا سکتا ہے اور جعلی عالم سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

پہلا اصول

۱۔ اصولِ کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۵۔ حدیث ۶ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''جس نے علم دین کو سکھایا اس پر عمل کیا اور **فی سبیل اللہ** تعلیم دی تو ملکوتِ سماوات میں وہ بڑی عزت کے ساتھ پکارا گیا اور اسکے لئے کہا گیا کہ اس نے خوشنودئ خدا کے لئے عمل کیا اور خوشنودئ خدا کے لئے دوسروں کو سکھایا''۔

۲۔ اصولِ کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۱۱۔ حدیث ۳۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔
''علم کی زکوۃ یہ ہے کہ لوگوں کو تعلیم دو''۔

۳۔ اصولِ کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۱۵۔ حدیث ۴۔ فرمایا امام جعفر صادقؑ نے۔
''جب تم کسی عالم کو امورِ دنیا میں منہمک پاؤ تو امورِ دین میں اس پر اعتماد نہ کرو۔ ہر محب کو وہی ملتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔ نیز فرمایا کہ خدا نے وحی کی داؤدؑ کی طرف کہ میرے اور اپنے درمیان ایسے عالم کو قرار نہ دو جو دنیا کا عاشق ہو کیونکہ وہ تمکو محبت کے راستے سے روک دے گا۔ یہ لوگ میرے خاص بندوں کے لئے راہزن ہیں (یعنی انکو مجھ تک نہیں پہنچنے دیتے اور خود کو درمیان میں

حائل کر لیتے ہیں''۔

مندرجہ بالا احادیث سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ عالم وہی ہے جو دین کو دنیا کمانے کے لئے استعمال نہ کرے۔لہذا اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس نے اپنا ظاہری حلیہ علماء جیسا بنایا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اسے عالم کی حیثیت سے جانیں تو ایسے شخص سے دور بھاگیں۔اور جب آپ دیکھیں کہ کوئی مدعی علم ایک دوکان کھول کر بیٹھا ہوا ہے اور دین کو تجارت بنا کر کسی بھی صورت میں۔بلاواسطہ یا بالواسطہ۔دنیا کمارہا ہے چاہے وہ مال کی شکل میں ہو یا شہرت کی تو آپ فوراً اپنے کان کھڑے کرلیں اور خود کو بچائیں ایسے نوسر بازوں سے۔

دوسرا اصول

مال کھانے کے علاوہ علم دین سے ایک اور فائدہ بھی حاصل کیا جاتا ہے اور وہ ہے اپنے نشۂ اقتدار کو پورا کرنا اور ایسے لوگ لازماً عوام کو دینِ خدا سے ہٹانے والے اور ایک نئی راہ پر ڈالنے والے ہوتے ہیں اور عام طور پر روحانیت کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں۔یاد رکھئے کہ شیطان رجیم صرف دشمنیٔ معصومؑ سے ہی لوگوں کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ اسکا ایک جال یہ بھی ہے کہ وہ ابتداء میں لوگوں کو محبت اہلبیتؑ کی طرف دعوت دیتا ہے۔اسطرح سادہ لوح شیعہ اسکی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔جب اسے یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اب یہ لوگ میرے قبضے میں آگئے ہیں تو پھر وہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر پینترا بدلتا ہے۔ابتداء میں چھوٹے چھوٹے دعوے کرتا ہے مثلاً یہ کہ امام زمانہؑ یا حضرت علیؑ اس سے بالمشافہ ملاقات کرتے ہیں۔جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ان دعووں کو قبول کرتے کرتے انکے عادی ہوگئے ہیں تو پھر ایک دم کوئی بہت بڑا دعویٰ کر دیتا ہے اور اپنا ایک الگ دائرۂ اثر اور ایک جدا مکتبِ فکر بنالیتا ہے اور اس وقت تک لوگ اسکے جال میں اس حد تک گرفتار ہو چکے ہوتے ہیں کہ اب انکے لئے باہر نکلنا ممکن ہی نہیں رہتا بلکہ اب وہ خود اسکے ایجنٹ بن جاتے ہیں اور دوسروں کو اسکے جال میں

پھانسنے لگتے ہیں۔

لہٰذا جب آپ دیکھیں کہ کوئی مدعی علم ایک گروپ بنا کر خود مسندِ قیادت پر مرشد بن کر بیٹھا ہوا ہے اور لوگ اسکے سامنے طالبِ علم بن کر نہیں بلکہ مرید بن کر بیٹھے ہوئے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے اور فوراً اپنے بچاؤ کی فکر کیجئے۔

یہاں میں اپنے قارئین کے لئے ایک وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو انکے لئے مفید ہوگی اور وہ یہ کہ علم حاصل کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ایک مادی اور دوسرے روحانی۔ ذریعہ مادی کو خبر و مشاہدہ و تجربہ کہتے ہیں۔ اسی کے ذریعے سے علم حاصل کرکے لوگ علماء کہلاتے ہیں۔ ذریعہ روحانی کو مکاشفہ کہتے ہیں یعنی بغیر کسی خارجی ذریعہ کے حقیقتِ حال کا دل پر خود بہ خود منکشف ہو جانا۔اس کام کے لئے لوگ مراقبے میں جاتے ہیں اور چلّہ کاٹتے ہیں۔یہ صورتِ حال ایک طالبِ علم کیلئے انتہائی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور کبھی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص مکاشفہ کا دعویٰ کر رہا ہے وہ سچا ہے یا جھوٹا کیونکہ جو کچھ وہ بیان کرتا ہے اسکی اسکے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔عام طور پر لوگ کسی کے کمالات کو دیکھ کر اسکے گرویدہ ہو جاتے ہیں حالانکہ جناب امیر المومنینؑ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے کیونکہ کسی میں کوئی کمال پیدا ہو جانا ہرگز دلیل حق نہیں بن سکتا۔کچھ ذہنی اور جسمانی ریاضتیں ہیں جن سے ایسے کمالات پیدا ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی شخص بلا تفریق مذہب و ملت ایسی ریاضتیں کرکے کمالات حاصل کر سکتا ہے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلم اقوام میں بھی بہت سے اہلِ کمال موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔اس لئے میں آپکو ایک ایسا اصول بتاتا ہوں جس پر عمل کرکے آپ کبھی کسی سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔

یہ بات جان لیجئے اور دل میں پختہ کر لیجئے کہ **کسی کا خواب یا**

مکاشفہ خود اس پر تو حجت ہوتا ہے لیکن اسکے علاوہ دوسروں پر حجت نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی کو امامؑ خواب میں آ کر کوئی حکم دیں تو اس پر واجب ہے کہ اس حکم پر عمل کرے لیکن اگر وہ دوسروں سے بیان کرے کہ خواب میں امامؑ نے مجھے فلاں حکم دیا ہے تو دوسروں کے لئے اس حکم پر عمل کرنا حجت نہیں ہوگا۔ اس اصول سے جہالت ہی وہ سبب تھا جسکی بنا پر کچھ عرصے پہلے ایک عظیم سانحہ رونما ہوا۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک لڑکی نے خواب میں امامؑ کو دیکھا اور لوگوں کو بتایا کہ امامؑ نے حکم دیا ہے کہ تم لوگ جست کے بڑے بڑے صندوق بنواؤ اور ان میں بیٹھ کر سمندر میں اتر جاؤ تو اسطرح تم روضۂ امام حسینؑ پر پہنچ جاؤ گے۔ چنانچہ ایک پورا قافلہ اس نیت سے کراچی پہنچ گیا اور وہی کیا جو انکے زعم میں حکمِ امامؑ تھا۔ چند ہی لمحے گذرے تھے کہ سمندر کے تھپیڑوں نے صندوقوں کے اور ان لوگوں کے جو صندوقوں کے اندر تھے چیتھڑے اڑا دیئے اور خدا جانے کتنے لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ نتیجہ تھا محض اس مسئلے سے ناواقفیت کا۔ صاحبانِ مکاشفہ کے پیچھے لگنے سے یہی قباحتیں پیدا ہوتیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے معتقد اگرچہ نیک نیت اور مخلص ہوتے ہیں لیکن مذکورہ مسئلے سے جاہل ہونے کی وجہ سے اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ حقیقی اہل اللہ ایک گوشے میں بیٹھے رہتے ہیں اور اپنا تماشا نہیں بناتے۔ کوئی کوئی صاحبِ نصیب ہوتا ہے جو اتفاق سے ان تک پہنچ پاتا ہے۔ اسکے برخلاف یہ اہلِ مراقبہ اور اہلِ مکاشفہ اپنے گرد عوام و خواص کا ایک مجمع اکھٹا کیے رہتے ہیں اور انکا مقصد یا تو مال کمانا ہوتا ہے یا لوگوں کا مرکزِ نگاہ بننا اسی لئے اصولِ کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۱۵۔ حدیث ۶ میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''جس نے علم کو اس لئے حاصل کیا کہ وہ علماء کی مجلس میں فخر کریں یا جاہلوں کی مجلس میں بحث کریں یا اس غرض سے کہ لوگ اسکی طرف توجہ کریں تو ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم میں ہے''۔

یاد رکھیئے کہ حقیقی علماءِ دین شہرت سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر

سے بھاگا جاتا ہے۔وہ کبھی لوگوں کو اپنی طرف دعوت نہیں دیتے البتہ لوگوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ انھیں تلاش کریں اور اپنی علمی اور روحانی پیاس بجھائیں لیکن انھیں تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ وہ کسی بازار کے چوک پر یا کسی میلے ٹھیلے میں یا کسی روحانی دربار اور آستانۂ عالیہ میں نہیں ملیں گے بلکہ کسی گوشۂ تنہائی وگمنامی میں نظر آئیں گے اور انکا کام فقط یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے شبہات دور کریں اور جو علم کا جتنا اہل ہے اتنا ہی علم اسے دیں۔نہ کم نہ زیادہ۔وہ کبھی لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے بلکہ انکا اوڑھنا بچھونا قناعت اور اللہ پر توکل ہوتا ہے۔

یہ تو تھیں وہ کسوٹیاں جن پر آپ ہر مدعیٔ علم کو پرکھ سکتے ہیں لیکن سوال کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ ویسے تو ہر زمانے میں عالم کا وجود نادر ہی رہا ہے لیکن خاص طور پر یہ زمانہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں انتہائی مشکل اور کٹھن زمانہ ہے۔اس دور کے بارے میں حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔"اس زمانے میں حق کسی ایک جگہ اکٹھا نہیں ملے گا بلکہ جگہ جگہ بکھرا پڑا ہوگا اور مومن کو اسے جگہ جگہ سے چننا پڑے گا"۔لہذا علم جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کریں اور بقولِ امیر المومنینؑ اگر منافق سے بھی لینا پڑے تو ضرور لیں لیکن احتیاط لازم ہے اور اسکے لئے چند امور کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔

تیسرا اصول

یہ جو مشہور کردیا گیا ہے کہ حصولِ علمِ دین ایک کل وقتی (فل ٹائم) کام ہے ایک دھوکا اور فریب ہے جسکا مقصد عام لوگوں کو حصولِ علم سے باز رکھنا ہے اور انھیں یہ باور کرانا ہے کہ اگر حصولِ علمِ دین کی طرف متوجہ ہوئے تو بھوکے مرجاؤ گے اور اسکی اصل غایت علمِ دین پر ایک مخصوص ٹولے کی اجارہ داری قائم کرنا ہے۔علومِ دنیاوی کی طرح علومِ دینی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں کی گئی۔علوم دنیاوی مثلاً انجینئرنگ۔میڈیکل سائنس اور قانون وغیرہ میں ایک خاص مقدارِ علم معین

ہوتی ہے جسے حاصل کئے بغیر انسان انجینئر۔ڈاکٹر یا قانون داں نہیں بن سکتا لیکن علمِ دین کے لئے ایسی کوئی مقدار معیّن نہیں۔جو جتنا جانتا ہے اتنے علم کا وہ عالم ہے۔البتہ وہ مسائل جو ہمیں روزمرہ زندگی میں درپیش آتے ہیں انکا علم رکھنا یقیناً ضروری ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں ہے جسکے لئے انسان اپنی پوری زندگی وقف کردے۔ایسے مسائل محدود ہیں اور کتابی صورت میں ہماری دسترس میں ہیں۔ ہر مسئلے کا حل بوقتِ ضرورت کتاب کھول کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔حقیقی علم وہ ہے جس سے ہم معرفت امامؑ حاصل کرسکیں اور یہ علم یقیناً ہماری پوری زندگی پر محیط ہے۔اگر انسان دوسری مصروفیات کی طرح حصولِ علمِ دین کو بھی اپنی ایک باقاعدہ مصروفیت بنالے تو وہ اپنی ذات میں خود ایک ادارہ بن جاتا ہے۔آخر جو لوگ ائمہ معصومینؑ سے تحصیلِ علم کرتے تھے وہ صبح سے شام تک ائمہؑ کے پاس ہی تو نہیں بیٹھے رہتے تھے۔وہ اپنا دنیاوی کاروبار بھی کرتے تھے۔محنت مزدوری بھی کرتے تھے۔گھربار بیوی بچوں کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے تھے۔ائمہؑ کے پاس تو وہ ایک مختصر وقفے کے لئے بیٹھتے تھے اور اس مختصر سے وقفے نے انھیں ایسا علم دے دیا کہ وہ آج تک علماء کے نام سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے تو یہ بہانہ بنا کر کہ ہم علمِ دین حاصل کررہے ہیں کبھی اپنا بوجھ دوسروں پر نہیں ڈالا۔علمِ دین ہرگز یہ تقاضا نہیں کرتا کہ آپ سارے کام کاج چھوڑ کر تن من دھن سے صرف اسی میں لگ جائیں۔علمِ دین تو آپ سے بہت تھوڑا وقت مانگتا ہے۔بابِ مدینۃ العلم کا ارشاد ہے " تمام رات عبادت کے لئے کھڑے رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی ایک گھنٹہ ہمارے امر کے بارے میں تفکر کرے اور پھر سو جائے"۔

لہٰذا سب سے پہلے تو آپ اپنی روزمرہ مصروفیات میں سے کچھ وقت دینی مطالعہ کے لئے وقف کریں اور باقاعدہ مطالعہ کا خود کو عادی بنائیں۔اپنی عمر کے بارے میں فکرمند نہ ہوں کیونکہ حصولِ علم کے معاملے میں عمر کی کوئی قید نہیں۔اگر کوئی علم کے راستے میں پہلا قدم اٹھاتا ہے اور مر جاتا ہے تو فردائے قیامت میں اللہ

اسے علماء کے ساتھ محشور فرمائے گا۔ یہ اسکا وعدہ ہے۔پوچھنے میں کبھی شرم محسوس نہ کریں۔اگر ایک سے جواب نہ ملا تو دوسرے سے مل جائے گا۔اس سے بھی نہ ملا تو تیسرے سے مل جائے گا۔سفر کا جاری رکھنا شرط ہے۔حصولِ منزل میں کوئی ابہام نہیں۔

اور اب میں وہ سنہرے اصول بیان کرتا ہوں جنکے ذریعے علمِ صحیح کا حصول ممکن ہوتا ہے:۔

۱۔کسی ایک کے ہو کر نہ رہ جایئے اور کسی کے بارے میں بھی یہ گمان نہ کیجئے کہ سارے کا سارا علم اسی کی ذات میں جمع ہو گیا ہے۔

۲۔غیر معصوم کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھئے اور کبھی اسکی بات کو بغیر دلیل و برہان قبول نہ کیجئے۔اس معاملے میں آپکو پولیس کا سا رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔

۳۔کبھی کسی سے اسکی ذاتی رائے معلوم نہ کیجئے بلکہ ہمیشہ قولِ معصوم جاننے کی کوشش کیجئے۔

۴۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ چاہے کتاب پڑھیں یا کسی خطیب کی تقریر سنیں دونوں صورتوں میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں اور ذہن کو بیدار رکھیں اور اپنے اندر یہ استعداد پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ مطالعے یا سماعت کے دوران ہی آپکا ذہن صحیح اور غلط کو الگ الگ کرتا رہے۔خطابت ایک جادو ہے جو سننے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جادو تین چیزوں سے کیا جاتا ہے۔آنکھ سے۔آواز سے اور خیال سے۔ خطیب اگر واقعی فنِ خطابت کا ماہر ہے تو جتنی دیر وہ تقریر کر رہا ہوتا ہے اتنی دیر تک پورا مجمع اسکا قیدی ہوتا ہے اور وہ اس دوران مجمعے سے جو چاہے منوا سکتا ہے چاہے صحیح ہو یا غلط کیونکہ اس وقت سننے والوں کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہوتی ہے۔اچھا سامع وہ ہے جو اسکے دامِ اثر میں نہ آئے۔اپنی فہم و فراست اور

قوتِ نقد و نظر کو بحال رکھے اور خطیب کے ایک ایک جملے کو الگ الگ کرکے سنے اور وہیں بیٹھے بیٹھے صحیح کو غلط سے الگ کرتا رہے۔ اس صورت میں جو علم وہ حاصل کرے گا وہ خالص اور صحیح ہوگا۔

چوتھا سوال

یہ بھی ایک انتہائی مختصر سوال ہے جو امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث مبارکہ سے متعلق ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔ ''جو کوئی بھی حسینؑ پر رویا۔ رلایا یا رونے کی شکل بنائی اس پر جنت واجب ہوگئی''۔ اسکے بارے میں ایک صاحب نے مجھ سے مندرجہ ذیل سوال کیا:۔

''کلامِ معصومؑ میں شک کرنے یا اسکا انکار کرنے کی ہم جراءت نہیں کرسکتے لیکن چونکہ ہماری عقل محدود ہے اس لئے بعض اوقات ہم حدیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ پاتے۔ میرے ذہن میں یہ شدید الجھن ہے کہ رونے کی شکل بنانا یا جھوٹ موٹ رونا تو ریاء کاری ہے اور میرے خیال کی تصدیق مرزا دبیر مرحوم نے بھی کی ہے۔

ع یاں اشکِ ریائی کا بھی ہے مول بہشت

میرا سوال یہ ہے کہ کیا ریاء کاری کوئی ممدوح چیز ہوسکتی ہے؟ اور کیا واقعی ریاء کاری بہشت کی قیمت بن سکتی ہے؟''۔

اپنے برادرِ مومن کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ اول تو معاملاتِ دین میں شعراء کے کلام کو بطورِ حجت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ دوئم یہ کہ خود مرزا دبیر نے بھی اس معاملے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ سوئم یہ کہ رونے کی شکل بنانے کو اگر دلیلِ محبت تسلیم نہ بھی کیا جائے تب بھی اسے دلیلِ مروت ضرور ماننا پڑے گا۔ عام زندگی میں بھی جب کوئی مر جاتا ہے اور ہم اسکے لواحقین سے تعزیت کے لئے جاتے ہیں تو رونے کی شکل بنا کر ہی جاتے ہیں۔ عام مرنے والوں کے لئے رونے کی شکل بنانے کو آج تک کسی نے نہ تو ریاء کاری کہا اور نہ سمجھا اس لئے غمِ حسینؑ میں رونے کی شکل بنانے پر منفی طرزِ فکر اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر

کسی پر کسی بھی وجہ سے رقّت طاری نہ ہو رہی ہو تو کیا اہلبیتؑ سے مروت بھی چھوڑ دی جائے؟۔

دراصل غمِ حسینؑ میں ریاء کاری کا شوشہ سب سے پہلے شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب ''منتہی الآمال'' میں چھوڑا تھا اور سائل کو بھی الجھن اس لئے ہو رہی ہے کہ انکے ذہن میں ریاء کاری کا مفہوم واضح نہیں ہے۔لہذا اس الجھن کو رفع کرنے کے لئے سب سے پہلے ریاء کاری کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ریاء کاری کا عام مفہوم یہ ہے کہ کوئی کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کیا جائے۔

حضراتِ معصومینؑ نے ریاء کاری کی جو تعریف بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے:۔

''انسان کا کوئی کام کرنا اور پھر یہ خواہش رکھنا کہ دوسرے لوگ اس کام پر اسکی تعریف کریں ریاء کاری کہلاتا ہے''۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مجلسِ حسینؑ میں کوئی بھی رونے والوں کی سی شکل بنانے والا یہ توقع ہرگز نہیں رکھتا کہ اس بات پر دوسرے لوگ اسکی تعریف کریں گے۔مجلسِ عزا میں کس کو اتنا ہوش ہوتا ہے کہ وہ ہر چہرے کا جائزہ لیتا رہے اور مقدارِ گریہ کا اندازہ کرتا رہے۔نہ ہی رونے والوں کو کوئی انعام ملتا ہے۔لہذا کسی بھی اعتبار سے رونے کی شکل بنانے کو ریاء کاری نہیں کہا جا سکتا۔البتہ خلوص شرط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسینؑ وہ بحرِ جود وسخا ہے جس نے جنت کے دروازوں کو پاٹوں پاٹ کھول دیا ہے۔معمولی معمولی باتوں پر جنت عطا کر دینا حسینؑ کا ایک ادنیٰ کرم ہے۔صرف رونے کی شکل بنانے پر جنت عطا کر دینا حسینؑ کے لئے کوئی بڑی بات نہیں لیکن اسے معیارِ ایمان نہیں سمجھ لینا چاہئے۔مومن کی شان اس سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے کہ کوئی رلانے والا اپنا سر وزانو پیٹ پیٹ کر مصائب بیان کرے تب ہی مومن روئے۔یہ دروازہ تو حسینؑ نے عام لوگوں کے لئے کھولا ہے۔مومن مصائب سن کر نہیں روتا بلکہ مصائب کو یاد کر کے روتا ہے

اسی لئے وہ کسی رلانے والے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ غمِ حسینؑ کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے ہر حال میں حسینؑ یاد رہتا ہے اور چونکہ خود حسینؑ مظلوم نے فرمایا ہے۔ ''میں قتیلِ عبرت ہوں مومن جب بھی مجھے یاد کرے گا تو روئے گا''۔ اس لئے غمِ حسینؑ میں رونے کے لئے مومن کو کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ حسینؑ ہر حال میں اسکے دل میں بسا رہتا ہے اسی لئے وہ ہر حال میں روتا ہے۔ وہ تو فضائل سن کر بھی روتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ جنکی وجہ سے کائنات کو وجود ملا ہو کیا انکا حق وہی تھا جو کربلا میں ادا کیا گیا؟

بقولِ غالب

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اسکو

پانچواں سوال

یہ سوال مجھ سے اتنے لوگوں نے پوچھا ہے کہ اب مجھے گمان ہونے لگا ہے کہ شاید ہر شخص کے دل میں یہ سوال موجود ہو۔ سوال یہ ہے کہ ''بعض اوقات دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں جن سے دل کانپ اٹھتا ہے اور یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم کافر یا منافق تو نہیں ہو گئے؟ از راہ کرم اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور ان وسوسوں کا مطلب کیا ہے اور ہمارے ایمان پر انکا کیا اثر پڑتا ہے؟''۔

یہ سوال ایسا ہے جسکا جواب ہر مومن کے پاس ہونا چاہئے ورنہ وہ زندگی بھر پریشان ہی رہے گا۔ جب شیطان کو نکالا گیا تو وہ یہ کہہ کر چلا تھا کہ ''پروردگار تو نے جو مجھے اغوا کیا ہے تو میں بھی تیرے صراطِ مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا اور تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا''۔ ہر اسلامی فرقہ یہ دعویٰ رکھتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر ہے لیکن جس سے بھی پوچھو کہ شیطان کہاں ہے تو وہ دوسرے فرقوں کی طرف اشارہ

کرے گا۔حالانکہ سامنے کی بات ہے کہ جو بھی صراطِ مستقیم پر ہے شیطان اسی کے پاس ہے۔ اسی لئے امام محمد باقرؑ نے ارشاد فرمایا۔"شیطان ہمارے شیعوں پر تعینات ہے"۔(بحارالانوار(اردو) جلد۴صفحہ۸۵)۔لہٰذا اس بات کا یقین کر لیں کہ شیطان آپ ہی کے درمیان موجود ہے چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہو اور اسکا کام **صرف** آپکو گمراہ کرنا ہے۔باقی دنیا سے اسے کوئی مطلب نہیں کیونکہ انھیں تو وہ پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا۔اور آپ اس بات سے واقف ہیں کہ شیطان گمراہ کرتا ہے دل میں وسوسے ڈال کر لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ وسوسہ مخصوص ہے مومن سے۔دلیل کے طور پر ہم ایک حدیث پیغمبرؐ نقل کرتے ہیں جسے ہم نے حق الیقین (اردو) جلد۲صفحہ۳۳۰ سے اخذ کیا ہے:۔

"ایک گروہ نے رسولؐ خدا سے چند امور کی شکایت کی جوانکے دلوں میں پیدا ہوتی تھیں کہ اگر ہم کو ہوا ہماری جگہ سے اڑا کر بلند کرتی اور زمین پر پٹخ دیتی کہ ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تو ہم کو اس سے زیادہ محبوب تھا کہ ان باتوں کا ہم ذکر کریں۔حضرتؐ نے فرمایا۔کیا ان (امور) کو اپنے نفس میں پاتے ہو؟ (یعنی کیا تمھیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ وسوسے تھے؟) ان لوگوں نے عرض کی۔ہاں۔فرمایا۔اسی خدا کی قسم جسکے قبضے میں میری جان ہے کہ یہ صریح اور خالص ایمان ہے"۔لہٰذا جب بھی آپکے دل میں وسوسہ آئے تو اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ یقیناً مومن ہیں اور وسوسے کو دور کرنے کے بعد اللہ کا شکر ادا کریں۔

یہ بات اپنے مقام پر بالکل ٹھیک سہی لیکن اسکے لئے شرط لازمی یہ ہے کہ آپ وسوسے کی پہچان رکھتے ہوں کیونکہ وسوسے سے ملتی جلتی چیزیں اور بھی ہیں۔ایسا نہ ہو کہ آپ ان چیزوں کو وسوسہ سمجھتے رہیں اور خوش ہوتے رہیں اور نادانستگی میں ہلاکت کے دہانے پر جا پہنچیں۔

ہوتا یہ ہے کہ کچھ ہستیوں سے ہم عقیدت رکھتے ہیں اور ان سے

عقیدت رکھنے پر ہمارے ایمان کا دارومدار ہوتا ہے۔مثلاً خداوند ذوالجلال۔ انبیاءواوصیاءواولیاء۔خصوصاً حضرتِ ختمی مرتبتؐ اورانکا طاہرومطہر خانوادہ۔ائمۂ معصومینؑ اورانکے سندیافتہ وفادار وصاحبانِ معرفت اصحاب اورشہدائے کربلا وغیرہ۔کبھی کبھی ان ہستیوں کے بارے میں ایسے نامناسب خیالات دل میں آجاتے ہیں جن سے آدمی پریشان ہوجاتا ہے۔جب بھی کوئی ایسا خیال دل میں آئے تو آپکا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اسے جانچیں اورمعلوم کریں کہ یہ کیا چیز ہے۔ایسے خیالات کو پرکھنے کے لئے چند اصول آپکی خدمت میں پیش کئے جارہے ہیں۔

بہت اہم

۱۔اگرایسا خیال آنے پر آپکا قلبی رجحان انکار کی طرف ہو یعنی آپکا دل اس خیال سے انکار کرتا ہو اور آپکو اس خیال سے دکھ پہنچ رہا ہو اور آپ چاہتے ہوں کہ یہ خیال جلد سے جلد دور ہوجائے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ''وسوسہ'' ہے اوراسکو دور کرنے کیلئے یا تو ''لاالہٰ الااللہ'' پڑھیے یا پھر ''لاحول ولاقوۃ الاباللہ'' پڑھیے اوراس وقت تک پڑھتے رہیے جب تک کہ یہ وسوسہ زائل نہیں ہوجاتا اورآپکا دل مطمئن نہیں ہوجاتا۔

۲۔اگرایسا خیال آنے پرآپ کشش وپنج میں پڑجائیں اورصحیح اورغلط میں تمیز کرنے کے قابل نہ رہیں تو ایسی کیفیت کو ''شبہہ'' کہتے ہیں۔یہ مقام تذبذب ہوتا ہے جہاں انسان کوئی فیصلہ نہیں کرپاتا۔اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ خطرناک ترین مقام ہے لہٰذا ایسی صورت میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اورچاہیۓ کہ فوراً کسی صحیح العقیدہ اورباخبر شخص کی طرف رجوع کیا جائے اورصحیح وضاحت حاصل ہوجانے کے بعد اللہ سے توبہ کی جائے اورآئندہ ثابت قدم رہنے کا مصمم ارادہ کیا جائے۔اس معاملے میں ذراسی غفلت یا تساہل بھی نقصان پہنچا سکتا ہے کیونکہ اگر

شبہے کو فوراً دور نہ کیا گیا تو یہ اپنی جگہ پر ٹھہرا نہیں رہتا بلکہ آگے بڑھتا ہے اور اس مقام پر پہنچتا ہے جسکا ذکر اب آرہا ہے۔

۳۔ اگر ایسا خیال آنے پر کسی کا قلبی رجحان اقرار کی طرف ہو یعنی دل میں یہ خیال ہو کہ "شاید یہ بات صحیح ہو" تو اس کیفیت کا نام "شک" ہے اور یہ کفر کے نقطۂ آغاز کا نام ہے۔ اس مقام سے واپس پلٹنا کسی صاحبِ نصیب ہی کا کام ہو سکتا ہے یا پھر جس پر اللہ اپنا خصوصی کرم فرمادے۔ اسی لئے میں نے زور دیا تھا کہ شبہ کی کیفیت سے نکلنے میں بہت جلدی کرنا چاہئے ورنہ شبہ سے شک تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ وسوسہ ایمان سے قریب ہے اور شک کفر سے قریب تر جبکہ شبہ درمیانی مقام اور گومگو کے عالم کا نام ہے۔ میں مومنین کو تنبیہ کرتا ہوں کہ لوگوں کی اکثریت مقامِ شبہ پر ہوتی ہے اور اسے وسوسہ سمجھ کر مطمئن رہتی ہے اور ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا انتہائی ضروری ہے۔

چھٹا سوال

یہ سوال آیۂ درود سے متعلق ہے اور مجھ سے درود یا صلوٰۃ کے معنی پوچھے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے:۔

"اللہ نے قرآن میں جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ اور اسکے ملائکہ نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں تو اس جملے کا مطلب کیا ہے؟۔ یعنی صلوٰۃ بھیجنے سے کیا مراد ہے؟۔"

میرے برادرِ مومن نے سوال بھی کیا تو نامکمل لیکن میں انشاءاللہ جواب مکمل ہی دونگا۔

صلوٰۃ سے جو کچھ بھی مراد ہو لیکن آپکو آیت کے اگلے حصے کے متعلق بھی پوچھنا چاہئے تھا جہاں مومنین کو بھی صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے اور نبیؐ اکرم نے صلوٰۃ

بھیجنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ ''پروردگار صلوٰۃ بھیج محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر'' کیا ہمارا یہ جملہ سن کر اللہ یہ نہیں کہے گا کہ میں نے تو تمہیں صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا تھا اور تم الٹا مجھ سے کہہ رہے ہو کہ صلوٰۃ بھیج؟ کیا تم مجھ سے ایسا کام کرنے کی فرمائش کر رہے ہو جو میں پہلے ہی سے کر رہا ہوں؟۔اس سوال پر اگر مومنین غور فرمائیں گے تو انشاءاللہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔

دیکھنے میں یہ ایک مختصر اور سادہ سا سوال ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی آج تک یہ بات معمہ بنی ہوئی ہے کہ صلوٰۃ بھیجنے سے کیا مراد ہے اور کیا محمدؐ و آلِ محمدؐ ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں؟۔کوئی زبان سے کہے یا نہ کہے لیکن ہر شخص یہ بات سوچتا ضرور ہے۔

میں نے اس سلسلے میں بہت کوشش کی۔بہت سے علماء کی تحریرات کا مطالعہ کیا اور سینکڑوں تقاریر سنیں لیکن میں کبھی انکی توجیہات سے مطمئن نہیں ہوا۔ہر شخص صلوٰۃ سے ''رحمت'' مراد لیتا ہے۔کہا یہ جاتا ہے کہ جتنی بھی نعمات ہیں وہ سب تحتِ رحم ہیں اسلئے ہمیں ہر نعمت رحمۃ العالمینؐ ہی کے ذریعے ملتی ہے۔جس طرح اگر ہم یہ چاہیں کہ ہمارے گھر میں پانی کی کمی نہ ہو تو ہم یہ دعا کریں گے کہ جہاں سے پانی سپلائی کیا جا رہا ہے وہاں پانی کم نہ ہونے پائے یا اگر ہم چاہیں کہ ہمیں بجلی کی فراہمی مسلسل ہوتی رہے تو ہم یہ دعا کریں گے کہ پاور ہاؤس میں بجلی کی کمی نہ ہو۔اسی طرح تسلسلِ نعمات کیلئے ہم یہ تمنا کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ پر مسلسل رحمت نازل ہوتی رہے تا کہ انکے وسیلے سے ہم تک بھی رحمت پہنچتی رہے۔یہ ایک انتہائی لغو اور مہمل خیال ہے۔وہ ہستی جسے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہو اسکے بارے میں یہ گمان کرنا کہ اس میں کمی واقع ہو سکتی ہے اور اس کمی کو ہماری دعائیں پورا کریں گی اللہ سے سوءِ ظن رکھنے کے مترادف ہے۔ایک علامہ صاحب کو میں نے برسرِ منبر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ صلوٰۃ بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے مراتب ہر لحظہ ہر آن بلند کرتا رہتا ہے۔یہ

خیال پہلے خیال سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔اس اعتبار سے تو حضرات محمدؐ و آل محمدؑ ہر لحہ بلندئ درجات پر فائز ہوتے رہنے کے باوجود بھی جس مقام پر بھی رہیں گے وہ مقام ناقص ہوگا کیونکہ اگلے ہی لحہ وہ ایک بلندتر مقام پر پہنچ جائیں گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان ذوات مقدسہ کو خلق ہی اس نقطۂ کمال پر کیا ہے جس سے آگے کمال کا کوئی تصور ہی نہیں بلکہ کمال کہتے ہی اسے ہیں جو ان سے ظاہر ہو اور باکمال وہی کہلاتا ہے جو ان سے وابستہ ہو جائے۔

اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لیکن کسی بھی جملے میں کسی لفظ کے وہی معنی مراد لئے جائیں گے جسکا قرینہ موجود ہو۔مثلاً حدیث ''من کنت مولاہ فھذٰ علی'' مولاہ'' میں لفظ مولا کے معنی کے سلسلے میں مسلمانوں نے طرح طرح کے شگوفے چھوڑے ہیں محض اسلئے کہ اس لفظ کے کئی معنی ہیں لیکن جو صاحبانِ معرفت تھے انھوں نے قرینہ تلاش کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ

ع

علیؑ مولا باایں معنی کہ پیغمبرؐ بود مولا

اسی طرح لفظ ''صلوٰۃ'' کے بھی لغت میں کئی معنی ہیں۔چونکہ صلوٰۃ بھیجنے والے تین فریق ہیں۔اللہ۔ملائکہ اور مومنین۔اس لئے ہر ایک کیلئے وہی معنی مراد لئے جائیں گے جو اس سے مناسبت رکھتے ہونگے۔صلوٰۃ کے ایک معنی ہیں ''اچھی تعریف''۔دوسرے معنی ہیں ''تسبیح''۔تیسرے معنی ہیں ''دعا''۔

جب یہ لفظ اللہ کی طرف راجع ہوگا تو اسکے معنی ہونگے ''اچھی تعریف''۔جب یہ ملائکہ کیلئے استعمال ہوگا تو اسکے معنی ہونگے ''تسبیح'' اور جب اسکی نسبت ہماری طرف آئے گی تو اسکے معنی ہونگے ''دعا''۔اللہ ہر آن محمدؐ و آل محمدؑ کی اچھی تعریف کرتا رہتا ہے۔آپکو معلوم ہے کہ تعریف کا اچھا ہونا ہر شخص کے علم و معرفت پر

منحصر ہوتا ہے۔ جو تعریف ایک عام آدمی کی نظر میں اچھی ہو وہ ایک عالم کی نظر میں ناقص ہوگی اور وہ عالم جس تعریف کو اچھا سمجھتا ہوگا وہ ایک عارف کی نظر میں ناقص ہوگی۔ اسی سے سمجھئے کہ جس تعریف کو اللہ اچھا سمجھتا ہو وہ تعریف کیا ہوگی!

اس تعریف کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ نورِ اول جب خلوت کدۂ احدیت میں تھا تو یہ اللہ کی تعریف یعنی حمد کیا کرتا تھا اس لئے اللہ نے اسکا نام ہی ''احمدؐ'' رکھ دیا یعنی تعریف کرنے والا اور یہ تعریف اللہ کو اتنی پسند آئی کہ اس نے اسے ''الحمد'' کہکر اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ اب ایسی تعریف نہ کوئی کرسکتا ہے اور نہ کسی کیلئے کی جاسکتی ہے۔ اس حمد کا صلہ اللہ نے یہ دیا کہ جب اس ''احمدؐ'' کو دنیا میں بھیجا تو اسکا نام ''محمدؐ'' رکھا۔ یعنی تو نے میری اتنی اچھی تعریف کی ہے کہ اب تیری تعریف کی جائے گی۔ جسکی اس نے تعریف کی تھی اب وہی اس کی تعریف کرے گا اور چونکہ اس نور کے چودہ اجزاء تھے اس لئے رسولؐ اللہ نے وضاحت کردی کہ صرف میری ہی تعریف نہیں کی جائیگی بلکہ مکمل نور کی تعریف ہوگی۔ اسی لئے فرمایا۔ ''اولنا محمدؐ و اوسطنا محمدؐ و آخرنا محمدؐ و کلنا محمدؐ''۔ یعنی اللہ جو تعریف کرتا ہے وہ ہم میں سے کسی ایک کی نہیں بلکہ ہم سب کی کرتا ہے۔

اب رہے فرشتے اور جن وانس تو تینوں ہی میں یہ طاقت نہیں کہ اس نورِ مجسم کی تعریف کرسکیں۔ بقولِ غالب

کس سے ہوسکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا

کس سے ہوسکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

اس لئے فرشتوں کو تو ایک خاص تسبیح ودیعت کردی گئی اور چونکہ ہمارے مراتب کو بلند کرنا مقصود تھا اس لئے ہم سے یہ دعا کرائی گئی کہ ''پروردگار! ہم محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعریف و توصیف سے قاصر ہیں اس لئے تعریف تو کر کیونکہ یہ تجھے ہی زیب دیتی ہے لیکن اسکا کچھ حصہ ہمارے حساب میں بھی لکھ دے تا کہ ہمارا مقصدِ زندگی

پورا ہو جائے‘‘۔

یہیں سے لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ صلوٰۃ جسکا ترجمہ ہم لوگ نماز کرتے ہیں کیا چیز ہے۔ صلوٰۃ نام ہے مدحتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا۔ یہی سبب ہے کہ بغیر ان پر صلوٰۃ بھیجے ہوئے نماز ہرگز قبول نہیں ہوتی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ قرآنی لفظ ’’صلوٰۃ‘‘ کو ہٹا کر ایک فارسی لفظ ’’نماز‘‘ رکھ دیا گیا ہے۔ نماز کے معنی ہیں پوجا پاٹ اور ایران میں بسنے والی تمام قومیں خواہ وہ آتش پرست ہوں۔ عیسائی ہوں یا یہودی۔ اپنی اپنی پوجا پاٹ کو نماز ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اس تمام کاوش کا مقصد بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ صلوٰۃ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہی نہ ہونے پائے اور وہ پوجا پاٹ کو ہی اصل دین سمجھتے رہیں۔

کلمۃ التّقویٰ ۔ (پہلا حصہ)

یہ مسئلہ ''شہادتِ ثالثہ'' کا ہے جسکے بارے میں اکثر و بیشتر مجھے مختلف سوالات موصول ہوتے رہتے ہیں اور میں انفرادی طور پر جوابات دے دیتا ہوں ۔ لیکن اس سال کچھ یوں ہوا کہ ایک علامہ صاحب نے عشرۂ محرم کے دوران اپنی تمام توپوں کا رخ ''علی'' ولی اللہ'' کی طرف موڑ دیا اور کراچی میں جہاں جہاں وہ تقاریر فرماتے رہے انکا موضوعِ سخن اور ہدفِ تنقید و تنقیص کلمہ ٔ ولایت علیؑ ہی رہا جسکے لئے میں انھیں بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور انکے سامعین کو بھی جنھوں نے انتہائی عقیدت وتوجہ اور جذبہ ٔ قبولیت کے ساتھ انکے ارشادات کو سنا اور علیؑ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے میں انکے شریک و سہیم بنے ۔

عام طور پر میں ایسی باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی کی کھوج میں رہتا ہوں لیکن اتفاق سے علامہ صاحب کی ایک کیسٹ مجھ تک پہنچ گئی اس لئے مجھ پر واجب ہوگیا کہ ایسے بلند پایہ خطیب کی تقریر کو توجہ سے سنوں جس نے خطیبِ منبرِ سلونی کے خلاف مورچہ بندی کر رکھی ہو ۔ میں نے پوری کیسٹ سنی ۔ تقریباً دو گھنٹے کی تقریر کے دوران ایک مقام بھی ایسا نہیں آیا جہاں ذکرِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کیا گیا ہو جو مجالس حسینیؑ کا مقصدِ اصلی و حتمی ہے ۔ مگر ایک بات پر مجھے بہت حیرت ہوئی ۔ مسلمان جب کوئی کام شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں ۔

''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان و رحیم ہے'' ۔ مگر جب علامہ صاحب اپنی تقریرِ دلپذیر کا آغاز کرتے ہیں تو اسطرح کرتے ہیں ۔ ''شروع کرتا ہوں امریکہ کے نام سے جو کبھی مائی باپ بن جاتا ہے اور کبھی آنکھیں پھیر لیتا ہے'' ۔

میرا موضوع تو وہی ہے جسے میں نے سرنامہ ٔ کلام قرار دیا ہے لیکن

چونکہ ذکر علامہ صاحب کا چھڑ گیا ہے اسلئے میں انتہائی اختصار کے ساتھ ان امور کا بھی جائزہ لوں گا جنکا ذکر انکی تقریر میں آیا ہے لیکن اس سے بھی پہلے میں ایک انتہائی ضروری بات آپکے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں ۔ بات اہم ہے اس لئے ذکر بھی ضروری ہے ۔

ایران سے ایک تحریک چلی اور ہندوستان پہنچی اور وہاں سے مختلف ذاکرین کے ذریعے پاکستان میں ایکسپورٹ کی گئی ۔ وہ تحریک یہ تھی کہ ''اصلاحی مجالس'' پڑھی جائیں یعنی فضائلِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی بیان کی جائیں جن سے قوم کی اصلاح کی جا سکے اور انھیں مختلف شرعی اور معاشرتی برائیوں سے آگاہ کیا جائے ۔ یہ بات نئی تھی مگر پر کشش تھی لیکن اسکے پیچھے جو منصوبہ کام کر رہا تھا اس سے عام لوگ بے خبر تھے ۔ ابتداء میں مجالس کے دورانیئے کا تناسب یہ تھا کہ تین چوتھائی مجلس اہلبیتؑ سے متعلق ہوتی تھی اور ایک چوتھائی اصلاح سے لیکن رفتہ رفتہ یہ تناسب تبدیل ہوتا گیا اور آج یہ نوبت آ گئی کہ پوری مجلس میں ذکر اہلبیتؑ صرف مصائب تک محدود ہو کر رہ گیا ۔ خود علامہ مذکور کی تقاریر اگر سنی جائیں تو وہ مصائب کے علاوہ باقی تمام وقت غسل و تیمم ۔ شادی بیاہ کے مسائل ۔ بچے پالنے کا ہنر اور اسی قبیل کے دیگر عنوانات بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں اور انکی پوری کوشش ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے لوگوں کو ذکرِ اہلبیتؑ سے بیزار کیا جائے اور وہ اجتماع جس میں لوگوں کو حسینؑ مظلوم کے نام پر جمع کیا گیا ہو اس میں اہلبیتؑ کا ذکر تک نہ آنے دیا جائے اور ایسے مقدس اجتماع کو تذکرۂ فروعات اور حکومتی پروپیگنڈے کے لئے وقف کر دیا جائے ۔ یہاں میں ایک مختصر سی بات کرنے جا رہا ہوں لیکن میری التماس ہے کہ اسے انتہائی توجہ سے پڑھا جائے ۔

ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ مجلس حسینؑ مقامِ تعزیت ہوتا ہے ۔

دنیا میں جب کوئی مر جاتا ہے اور لوگ اسکے ورثاء سے تعزیت کے لئے جاتے

ہیں تو وہاں وہ صرف دو ہی کام کرتے ہیں ۔ انکے علاوہ تیسرا کام کوئی نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی ذی عقل و ہوش انسان کرسکتا ہے ۔ ایک تو مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور دوسرے اسکے ورثاء کو دلاسہ دیا جاتا ہے اور شریک گریہ ہوا جاتا ہے ۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی کسی سے تعزیت کے لئے گیا ہو ۔ میت رکھی ہو ۔ ورثاء بے حال ہوں اور ایسے میں کوئی نماز روزے کی تبلیغ کرنے لگے یا کسی حکومت کے ترانے گانے لگے؟ ۔ لیکن حسینؑ کے ساتھ جو لفظ ''مظلوم'' کا الحاق کیا جاتا ہے وہ اسی لئے کیا جاتا ہے کہ حسینؑ کی مظلومیت کربلا و کوفہ و شام یا ۶۱ ھ تک ہی محدود نہیں بلکہ تا ابد پھیلی ہوئی ہے حسینؑ آج بھی اسی طرح مظلوم ہے جس طرح ۶۱ ھ میں تھا ۔ اگر کوئی فرق پڑا ہے تو صرف اسقدر کہ کل حسینؑ پر ظلم کرنے والے حسینؑ کے دشمن تھے اور آج حسینؑ پر ظلم کرنے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو خود کو حسینؑ کا نام لیوا کہتے ہیں ۔ کیا آپکی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی کہ ایک محفلِ تعزیتِ اہلبیتؑ میں خود اہلبیتؑ کے ہی وقت کو کاٹ کر اسے مسائلِ فروعیہ اور صاحبانِ اقتدار کی مدح سرائی میں صرف کرنا نہ صرف حسینؑ کے حق میں خیانت ہے بلکہ لوگوں کو اہلبیتؑ سے دور اور غافل رکھنے کی ایک ناپاک سازش ہے؟ ہم تو تب مانیں گے جب یہ لوگ اپنے پسندیدہ موضوعات بیان کرنے کے لئے ایک الگ اجلاس بلائیں ۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کتنے لوگ جمع ہوتے ہیں ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حسینؑ کے نام پر لوگوں کو جمع کرکے اپنی کہانیاں سنائی جائیں؟ ۔

اپنی اس تقریر میں علامہ صاحب نے دو باتیں تو کشف الحقائق کے بارے میں ارشاد فرمائیں اور باقی وقت شہادتِ ولایتِ علیؑ سے باز رہنے کی تلقین میں گذارا اور دونوں امور کا ذمہ دار امریکہ کو ٹھہرایا یعنی کلمہ ٔ علیؑ 'ولی اللہ کا دفاع کرانے میں امریکہ کا ہاتھ ہے اور مقصد یہ ہے کہ شیعوں میں افتراق پڑ جائے ۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ''حبل اللہ'' اور ''عروۃ الوثقیٰ'' ذاتِ علیؑ ابن ابی

طالب ہے اور از روئے قرآن مسلمانوں میں اتحاد صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ وہ علیؑ سے متمسک ہوجائیں یعنی مرکزِ اتحاد علیؑ ہیں۔ لیکن علامہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ (معاذ اللہ) علیؑ باعثِ افتراق ہے اور اسکی ولایت کی شہادت دیتے ہی وحدتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں تفصیل اسکے مقام پر بیان کی جائے گی لیکن پہلے ذرا امریکہ سے نبٹ لیں کہ یہ کون ہے جو شیعوں سے علیؑ "ولی اللہ کہلوا کر ان میں تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے؟۔

سیاسیات کبھی میرا میدان نہیں رہا نہ ہی مجھے اس شیطانی چرخے سے کوئی دلچسپی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں علمِ سیاسیات سے ہی نابلد ہوں۔ لوگ چونکہ سیاست کی مبادیات اور اسکی چالوں سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے یہ حضرات مختلف حیلوں سے انھیں بہکاتے ہیں اور آج کل انکا موثر ترین حربہ یہ ہے کہ امریکہ امریکہ چلائیں تاکہ لوگ اسی کی طرف متوجہ رہیں اور خود انکی طرف نگاہ اٹھانے کی کسی کو فرصت ہی نہ ملے۔ سیاست کی مکروہ ترین چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے اور جابر حکومتیں اکثر اسے استعمال کرتی ہیں کہ وہ چند لوگوں کو اس کام پر متعین کرتی ہیں کہ وہ مختلف محفلوں میں اور لوگوں کے مجمعوں میں حکومت کے خلاف باتیں کیا کریں۔ جس زمانے میں ایوب خان کا نیا نیا مارشل لا لگا تھا تو انھوں نے بھی اپنے تنخواہ یافتہ لوگوں کا ایسا ہی جال بچھایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں میں اپنے والدِ مرحوم کے ساتھ ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا جہاں ایک صاحب بڑی شد و مد کے ساتھ ایوب خان کے عیوب بیان فرما رہے تھے۔ میرے والد اگرچہ خود بھی مارشل لا کی حکومت کے حامی نہیں تھے لیکن انھوں نے میرا ہاتھ دبایا اور رازداری سے کہا۔ "اس شخص کی کسی بات کا جواب نہ دینا۔ یہ حکومت کا جاسوس ہے اور صرف یہ کھوج لگانا چاہتا ہے کہ حکومت کے مخالف کون کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں"۔ بڑی طاقتیں بھی یہی کھیل کھیلتی ہیں کہ اپنے خاص لوگوں کو اس کام پر لگادیتی ہیں کہ وہ انکے خلاف شور مچائیں۔ تقریریں

کریں ۔پوسٹر لگائیں ۔جلوس نکالیں تا کہ انکے مخالفین ان پر شک نہ کر سکیں اور وہ بے خوف وخطر اپنے مالکوں کا مشن پورا کرتے رہیں ۔خود پاکستان میں بھی ایسی کئی سیاسی جماعتیں موجود ہیں جو امریکہ کی ہی پروردہ ہیں لیکن انکا کام امریکہ کے خلاف شورش برپا کرنا ہے ۔کل تک جو لوگ امریکہ کو نجات دہندہ کہتے تھے اور اسی کی امداد کے بل بوتے پر افغانستان میں جنگ کر رہے تھے آج انہی کی زبانیں امریکہ کے خلاف آگ اگل رہی ہیں ۔ آخر تبدیلی کیا آ گئی ؟ ۔امریکہ بدل گیا یا یہ خود بدل گئے ؟ ۔نہیں ! کچھ بھی نہیں بدلا ۔صرف امریکہ کی حکمتِ عملی بدلی ہے ۔

اسکے برخلاف حالانکہ روس اور چین امریکہ کے بدترین دشمن ہیں لیکن آپ نے ایسا شوروغوغا وہاں کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔وہ شور نہیں مچاتے بلکہ کام کرتے ہیں اور ایسے اقدام کرتے ہیں جنکے ذریعے امریکہ کے شر سے محفوظ رہا جا سکے ۔ لیکن یہ لوگ ایسے اقدام کرتے ہیں جن سے امریکہ کو اس خطے میں قدم جمانے کا اور زیادہ موقعہ ملے ۔ آپ ۱۹۷۹ء سے لیکر آج تک کی تاریخ پر ایک گہری نظر ڈالیے تو سارا کھیل آپکی سمجھ میں آجائے گا ۔آپ اتنی سی بات پر غور کریں کہ اصل شیطان برطانیہ ہے اور ہر شرارت کا محرک وہی ہوتا ہے ۔ اسرائیل اسی نے بنوایا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ امریکہ کے ہر کام میں برابر کا شریک ہے بلکہ اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے والا بھی وہی ہے لیکن آج تک آپ نے ان مقدسین کی زبان سے برطانیہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سنا ہوگا ۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ برطانیہ سے انکا کونسا روحانی تعلق ہے ۔ میں نے اشارتاً ایک بات کہی ہے ۔اگر یہ عقلمند ہونگے تو سمجھ جائیں گے ۔بات صرف اتنی ہے کہ انھیں لوگوں کی توجہ اہلبیتؑ کی طرف سے ہٹانی ہے تا کہ انکی مرجعیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے ۔نہ کوئی قرآن کا نام لیوا باقی رہے نہ

حدیث کا بلکہ انہی کے اقوال وفتاویٰ کو قرآن وحدیث کا درجہ مل جائے۔

دنیا جانتی ہے کہ پاکستان میں شیعوں کی قتل وغارتگری کرنے والی جتنی بھی تنظیمیں ہیں وہ سب طالبان کی پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں اسکے باوجود طالبان سے ان لوگوں کو بڑی ہمدردی ہے اور انھیں یہ لوگ مظلوم سمجھتے ہیں۔ گذشتہ محرم کے دوران انکے کئی تنخواہ دار خطیبوں نے کئی عشرے مظلومیتِ طالبان پر پڑھے۔ لیکن امیر مختارؒ کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی آپ انکے منہ سے نہیں سنیں گے بلکہ انکے خلاف انکے فتوے موجود ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے قتلِ حسینؑ کا قصاص لیا جاتا ہے ان سے تو انھوں نے اتحاد قائم کر رکھا ہے اور جو قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے والا ہے اسکے یہ دشمن ہیں۔ اسکا صاف اور واضح ترین مطلب یہ ہے کہ جو حسینؑ کا دوست ہے یہ اسکے دشمن ہیں اور جو حسینؑ کا دشمن ہے اسکے یہ دوست ہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ علیؑ اور اولادِ علیؑ کی مرجعیت کے قائل ہیں اور ان لوگوں کی جعلی مرجعیت کو نہیں مانتے ان پر یہ لوگ ہر قسم کا اتہام لگانا روا سمجھتے ہیں خواہ منبر پر بیٹھ کر جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔

ہم اس معاملے کو یہیں پر ختم کرتے ہیں کیونکہ سمجھنے والوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

ایک اور فتنہ

علامہ کی تقریر کا ایک حصہ تلقینِ جہاد پر مشتمل تھا۔ انکا گمان تھا کہ جتنے لوگ انکے سامنے بیٹھے ہوئے تھے وہ سب کے سب مومنِ کامل اور جہاد کے دلدادہ تھے۔ البتہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ جہاد سے انکی مراد کونسا جہاد تھا لیکن انکی تقریر سن کر جو نعرے لگائے گئے ان سے اندازہ ہوا کہ انکی مراد جہاد بالسیف سے تھی کیونکہ جو نعرہ بار بار لگایا جارہا تھا وہ یہ تھا:۔

شہادت شہادت　　　　سعادت سعادت

حالانکہ میرے خیال میں اس نعرے کو یوں ہونا چاہئے تھا:۔

زبانی شہادت　　　　خیالی سعادت

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہی علامہ صاحب کسی اور مقام پر جہاد ہی کے موضوع پر تقاریر فرمارہے تھے اور غالباً چھٹی تقریر تھی اور اس وقت تک میدانِ کارزار اچھی طرح گرم ہو چکا تھا اور زبانی طور پر بہت سے لوگ شہید ہو کر سعادت پا چکے تھے کہ اچانک شامیانے کے اوپر دو سیاہ بلّے آپس میں لڑتے ہوئے اس مقام تک آگئے جہاں دو شامیانوں کے درمیان دراڑ ہوتی ہے اور ان میں سے ایک بلّا اس دراڑ سے ہوتا ہوا سیدھا مجاہدینِ شہداء کے سروں پر آ کر گرا۔ اسکا گرنا تھا کہ جلسہ گاہ پانی پت کا میدان بن گیا۔ پورے مجمع میں ایک بھگدڑ مچ گئی اور بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید امریکہ نے حملہ کر دیا ہے۔ لوگ اپنی جوتیاں اور چپل چھوڑ کر بھاگ گئے اور پنڈال میں ایک بھی آدمی باقی نہ رہا۔ بعد میں جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے تو وہ اپنی اپنی جوتیاں تلاش کرنے کے لئے واپس آئے۔ ان واپس آنے والوں میں سے ہی ایک صاحب نے یہ حکایت مجھ سے بیان کی۔ اگلے روز علامہ صاحب نے بہت خفگی کا اظہار کیا اور سامعین کو ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی۔ ''بدبختو! میں چھ روز سے تمھیں جہاد پر آمادہ کر رہا تھا اور میں تو یہ سمجھا تھا کہ اب سارا مجمع گردن کٹانے کے لئے تیار بیٹھا ہے اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک بلّے سے ڈر کر بھاگ گئے؟۔ اس پر ایک صاحب نے جواب دیا کہ ''علامہ صاحب! یہ بات آپ اس لئے کر رہے ہیں کہ آپ وہاں منبر پر بیٹھے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوتے تو انشاءاللہ آپ بھی وہیں ہوتے جہاں ہم بھاگ کر گئے تھے۔

بہر حال انکے تیوروں اور مجمعے کے ردِ عمل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگوں کو جہاد بالسیف پر ابھار رہے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ جو بات ایک عام آدمی بھی

جانتا ہے وہ علامہ صاحب کو معلوم نہیں اور وہ یہ کہ غیبتِ امامؑ میں جہاد بالسیف ساقط ہے اور جو چیز ساقط ہے اسکی تبلیغ یہ حضرت کیونکر فرمارہے ہیں؟۔بہرحال وہ اپنے فعل کے خود ذمہ دار ہیں لیکن مومنین کے لئے ایک حدیث پیش کی جارہی ہے تاکہ وہ منزلِ یقین تک پہنچ سکیں۔

فروعِ کافی۔کتاب جہاد۔باب ٦۔حدیث ۳۔اس باب کا عنوان ہے ’’جہاد واجب کس کے ساتھ ہوتا ہے‘‘۔

’’راوی امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مولاؑ میں نے خواب میں آپؑ سے پوچھا کہ بغیر امامِ مفترض الطاعہ کے جہاد کرنا ایسا ہی حرام ہے جیسے مردار۔خون اور سور کا گوشت؟ تو آپؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔(اب میں عالمِ بیداری میں آپؑ کے سامنے حاضر ہوں اور وہی سوال پوچھتا ہوں) یہ سن کر حضرتؑ نے دوبار فرمایا۔’’ایسا ہی ہے۔ ایسا ہی ہے‘‘۔

یہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ لوگ انکی فریب کاریوں کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ لوگ مومنین کو کن کن گہری کھائیوں میں گرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اچھی طرح جان لیجئے کہ مومن کی جان اسکے پاس اسکے زمانے کے امامؑ کی امانت ہے۔بغیر اپنے امامؑ کے حکم کے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا امانتِ امامؑ میں خیانت ہے اور حرام موت مرنا ہے۔

جوازِ اختلاف

کشف الحقائق میں ایک باب ہے جسکا نام ’’اختلاف‘‘ ہے۔یہ صفحہ ۱۰۲ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۱۳۰ پر ختم ہوتا ہے۔جن اصحاب کے پاس یہ کتاب موجود ہے وہ اس باب کا دوبارہ مطالعہ فرمئیں اور اگر کسی کے پاس موجود نہیں ہے تو وہ اسے حاصل کرے اور یہ باب پڑھے تاکہ حقیقت کا صحیح ادراک ہو سکے اور محض سنی

سنائی باتوں پر کوئی نظریہ قائم نہ کیا جائے۔ یہ باب ایسا ہے جوان حضرات کے حلق میں جا کر پھنس گیا ہے کیونکہ مسلماتِ عقلیہ کا انکار کوئی اندھا بھی نہیں کرسکتا۔ یہ بات عقلی ہے کہ اگر ایک ہی مسئلے میں دو اشخاص مختلف رائے رکھتے ہوں تو دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ دونوں غلط ہیں یا ان میں سے ایک صحیح اور دوسرا غلط۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اپنی مختلف آراء کے باوجود وہ دونوں صحیح ہوں۔ مگر نظامِ اجتہاد میں تو گنگا ہی الٹی بہتی ہے۔ ہر مجتہد کا فتویٰ دوسرے مجتہد سے مختلف ہے۔ ایک ہی شے ایک مجتہد کے نزدیک حلال ہے اور وہی شے دوسرے کے نزدیک حرام ہے اسکے باوجود اصولِ اجتہاد یہ ہے کہ کوئی بھی مجتہد غلط نہیں ہوسکتا یعنی کوئی شے بیک وقت حلال بھی ہوسکتی ہے اور حرام بھی۔ ان اختلافات کی توجیہ ہر شخص اپنے اپنے طور پر جدا جدا کرتا ہے اور یہی انکی بوکھلاہٹ کی دلیل ہے۔ علامہ صاحب نے بھی دفاعِ باطل کو اپنا فریضہ منصبی سمجھتے ہوئے اپنی سی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں دو انتہائی دلچسپ انکشافات فرمائے ہیں۔

پہلی توجیہ

اختلافِ فقہاء کی پہلی توجیہ یہ پیش کی گئی ہے کہ چونکہ مجتہدین کے علم میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی قرآن وحدیث تک ہی محدود ہوکر رہ جاتا ہے تو کوئی فلسفہ وعرفان کا بھی مطالعہ کرتا ہے لہٰذا اس بنا پر انکے فتووں میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ سننے والوں نے یہ بات سنی اور پڑھنے والوں نے اب پڑھ لیا۔ اب اس سے آگے انکی عقل اور انکے ایمان کا امتحان شروع ہوتا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ علامہ صاحب کا جملہ یقیناً سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے اور صرف اسی ایک جملے سے سارے عقدے کھل جاتے ہیں۔ علامہ صاحب کے مطابق:۔

۱۔ جو شخص قرآن وحدیث کو اخذِ احکام کے لئے کافی سمجھتا ہے وہ خود کو محدود کرلیتا ہے یعنی قرآن وحدیث اس سلسلے میں ناکافی ہیں اور جو شخص انھیں کافی سمجھتا ہے

اسکا علم محدود ہے۔ یہ تو تھا علامہ صاحب کا قول اور اب ذرا دوسرے رخ پر بھی نظر کر لیں۔قرآن اللہ کا کلام ہے اس لئے اسکے بارے میں ہم اللہ ہی سے پوچھیں گے کہ اسکی حدود کیا ہیں اور حدیث کلام معصومؑ ہے اس لئے اسکی حدود کے بارے میں ہم معصومؑ سے دریافت کریں گے تب ہی ہم کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں آ سکتے ہیں۔

قرآن کے بارے میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:۔

(ا)۔''کوئی خشک وتر ایسی نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو''

(ب)۔نمل ۷۵۔''اور آسمانوں اور زمین کی غائب چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں ہے''۔

(ج)۔یونس ۶۱۔''اور تمھارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے نہ آسمان میں اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں موجود ہے''۔

اللہ کا تو دعویٰ ہے کہ ہر وہ شے جس پر لفظ ''شے'' کا اطلاق ہوتا ہو قرآن مجید میں موجود ہے۔اب سوال یہ ہے کہ احکام شرعی پر لفظِ ''شے'' کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟۔اگر نہیں ہوتا تو علامہ صاحب کو مبارک ہو اور اگر ہوتا ہے تو قرآن کی طرف رجوع کرنے والے کے علم کو محدود کہنا علامہ صاحب کے ہی شایانِ شان ہو سکتا ہے۔ہم گنہگار تو اسکا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اب رہا مسئلہ حدیث کا تو ہم معصومؑ سے ہی یہ سوال کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اصولِ کافی۔کتابِ عقل۔باب ۲۰ کی بارہویں حدیث آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

''سماعہ بن مہران نے امام موسیٰ کاظمؑ سے پوچھا کہ کیا رسولؐ اللہ نے لوگوں کو اتنا بتا دیا تھا جو حضرتؐ کے زمانے میں انکے لئے کافی ہوتا؟۔فرمایا۔بیشک اتنا بتا دیا تھا جسکی ضرورت انکو قیامت تک ہوگی۔راوی نے پوچھا کہ کیا اس میں سے کچھ

ضائع ہوگیا؟۔فرمایا۔نہیں۔وہ علم اسکے اہل یعنی ہمارے پاس ہے''۔

یہاں تو حدیث کے لئے بھی وہی بات ثابت ہورہی ہے جو قرآن کے لئے ہوتی ہے۔اب علامہ صاحب کو اگر قیامت کے بعد کے مسائل کی تلاش ہوتو اور بات ہے ورنہ قیامت تک کے لئے تو سب کچھ قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔یہ دونوں چیزیں تو انسان کو ہر شے سے مستغنی کردیتی ہیں نہ کہ محدود۔البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں یہ دونوں چیزیں محفوظ ہیں یعنی امامؑ کے پاس تو امامؑ کی طرف رجوع کرنا علامہ صاحب معیوب سمجھتے ہیں شاید اسی لئے وہ قرآن وحدیث کو محدود سمجھتے ہیں۔

۲۔علامہ صاحب کے کلام سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ تو یہ ہے کہ فلسفہ قرآن و حدیث سے بالاتر کوئی علم ہے جسکے پڑھنے سے انسان اس شخص سے زیادہ عالم ہوجاتا ہے جو صرف قرآن وحدیث پر انحصار کرتا ہے۔اگر فلسفہ پڑھنے سے قرآن کو سمجھنے کی بہتر صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے تو اللہ و رسولؐ وائمہؑ معصومینؑ نے فلسفے کی تعلیم کیوں نہیں دی اور لوگوں کو اسکی تاکید کیوں نہیں کی؟۔جبکہ علم فلسفہ سے مس رکھنے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلسفہ انتہائی غیر یقینی چیز ہے اور محض تعیش ذہنی کا ایک ذریعہ ہے۔اسکا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظریہ ایسا نہیں جسے رد نہ کیا جاسکے۔فلسفے کا کام نظریات پیدا کرنا اور پھر انھیں رد کرنا ہے۔اسطرح یہ ایک دائرے کا سفر ہے جو انسان کو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ایسی چیز کو قرآن وحدیث پر فوقیت دینا صرف اسی کا کام ہوسکتا ہے جو دین کو ذریعہ تفریح سمجھتا ہو۔

۳۔تیسری بات عرفان کی ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ عرفان کا تعلق معرفت سے ہے اور معرفت ایک قلبی عمل ہے نہ کہ اعضاء و جوارح کا عمل۔شریعتِ ظاہرہ صرف انھیں اعمال سے متعلق ہے جنکا تعلق اعضاء و جوارح سے ہو اور اسی طرح مجتہد کا دائرۂ کار بھی صرف انہی اعمال تک محدود ہے جنکا تعلق اعضاء و جوارح

سے ہواور انہی میں وہ موشگافیاں کرتا ہے اور خود بھی الجھتا ہے اور دوسروں کو بھی الجھاتا ہے۔ ماخذاتِ شریعت میں نہ فلسفے کا گذر ہے اور نہ عرفان کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ یہ علامہ صاحب کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔

بہر حال علامہ صاحب نے علم کی کمی بیشی کو سبب اختلاف بتایا ہے۔ یعنی کوئی مجتہد کم جانتا ہے اور کوئی زیادہ۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی زیادہ جاہل ہوتا ہے اور کوئی کم۔ تو بھائی مجھے صرف اتنا بتادو کہ کسی کی جہالت کا بھگتان میں کیوں بھگتوں؟ اور کیوں میں زندگی بھر شک میں مبتلا رہوں؟ اور کیوں نہ میں کسی ایسے کی طرف رجوع کروں جہاں جہل کا گذر ہی نہ ہو؟ میرے لئے تو کوئی مشکل ہے ہی نہیں جو میں ہر کس و ناکس کے پیچھے بھاگتا پھروں مگر علامہ صاحب نے ایک مسئلہ اور اٹھادیا کہ حدیثوں میں ناسخ و منسوخ احادیث شامل ہوتی ہیں اسلئے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو کسی بھی طرح راہِ حق سے ہٹایا جائے اور عام لوگوں کی کم علمی یا حسنِ ظن سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ کیا معصومینؑ ہمیں بتا کر نہیں گئے کہ ایسی صورتِ حال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟۔

یادرکھئے کہ ناسخ و منسوخ احادیث ہمیشہ ایک دوسرے سے متعارض ہونگی اور ایسی احادیث کے بارے میں معصومینؑ نے واضح ہدایات دیں ہیں جو آپکی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں:۔

۱۔ اصولِ کافی۔ کتاب عقل۔ باب ۲۲۔ حدیث ۹۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے کہا کہ اگر کوئی حدیث ہم سے پہلے اماموں سے پہنچے مثلاً امام زین العابدینؑ سے اور دوسری انکے بعد والے امامؑ سے تو ہم کس پر عمل کریں؟ فرمایا۔ "عمل کرو بعد والی پر جب تک کہ زندہ امامؑ سے دوسری حدیث تم تک نہ پہنچے"۔ پھر فرمایا۔ "ہم نے بعد والے امامؑ اور زندہ امامؑ کے قول پر عمل کرنے کو اس لئے کہا ہے کہ ہم ہر ضرر کو تم سے دور رکھنا

چاہتے ہیں اور اگر احتمالِ ضرر نہ ہو تو جس پر چاہو عمل کرو"۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر دو احادیث میں تعارض پایا جائے تو بعد والے امام کے قول پر عمل کیا جائے دوسرے یہ کہ عدمِ احتمالِ ضرر کی صورت میں ہمیں کھلی اجازت ہے کہ ناسخ و منسوخ کے چکر میں پڑے بغیر جس حدیث پر چاہیں عمل کریں۔ اگر کسی مسئلے میں ہمیں کوئی قول معصومؑ ملتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس پر عمل شروع کر دیں۔ اگر کچھ عرصے بعد معلوم ہو کہ قولِ معصومؑ یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے تو اسکو ترک کر کے دوسری حدیث پر عمل شروع کریں کیونکہ مقصد بہر حال اطاعت معصومؑ ہے اور دونوں صورتوں میں ہم مطیعِ معصومؑ ہی قرار پائیں گے۔ لیکن اطمینانِ قلب کے لئے ہم یہ بھی دیکھے لیتے ہیں کہ بعد والے امامؑ یعنی ہمارے امام زمانہؑ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

۲۔اصولِ کافی۔کتاب عقل۔باب ۲۲۔حدیث ۷۔

اپنی توقیع مبارک میں امام زمانہؑ اس سوال کے جواب میں کہ اگر ایک شخص سے اسکے دو دینی بھائیوں نے ایک امر کے متعلق دو مختلف حدیثیں بیان کیں۔ ایک سے کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے اور دوسرے سے نہیں تو ایسی صورت میں کیا کرے؟۔ فرمایا۔"ان دونوں روایتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرے۔ اس اعتقاد سے کہ امامِ مفترض الاطاعت کا قول ہے نہ اس اعتبار سے کہ ایک قول کو دوسرے پر ترجیح دے"۔

الحمدللہ کہ یہ اشتباہ بھی دور ہوا۔

دوسری توجیہ

اختلاف بین الفقہاء کی دوسری توجیہ جو علامہ صاحب نے بیان فرمائی وہ مومنین کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ گمراہی کی انتہا ہے اور جو شخص یہ حد

بھی پھلانگ جائے اسکا ٹھکانا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔علامہ صاحب اختلافِ فقہاء کا دفاع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”کیا حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ میں اختلافِ رائے ہوا تھا یا نہیں؟“۔مقصد یہ ہے کہ جب (معاذ اللہ) انبیاء میں اختلاف ہوسکتا ہے تو فقہاء میں بقدرِ علم اختلاف پیدا ہو جانا کون سی بڑی بات ہے؟۔اس پر میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ علامہ صاحب کو نظرِ بد سے بچائے۔انھوں نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جو آج تک کوئی عالم۔کوئی مورخ اور کوئی مفسر سرانجام نہ دے سکا۔اس جراءت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ اپنے باہمی اختلافات کا جواز پیدا کرنے کے لئے اللہ کے معصوم انبیاءؑ کو آپس میں لڑا دیا جائے۔لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس معاملے کو نظر انداز کرنا بجائے خود کسقدر سنگین جرم ہے کیونکہ مسئلہ عزتِ انبیاءؑ اور عدلِ خداوندی کا ہے۔اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ حق میں کبھی اختلاف نہیں ہوسکتا نہ اللہ کا مقصد اختلاف پھیلانا ہے بلکہ اسکا مقصد تو اختلافات کو ختم کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے انبیاءؑ کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کو رفع کرسکیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے:۔

۱۔بقرہ ۲۱۳۔ ”<u>پس اللہ نے انبیاءؑ بھیجے جو خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تھے اور انکے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ لوگوں کے مابین جو اختلافات ہیں اسکا فیصلہ کردیں</u>“۔

۲۔نحل ۶۴۔ ”<u>اور (اے رسولؐ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل نہیں کی مگر اس لئے کہ جن باتوں میں انھوں نے اختلاف کیا تو انھیں انکے لئے کھول کر بیان کردے</u>“۔

جو لوگ آپس میں اختلاف کرتے ہیں انکے لئے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۵ میں یوں ارشاد ہوتا ہے:۔

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق ہو گئے اور بعد اسکے کہ انکے پاس دلیلیں آچکی تھیں انھوں نے اختلاف کیا اور یہی وہ لوگ ہیں جنکے لئے بہت بڑا عذاب ہے''۔

اختلاف کے بارے میں امام محمد باقرؑ یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

''خدا کو یہ بات ناپسند ہے کہ اسکے حکم میں اختلاف ہو یا اسکے حکم میں تناقض ہو''۔(اصولِ کافی۔کتابِ حجت۔باب ۴۰۔حدیث ۷)

اور اختلاف کرنے والوں کے بارے میں آنجنابؑ کا ارشاد یہ ہے:۔

''پس جو اسطرح حکم کرے کہ اس میں اختلاف نہ ہو تو اسکا حکم اللہ کے حکم سے ہوگا اور جو حکم کرے ایسے امر کے ساتھ جس میں اختلاف ہو اور باوجود اسکے دو مختلف حکموں کے اپنی رائے اور ظن کو درست سمجھے تو اسکا حکم شیطانی حکم ہوگا''۔(اصولِ کافی۔کتابِ حجت۔باب ۴۰۔حدیث ۳)

ان آیات اور احادیث سے ہمیں معلوم ہوا کہ:۔

۱۔اختلاف کرنے والے اور ہیں اور اختلاف دور کرنے والے اور۔

۲۔انبیاءؑ منجانب اللہ اس امر پر مامور ہیں کہ اختلافات کو رفع کریں اور انکا مقصدِ بعثت یہی ہے۔

۳۔اختلاف کرنے والے کا حکم شیطان کا حکم ہے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ انبیاءؑ (معاذ اللہ) خود آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو:۔

۱۔انکی نبوت سے انکار کرنا پڑے گا کیونکہ وہ اپنا مقصدِ بعثت ہی پورا نہیں کر رہے اور اسطرح وہ اس طبقے میں خود بھی شامل ہو گئے جنکے اختلافات رفع کرنے کے لئے انھیں بھیجا گیا تھا۔

۲۔انکو منجانب اللہ ماننے سے انکار کرنا پڑے گا کیونکہ منجانب اللہ تو وہ ہوگا جو اختلاف کو دور کرے نہ کہ وہ جو خود اختلاف کرتا ہو۔

۳۔انکی عصمت سے انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ نا فرمانی خدا کرنے والا معصوم نہیں ہوسکتا۔
۴۔عدلِ خداوندی کا انکار کرنا پڑے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ وہ (معاذ اللہ) کہتا کچھ اور ہے اور کرتا کچھ اور ہے۔
۵۔(معاذ اللہ) انبیاءؑ کو ان لوگوں میں شمار کرنا پڑے گا جن پر عذاب کا وعدہ لازم ہے۔

اگر میں نے غلط آیات یا غلط احادیث پیش کی ہیں یا حوالے غلط دیئے ہیں یا مفہوم غلط اخذ کیا ہے تو یقیناً میرا گریبان پکڑا جانا چاہیئے۔لیکن اگر سب کچھ صحیح ہے تو پھر؟؟؟؟۔

کیا انبیاءؑ کی توہین کرنے والے اور اللہ پر بہتان لگانے والے کو معاف کردیا جائیگا؟۔یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں!

بات صرف اتنی ہے کہ مولائے کائنات نے فرمایا ہے کہ "تمام برائیوں کی جڑ جہالت ہے"۔اگر وہ لوگ جو شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں طلبِ علم سے غافل نہ ہوتے اور محض چند لوگوں کی نقالی کرنے کو ہی اصلِ دین نہ سمجھ لیتے تو کسی کو یہ جراءت نہ ہوتی کہ وہ ایسی باتیں انکے سامنے بیان کرتا۔نہ انکی غیرت یہ بات گوارا کرسکتی تھی کہ انکی موجودگی میں بلکہ انکو مخاطب کرکے کوئی شخص معصوم انبیاءؑ پر الزام تراشی کرسکے۔آیئے ہم آپکو حضرت موسیٰؑ اور انکو تعلیم دینے والے عبدِ خدا کے اصل معاملے سے آگاہ کرتے ہیں۔

موسیٰؑ و خضرؑ

یہ واقعہ قرآن مجید کے سورۂ کہف میں بیان کیا گیا ہے اور آیات ۶۰ تا ۸۲ پر محیط ہے اور ان ۲۳ آیات میں خداوندِ قدوس نے علم و معرفت کے ایک ایسے سمندر کو بند کردیا ہے کہ اگر کوئی طالبِ حق ان پر صدقِ نیت سے تدبر کرے تو یہ ۲۳ آیات

قیامت تک اسکی معرفت کی پیاس بجھانے کے لئے کافی ہیں۔میرے لئے ممکن نہیں کہ اس موقعے پر میں ان تفصیلات میں جا سکوں کیونکہ اسطرح میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا۔انشا ءاللہ کسی اور موقعہ پر یہ گفتگو ہوگی۔

سب سے پہلے تو علامہ صاحب کو یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہئے کہ یہ عبدِ خدا جسکا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے کوئی نبی تھا۔ان آیات میں تو اس عبدِ خدا کا نام بھی نہیں بتایا گیا بلکہ ان الفاظ میں اسکا تعارف کرایا گیا:۔

''فو جد اعبد اً مّن عبادنا اٰتینٰہ رحمۃً مّن عندناوعلّمنٰہ من لّدنّاعلماً''

ترجمہ:۔''پھران دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی تھی اور اسے ہم نے (علمِ لدنی) اپنے انتہائی قرب سے علم کی تعلیم دی تھی''۔معلوم ہوا کہ یہ ''عبد'' تنہا نہ تھا بلکہ ''عباد'' کی ایک جماعت تھی جسکا یہ ایک فرد تھا جسے اللہ نے رحمت اور علم اپنے انتہائے قرب سے عطا فرمایا تھا۔''انتہائے قرب'' پر ہم اسی کتاب میں حقائق الصلوٰۃ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں اس لئے اسکو سمجھنے میں آپکو کوئی دشواری محسوس نہیں ہونی چاہئے۔

بعد میں کچھ روایات ایسی آئیں جن میں اس بندۂ خدا کو خضرؑ کہا گیا مگر یہ خضر بھی اسکا نام نہیں تھا بلکہ صفت تھی چنانچہ علل الشرائع میں روایت ہے کہ ایک شخص نے معصومؑ سے پوچھا کہ خضرؑ کو خضر کیوں کہتے ہیں؟۔معصومؑ نے فرمایا۔''اس لئے کہ وہ اگر سوکھی گھاس پر بیٹھتے تھے تو وہ سبز ہو جاتی تھی''۔(عربی میں خضر کے معنی سبز کے ہیں)۔اصل بات یہ ہے کہ خضر نام کے دو افراد مشہور ہیں۔ایک تو یہ جنکا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے لیکن انکا نام خضر نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا یہ انکی صفت تھی۔دوسرے وہ جسکا نام ہی خضر تھا۔بعض روایات کی سند سے وہ ایک نیک اور صالح بندہ تھا۔پھر مسلمانوں میں آج تک اس بات پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ نبی تھا یا نہیں۔بعض روایات کے مطابق وہ صرف نبی تھے اور وہ بھی

نبی علیٰ نفسہ کیونکہ وہ کسی امت پر مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک نبی ہی تھے۔ رسول ہرگز نہیں تھے اور وہ وہی ہیں جنکو غیبتِ حضرتِ صاحب الزمانؑ کی دلیل کے طور پر اللہ نے آج تک زندہ رکھا ہوا ہے جیسا کہ حضرت الیاسؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو زندہ رکھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ایک عبد کے پاس تحصیلِ علم کے لئے بھیجا جسکی صفات اس نے مندرجہ بالا آیت میں بیان فرمائیں۔ اگر یہ عبدِ خدا وہی خضر ہوتا جو نبی تھا تو موسیٰؑ کا اسکے پاس تحصیلِ علم کے لئے جانا قرینِ عقل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک نبی تھا۔ رسول ہرگز نہیں تھا جبکہ خود حضرت موسیٰؑ نبی بھی تھے۔ رسول بھی تھے۔ اولوالعزم رسول بھی تھے۔ امام بھی تھے۔ صاحبِ کتاب بھی تھے۔ صاحبِ شریعت بھی تھے اور صاحبِ کلمہ بھی۔ ان سب کے علاوہ انھیں کلیم اللہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا ہے کہ ایک نبی کو چالیس درجہ علم دیا جاتا ہے اور رسول کو چھیالیس درجے علم عطا ہوتا ہے اور اولوالعزم صاحبِ شریعت رسول کو ساٹھ درجے علم عطا ہوتا ہے۔ اسطرح حضرت موسیٰؑ اولواعزم و صاحبِ شریعت نبی ساٹھ درجے علم کے عالم تھے۔ انکے زمانے کے ہر صالح بندے خواہ وہ نبی علیٰ غیرہٖ ہو یا نبی علیٰ نفسہٖ بلکہ رسول پر بھی فرض تھا کہ وہ موسیٰؑ کا کلمہ پڑھے۔ پس اس صورت میں <u>حضرت موسیٰؑ اپنے امتی سے کیا سیکھ سکتے تھے؟۔ چالیس درجے کا عالم ساٹھ درجے کے عالم کو کیا تعلیم دے سکتا تھا</u>؟ اور خداوندِ عادل ایسا حکم کس طرح دے سکتا ہے جو خلافِ قاعدہ اور خلافِ عدل ہو کیونکہ خود اسی نے فرمایا ہے" فوق کل ذی علم علیم "۔ (ہر ذی علم کے اوپر ایک علیم ہے)۔ علیم زیادہ جاننے والے کو کہتے ہیں اور خضرؑ نبی کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ بیس (۲۰) درجہ زیادہ عالم تھے لہٰذا وہ خضرؑ نبی سے کیا سیکھیں گے؟۔ ہر صاحبِ شریعت اولوالعزم رسول کا اپنے زمانے میں بلکہ دوسرے صاحبِ شریعت رسول کے آنے تک علیم ہونا لازمی

ہے۔علیم پر فوقیت کسی علیم کو ہی ہو سکتی ہے نہ کہ ذی علم کو۔خضرؑ اگر چہ نبی بھی ہوں تب بھی ذی علم میں داخل ہیں۔علیم نہیں ہیں لہٰذا وہ معلمِ موسیٰ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتے ۔لوگ آخر علیؑ کی فضیلت سے بھاگتے کیوں ہیں؟۔انکی حتی الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو علیؑ کا نام نہ آنے پائے چاہے ایک رسولِ اولوالعزم صاحبِ کتاب وشریعت وکلمہ کو اپنے امتی کے سامنے گھٹنے ہی کیوں نہ ٹیکنے پڑ جائیں۔لیکن آپ اچھی طرح جان اور پہچان لیں کہ وہ خضرؑ کون تھا جس سے تعلیم حاصل کرنے کا حکم اللہ نے موسیٰ کو دیا تھا۔

مولائے کائنات اپنے خطبۂ معرفتِ نورانیہ میں فرماتے ہیں۔''میں ہوں وہ خضرؑ جس سے موسیٰؑ تعلیم پانے گئے تھے''۔یہ وہ خضرؑ ہے جو استادِ انبیاءؑ ہے اور قیدِ زمانی ومکانی سے باہر ہے جیسا کہ خود رسول اللہ نے فرمایا۔''یا علیؑ انت نصرت الانبیاء سراً و نصرتنی جہراً''۔اے علیؑ تم نے تمام انبیاء کی مدد مخفی رہ کر کی اور میری مدد ظاہر بظاہر ہو کر کی۔

اب آپ اصل بات پر توجہ فرمائیں ۔اللہ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ جا کر علیؑ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں اور ان سے طلبِ علم کریں۔سوچنے کی بات ہے کہ موسیٰ کے پاس کونسا علم نہیں تھا جو وہ سیکھنے گئے تھے؟۔کیا وہ تو رات کے عالم نہیں تھے؟۔کیا وہ احکامِ شریعت سے ناواقف تھے؟ کیا وہ رموزِ نبوت و رسالت سے بے خبر تھے؟۔پس معلوم ہوا کہ وہ علم جو موسیٰ سیکھنا چاہتے تھے کوئی ایسا علم تھا جس سے حضرت موسیٰ ناواقف تھے کیونکہ سیکھتا وہی ہے جو جاہل ہو اور سکھاتا وہی ہے جو عالم ہو اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ سیکھنے گئے تھے وہ علوم نبوت و کتاب وشریعت سے بالاتر کوئی علم تھا جسکا عالم ہونا حضرت موسیٰ کے لئے ضروری نہیں تھا کیونکہ اللہ کسی ایسے کو ہرگز منصبِ نبوت پر فائز نہیں کرتا جو اپنے منصب سے متعلقہ علوم سے جاہل ہو۔جب یہ علم حضرت موسیٰ کے

لئے ضروری ہی نہیں تھا تو اس سے جاہل رہنا حضرت موسیٰؑ کے مقام و مرتبے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ پھر اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو وہ علم حاصل کرنے کے لئے کیوں بھیجا جو انکے لئے ضروری ہی نہیں تھا اور نہ ان میں اسے حاصل کرنے کی طاقت و برداشت تھی؟۔واقعہ خود شاہد ہے کہ حضرت موسیٰؑ وہاں سے ناکام لوٹے اور اس علم کی ایک جھلک کو بھی برداشت نہ کرسکے کیونکہ وہ تھا "علم ما کان و ما یکون" یعنی جو کچھ گذر چکا اسکا علم اور جو کچھ آئندہ واقع ہوگا اسکا علم۔ یہ علم و قدرت و تصرفِ خدا کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ تھا۔وہ مشیت و اختیار و تصرفِ ولی اللہ کی ایک ادنیٰ سی جھلک تھی۔پس ہر شخص کو یقین رکھنا چاہئے کہ موسیٰؑ کو بھیجنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ اللہ موسیٰؑ سے اپنے ولی کا تعارف کرانا چاہتا تھا تا کہ موسیٰؑ اپنی حدود سمجھ لیں اور جان لیں کہ جسکا جلوہ دیکھنے کی انھوں نے تمنا کی تھی وہ کون تھا جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ خود ارشاد فرماتے ہیں۔" انا صاحب الطور و ذالك نور الظاہر"۔ میں ہوں صاحبِ طور اور میں ہی وہ نور ہوں جو ظاہر ہوا تھا۔

واقعہ خود شاہد ہے کہ موسیٰؑ اس علم کے ابجد سے بھی واقف نہ تھے جو وہ سیکھنے گئے تھے اور جس سے سیکھنے گئے تھے وہ اللہ کا ولی مطلق تھا جو علم و قدرت و تصرفِ خدا کا مظہرِ تامہ تھا۔جاہل کو کسی بھی اصول کے تحت یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عالم پر اعتراض کرسکے کیونکہ میرے مولاؑ نے فرمادیا ہے کہ "جاہل کے لئے تو کوئی حجت ہے ہی نہیں" لہذا یہ سوچنا کہ حضرت موسیٰؑ اور جناب امیر المومنینؑ کے درمیان کوئی اختلاف تھا ایک ایسا نظریہ ہے جس سے خود عقیدۂ عصمت مجروح ہوتا ہے اور مقام و مرتبۂ حضرت موسیٰؑ پر حرف آتا ہے۔انکے پاس جتنا علم تھا وہ ہر شے کو اسی علم کی عینک سے دیکھتے تھے اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ انکے احاطۂ علمی سے ماوراء تھا۔ایسی صورت میں حیرت و استعجاب کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے اور اسی کا اظہار حضرت موسیٰؑ نے کیا۔اگر آپ ایک سانپ کو ماردیں اور آپکا چھوٹا بچہ

کہے کہ بابا آپ نے ایک جاندار کو مار ڈالا؟ تو کیا یہ باپ بیٹے کا اختلاف کہلائے گا؟۔ نہیں! بلکہ اسکو حیرت واستعجاب کہا جائے گا جو عدم علم کا فطری نتیجہ ہے۔

یہ حقیقت تھی اس اختلاف کی جسکو بنیاد بنا کر علامہ صاحب نے اختلاف بین الفقہاء کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ چند اضافی امور تھے جن پر گفتگو کرنا انتہائی ضروری تھا اور اگر ہم انکا ذکر نہ کرتے تو اپنے فرض سے کوتاہی کرتے۔ اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسکو علیحدہ طور پر بیان کیا جائے تا کہ اسکی اہمیت واضح ہو اور مضامین آپس میں خلط ملط نہ ہوں۔

کلمۃ التّقویٰ۔(دوسرا حصہ)

کبھی کبھی یہ سوچ کر دل کو بڑی اذیت پہنچتی ہے کہ جو کلمہ مذہب شیعہ اور دیگر مذاہب کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے اور جسکی خاطر ہم صدیوں سے گردنیں کٹاتے چلے آرہے ہیں۔جس کلمے کو ثابت کرنے کے لئے ہم اغیار سے مباحث کرتے چلے آئے ہیں۔رونے کا مقام ہے کہ آج ہمیں اسی کلمے کے اثبات کے لئے خود شیعوں سے بحث و مباحثہ کرنا پڑے۔بہر حال اگر اللہ نے ہمیں یہ روزِ بد دیکھنے کے لئے زندہ رکھا ہے تو اس میں بھی اسکی کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے اور اس اعتبار سے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم بقدرِ استطاعت نصرتِ حق کی راہ میں جہاد کریں۔یہی جہاد ہے جو غیبتِ امامؑ میں بھی واجبِ عینی ہے۔نہ صرف مرد پر بلکہ عورت پر بھی۔نہ صرف جوانوں پر بلکہ بوڑھوں پر بھی۔

اس موضوع پر چند کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔علامہ محمد حسنین السابقی نے ''شہادتِ ثالثہ'' لکھی۔پھر علامہ نذر حسین قمر نے ''شہادتِ ولایتِ علیؑ'' تحریر فرمائی جو ایک نادر کتاب ہے۔مختصر مگر جامع۔اسکے بعد علامہ نثار عباس نقوی نے ''اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ'' لکھی جو یقیناً اس موضوع پر ایک مکمل دستاویز ہے۔ان تینوں کتابوں سے ہم انشاءاللہ استفادہ کریں گے۔ اپنی بے بضاعتی علم کے باوجود ہم اس کوچے میں قدم رکھ رہے ہیں تاکہ روزِ محشر جب ولایتِ علیؑ کی وکالت کرنے والوں کی فہرست سامنے آئے تو اسکے ایک گوشے میں ہمارا نام بھی ہو اور ہماری دعا ہے کہ اس ادنیٰ سی کوشش کے صدقے میں جنت وجہنم کا تقسیم کرنے والا میرا مولا علیؑ جہنم سے مخاطب ہو کر کہے:۔

''یہ میرا ہے۔اسے ہاتھ بھی نہ لگانا''۔

بات یہ ہے کہ حبِّ جاہ بہت بری چیز ہے۔شہرت حاصل کرنے کا شوق آدمی کو کہیں سے کہیں لے جا کر پھینک دیتا ہے۔شیطانِ لعین نے جو کچھ کیا وہ کیا تھا؟۔صرف شہرت کا شوق۔اور آج اسکی شہرت کا عالم یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک وجود بھی ایسا نہ ہوگا جو اسے نہ جانتا ہو۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ شہرت معمولی کاموں سے نہیں ملتی۔اسکے لئے کسی عظیم الشان شخصیت کے مقابلے پر آنا پڑتا ہے۔اسطرح آدمی ذلیل تو ضرور ہوتا ہے مگر شہرت بہرحال مل جاتی ہے۔انتہائی شہرت حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی شخص علیؑ کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نادانستگی میں ایسا نہیں کر رہا بلکہ حقیقتاً وہ علیؑ کو جانتا بھی ہے اور پہچانتا بھی ہے اور یہ بات اسکی تحریرات سے ثابت ہوتی ہے لیکن علیؑ کے صدقے میں ملی ہوئی شریعت کو وہ اپنا ہتھیار بناتا ہے اور حرام و حلال و مستحب و واجب کی آڑ لیکر ولایتِ علیؑ پر حملے کرتا ہے۔اعلانِ ولایتِ علیؑ کے فوراً بعد جس شخص نے پہلی مرتبہ اسکی مخالفت کی وہ حارث بن نعمان فہری تھا۔ آپ ذرا اس بات پر غور فرمائیں کہ کیا واقعہ غدیر سے پہلے اس ملعون کو کوئی جانتا تھا؟۔یہ مشہور ہی اس واقعہ سے ہوا ہے۔بالکل اسی طرح شہرت کے بھوکے کچھ لوگ حارث بن نعمان فہری کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے۔اپنی عاقبت کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے صرف شہرت کے شوق میں شہادتِ ولایتِ علیؑ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں کیونکہ اس صورت میں شہرت انھیں بہرحال ملتی ہے۔چاہے منافقین کی تعریف کے ذریعے ملے یا مومنین کی لعنت کے ذریعے۔لیکن اللہ اپنے نور کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر رہے گا چاہے مجرم کراہت ہی کیوں نہ کریں۔

<u>ان لوگوں کی ان تمام کوششوں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ولایتِ علیؑ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو شریعت کے کوزے میں بند کر دیا جائے۔</u>
یہ انکی اپنی سوچ ہے۔ان فتنہ گروں کو جاننا چاہئے (اور یہ بھی میں از راہِ تکلف کہہ

رہا ہوں ورنہ یہ پہلے سے ہی جانتے ہیں) کہ ولایت علیؑ کو شریعت کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔شریعت نہ تھی مگر یہ تھی۔اسی کے صدقے میں کائنات بنی۔ہم بنے۔دین بنا اور شریعت بنی۔شریعت تو بعد میں آتی ہے پہلے تو ہمارا اپنا وجود ہے۔ہم ہونگے تو شریعت پر عمل کریں گے۔ہمارا وجود ہی نہ ہو تو شریعت ہمارے کس کام کی؟ ۔لہٰذا پہلے تو ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم خود کس طرح وجود میں آئے۔کس کے ذریعے وجود میں آئے اور کس کے لئے وجود میں آئے۔تب ہی ہمیں اپنا مقصدِ حیات معلوم ہوگا اور ہم یہ جان لیں گے کہ بغیر مقصد کو پورا کئے ہم جو بھی کام کریں گے وہ دیوانگی کے زمرے میں آئے گا۔یہاں ہم نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ سے جناب امیرؑ کے خطبۂ طارق سے ایک مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں جو آپؑ نے امام کی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔آپؑ فرماتے ہیں:۔

''پس وہ (امام) تمام آسمانوں اور زمین پر اسکا ولی ہے۔خدا نے اس بات پر اپنے بندوں سے عہد لیا ہے۔پس جس نے اس پر سبقت کی اس نے خدائے عرش سے کفر کیا۔انکے نام پتھروں پر۔درختوں کے پتوں پر۔پرندوں کے پروں پر۔جنت و جہنم کے دروازوں پر۔عرش اور آسمانوں پر۔فرشتوں کے بازؤں پر اور حجاب ہائے عظمت و جلالِ الٰہی پر اور عزّ و جمالِ الٰہی کے سراپردوں پر لکھے ہوئے ہیں۔انہی کے نام سے پرندے تسبیح کرتے ہیں اور انکے شیعوں کے لئے مچھلیاں سمندر میں استغفار کرتی ہیں۔اللہ نے اپنی مخلوق کو پیدا نہیں کیا جب تک اس سے اپنی وحدانیت اور اس ذریّت ذکیہ کی ولایت اور انکے دشمنوں سے براءت کا عہد نہ لے لیا اور عرش قائم نہ ہوا جب تک کہ اس پر نور سے لا الہ الا اللہ۔ محمد الرسول اللہ۔علی'' ولی اللہ نہ لکھا گیا۔

کیا اس بات کی تشریح کی ضرورت ہے کہ جسکی ولایت کا اقرار اور

عہد کرکے ہی ہمیں وجود نصیب ہوا اسی کی ولایت کو ہم متنازعہ بناتے پھریں اور اسے جائز و مستحب و واجب کی حدود میں قید کرنے کی کوشش کرتے رہیں؟۔ یہ بحث کا مقام نہیں بلکہ شرم کا مقام ہے۔

فرض۔ واجب۔ اور۔۔۔۔؟

یہ شرعی اصطلاحیں ہیں جو ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن شہادتِ ولایتِ علیؑ کے تناظر میں ہم اس پر مختصر گفتگو کریں گے۔

فرض اور واجب دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ علمِ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی بھی مستقل زبان میں ایک معنی کے لئے دو لفظ کبھی نہیں ہوتے۔ مستقل زبانوں میں عبرانی۔ سنسکرت اور عربی سرِفہرست ہیں۔ اسطرح فرض اور واجب ہم معنی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ان میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور ہے۔ جتنے بھی فروعی اعمال ہیں مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ ان سب کو اللہ نے ہم پر فرض کیا ہے۔ قرآن ہو یا حدیث۔ ہر مقام پر ان چیزوں کے لئے لفظ ''فرض'' یا ''فریضہ'' ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ اس ''فرض'' کو ''واجب'' کس نے بنایا۔ ہم کسی کی عملداری میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے لیکن ان دونوں الفاظ میں جو فرق ہے اسکی وضاحت کرنا ہمارے لئے ضروری ہے لیکن مجبوری ہماری یہ ہے کہ ہماری زبان یعنی اردو میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ وہ عربی زبان کے تمام الفاظ کی ترجمان بن سکے۔ خاص طور پر علمی اصطلاحوں کو بعینہٖ اردو میں منتقل کرنا ایک انتہائی دشوار گذار مرحلہ ہے لہٰذا آپ سے انتہائی معذرت کے ساتھ ہم انگریزی زبان کے چند الفاظ کا سہارا لیں گے جن سے آپ مانوس بھی ہیں۔

''فرض'' کے معنی ہیں ''DUTY'' یعنی ذمہ داری۔ آپ اپنے دفتر جاتے ہیں تو یہ فرض ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ فرض کبھی کبھی چھوٹ بھی جاتا

ہے۔آدمی بیمار ہو یا اسے کوئی ضروری کام یا مجبوری درپیش آجائے تو وہ دفتر نہیں جاتا۔فروعِ دین بھی فرض ہیں جو اکثر لوگوں سے چھوٹ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات اللہ خود ہی منع کر دیتا ہے مثلاً مہینے میں چند ایام ہیں جن کے دوران اللہ نے عورت کو نماز معاف کر رکھی ہے۔اگر یہ چیزیں واجب ہوتیں تو انکا ترک کسی صورت میں بھی جائز نہ ہوتا۔''واجب'' کے معنی ہیں ''essential'' یعنی ضروری۔اس فرق کو میں اسطرح سمجھاؤں کہ اگر کوئی کسی وجہ سے دفتر نہ جاسکے تو اسکا عذر قبول کرلیا جاتا ہے اور چھٹی مل جاتی ہے۔لیکن اگر وہ دفتر چلا گیا تو وہاں جاکر اسے ہر قیمت پر وہ تمام امور سرانجام دینا پڑیں گے جو اسے تفویض کئے جائیں بصورتِ دیگر جواب طلبی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں سزا بھی ملتی ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کسی سے نماز چھوٹ گئی تو اس پر صرف یہ الزام ہوگا کہ وہ اپنے فرض سے غافل رہا جسکی قضا بھی ہے لیکن جب وہ نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا تو اب اس پر واجب ہے کہ وہ ان تمام ارکان کو بجالائے جو نماز کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان نماز تو پڑھے لیکن رکوع نہ کرے یا سجدہ نہ کرے۔یعنی نماز فرض ہے اور ارکانِ نماز واجب اور یہ بات بدیہی ہے کہ واجب فرض سے مشروط ہوتا ہے یعنی نماز پڑھیں گے تو ارکانِ نماز بجالائیں گے ورنہ نہیں۔جبکہ شہادتِ ولایتِ علیؑ کسی شے سے مشروط نہیں ہے <u>بلکہ وہ تو بذاتِ خود ہر عمل کیلئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔</u>

<u>اور؟</u>

حقیقت یہ ہے کہ ولایتِ علیؑ کو اللہ نے میزانِ شریعت میں نہیں تولا اور اسی لئے نہ اسکے لئے لفظِ فرض استعمال کیا اور نہ لفظِ واجب بلکہ ایک ایسا لفظ استعمال فرمایا جو قرآنِ مجید میں صرف ایک ہی مقام پر وارد ہوا ہے۔گویا اللہ نے اس لفظ کو ولایتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ کے لئے تا قیامت مخصوص کر دیا تا کہ کسی بھی زمانے

میں شریعت کا کوئی بھی ٹھیکیدار ولایتِ علیؑ میں موشگافیاں نہ کرسکے اور اس پر مباح و مستحب و فرض و واجب کی بحث نہ چھیڑ سکے۔ چنانچہ سورۂ فتح کی آیت ۲۶ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہٖ و علی المومنین و الزمھم کلمۃ التقویٰ"۔

ترجمہ:۔ "پس اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنین پر تسکین اتاردی اور کلمۂ تقویٰ ان پر لازم کردیا"

لازم کے معنی ہیں "COMPULSORY" یعنی ناگزیر۔ یعنی ایسا کام جو آپکے وجود کا حصہ ہو اور جسے ایک لمحے کے لئے بھی ترک نہ کیا جاسکے۔ سانس لینا آپکے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوسکتا جس میں آپ سانس نہ لیں۔ اللہ نے کلمۂ تقویٰ ہم پر لازم کیا ہے اور اسلئے کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوسکتا جس میں ہم اس کلمے کو ترک کرسکیں اور کلمۂ تقویٰ اسی کا کلمہ ہے جو امام المتقین ہے اور یہ کلمہ اللہ نے اپنے رسولؐ پر بھی اسی طرح لازم کیا ہے جس طرح باقی تمام مومنین پر۔ جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیت ۴۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور (اے رسولؐ) جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اس سے تمسک رکھو"۔ تمسک کے لغوی معنی ہیں "چمٹ جانا۔ مضبوطی سے تھامے رہنا" لہٰذا جس شے سے تمسک رکھنے کا حکم رسولؐ کو دیا جارہا ہے رسولؐ پر لازم ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی اسے خود سے جدا نہ کریں۔ علامہ ابی الحسن تفسیر قمی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "یہ آیت حضرت علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے اور آیت "پس ہم نے وحی کی اپنے بندے (رسولؐ) پر جو وحی کی" کی بابت جب حضورؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا۔ "مجھ پر وحی کی گئی کہ علیؑ سیدالمومنین اور امام المتقین ہیں"۔ (شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ ۱۰۳ بحوالہ تفسیر مراۃ الانوار صفحہ ۳۳۵ طبع

ایران)۔اسی طرح ابی حمزہ ثمالی امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ "خدا نے جبرئیلؑ کو محمدؐ کی طرف بھیجا کہ وہ اپنی زندگی میں (یعنی زندگی بھر) ولایتِ علیؑ کی شہادت دیں"۔(شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ ۱۲۰ بحوالہ امالی مفید صفحہ ۱۸ مطبوعہ نجف اشرف)۔اس آیت سے دو باتیں واضح ہو جانی چاہئیں۔پہلی یہ کہ "سکینہ" یا "تسکین" مشروط ہے کلمۃ التقویٰ سے لہٰذا جو شخص کلمۂ تقویٰ سے تہی دامن ہے یا اسکا انکار کرتا ہے یا اس سے غافل ہے یا اس بارے میں ابہام رکھتا ہے تو اسکے نصیب میں سکون ہو ہی نہیں سکتا۔نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ۔دوسری بات یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب طلباء کو امتحانی پرچہ دیا جاتا ہے تو اس میں یہ تاکید موجود ہوتی ہے کہ فلاں سوال لازمی ہے اور اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی طالبِ علم باقی سارا پرچہ بالکل صحیح حل کر دے لیکن وہ لازمی سوال حل نہ کرے تو اسے ناکام قرار دیا جائے گا۔بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص زندگی بھر "اللّٰہ ربی محمدؐ رسولی قرآن کتابی کعبۃ قبلتی" رٹتا رہے لیکن علیؑ ولی اللّٰہ سے بیگانہ رہے تو گویا اس نے اپنی پوری زندگی پر خود ہی پانی پھیر دیا اور آخرت میں جب وہ اٹھایا جائے گا تو اسکا شمار یقیناً خاسرین میں ہوگا۔

از مہد تا لحد۔ از ازل تا ابد یا علیؑ!

علماء نے لکھا ہے کہ انسان کی پوری زندگی دو چیزوں کے درمیان محصور ہے۔قول اور عمل۔لیکن میں بصد عجز و نیاز عرض کرتا ہوں کہ انسان کی پوری زندگی صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہ ہے عمل کیونکہ قول (بات کرنا) بذاتِ خود ایک عمل ہے۔اگر آپ غور فرمائیں تو انسان کا پیدا ہونا۔سانس لینا۔کھانا پینا۔جاگنا سونا یہاں تک کہ مرنا۔یہ تمام کے تمام عمل کے زمرے میں آتے ہیں۔اور چونکہ عمل کیلئے نیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے سرورِ کائنات حضرت ختمی مرتبت ارشاد

فرماتے ہیں۔

''لِیَکُن فِی کُلِّ شیءٌ نیته'' حتیٰ فی الاَ کلَ وَ النّوم''

ترجمہ:۔''تمھارے ہرکام میں نیت ہونی چاہئے یہاں تک کہ کھانے اور نیند میں بھی''۔ (فلسفۂ اسلام حصہ اول صفحہ ۳۷۸)۔ اب چونکہ ہمارا مقصدِ خلقت عبادتِ خدا ہے اس لئے ہم صرف نماز روزے پر ہی مامور نہیں ہیں بلکہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کے لئے پیشِ خدا جوابدہ ہیں کیونکہ ہماری پوری زندگی عمل ہے اور یہ بات محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ عمل اس وقت تک فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اللہ اسے قبول نہ کرلے۔ اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔ ''عمل سے زیادہ قبولیتِ عمل میں شدید کوشش کرو''۔لہٰذا یہ بات عقلی ہے کہ عمل سے پہلے یہ فکر کرنا انتہائی ضروری ہے کہ عمل قبول کیسے ہوگا۔ جب یہ طے ہوگیا کہ بغیر قبولیت کے ہر عمل بیکار۔اکارت اور برباد ہےتو قبولیتِ عمل کا راستہ تلاش کرنا ہمارے لئے ضروری ہوجاتا ہے۔عمل کو قبول کرنے والا خود اللہ ہے اسلئے ہم اسی سے پوچھتے ہیں کہ وہ عمل کو کیونکر شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔''بس اور بس (انّما) اللہ صرف متقین سے ہی قبول کرتا ہے''۔

اب آپ اس بات کا صحیح اندازہ فرمایئے جو میں عرض کررہا ہوں۔ پیدائش سے لیکر موت تک ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ عمل ہے اور عمل بغیر قبولیت بیکارِ محض ہے اور شرطِ قبولیت متقی ہونا ہے اور متقی بننا محال ہے جب تک کہ کلمۂ تقویٰ کو اپنے وجود کا حصہ نہ بنالیا جائے۔اس سے ثابت ہوا کہ <u>بغیر علی'' ولی اللہ نہ ہماری پیدائش مستند ہوتی ہے اور نہ موت اور نہ ان دونوں کا درمیانی وقفہ</u>۔یعنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اکارت ہے اور یہ بات آپ سب جانتے ہیں کہ حساب تو ایک ایک لمحے کا ہونا ہے کیونکہ ہمیں زندگی ملی ہی اس لئے ہے کہ ہم عبادتِ خدا کریں۔اسی لئے رسول اللہؐ ایک حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ معراج سے واپسی کے وقت اللہ نے فرمایا۔"اپنی امت سے کہہ دینا کہ علیؑ" ولی اللہ میرے اور تمھارے درمیان وسیلہ ہے اس سے غافل نہ ہونا۔اور یاد رکھو نہ تمھاری اذان مکمل ہوگی نہ اقامت نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ نہ تمھاری ولادت نہ تمھاری موت مگر ذکرِ علیؑ ابن ابی طالبؑ سے "۔ (اکمال الدین بولایت امیر المومنینؑ بحوالہ تنویر الایمان از محمد بن یعقوب کلینیؒ)

علیؑ" ولی اللہ کا لازم ہونا ہم نے قرآن سے ثابت کر دیا اور احادیث سے اسکی تائید پیش کر دی اسلئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن آپ کے اطمینان کو تقویت دینے کیلئے ہم اسکی عقلی دلیل بیان کرتے ہیں۔

جو کنویں کے مینڈک ہیں وہ انہی امور پر مشغولِ بحث رہتے ہیں کہ شہادتِ ولایت علیؑ مباح ہے۔مستحب ہے۔فرض ہے یا واجب؟۔بعض ناصبین وہ ہیں جو اسکے مباح ہونے کے بھی قائل نہیں لیکن ایسے لوگوں کی باتوں پر نہ تو ہم اپنا وقت ضائع کریں گے اور نہ انکا ذکر کر کے اس کتاب کو نجاست سے آلودہ کریں گے۔البتہ وہ سادہ لوح لوگ جو اپنی استعداد عقلی سے مجبور ہو کر مباح و مستحب و فرض و واجب ہی کی بحث میں الجھے رہتے ہیں انکی تصحیح کرنا ضروری ہے۔وہ ہمیں بتائیں کہ کیا کبھی کسی امرِ مباح کو ترک کرنے پر اللہ نے اپنا عذاب نازل فرمایا ہے؟۔کیا کبھی ترکِ مستحب پر عذاب تو درکنار کوئی تنبیہ بھی آئی ہے؟۔نمازِ شب مستحب ہے۔کیا کسی ایسے شخص پر جو نمازِ شب نہ پڑھتا ہو کبھی کوئی عذاب آیا ہے؟۔کیا کوئی تارکِ فرائض کبھی زیرِ عتاب آیا ہے؟۔کیا کبھی کوئی ایسا شخص معذب ہوا ہے جو نماز نہ پڑھتا ہو یا روزہ نہ رکھتا ہو؟۔لیکن ولایت علیؑ کی تو شان ہی کچھ اور ہے۔ یہاں تو اللہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کو توڑ دیتا ہے۔اللہ نے سورۂ انفال کی آیت ۳۳ میں اپنا ایک قانون ان الفاظ میں بیان

فرمایا۔ ''اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان پر عذاب کرے جبکہ (اے رسولؐ) تم ان میں موجود ہو''۔ اس آیت میں اللہ نے اپنا قانون بتا دیا کہ جب تک اس امت میں رسولؐ موجود ہیں وہ اس پر اپنا عذاب نازل نہیں کرے گا۔ آج بھی مسلمان اسی لئے عذاب سے بچے ہوئے ہیں کہ ان میں ایک محمدؐ موجود ہے۔ مگر خدا جانے وہ کونسی بات تھی جسکی خاطر اللہ نے اپنے بنائے ہوئے قانون کو خود ہی توڑا۔ سورۂ المعارج کی پہلی اور دوسری آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''ایک سوال کرنے والے نے ایک ایسا عذاب مانگا جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے اسے کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے''۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ سوال کرنے والا حارث بن نعمان فہری تھا۔ از روئے قانونِ الٰہی ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ اس سے کہا جاتا کہ چونکہ رسولؐ موجود ہیں اس لئے اس وقت تجھ پر عذاب نازل نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت میں دیکھا جائیگا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں بلکہ جیسے ہی اس نے انکارِ ولایت کیا اور انکار کر کے عذاب مانگا تو اللہ نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی اور رسولؐ کی موجودگی میں اس پر وہ عذاب نازل فرمایا جو کافروں کے لئے مخصوص ہے۔ معلوم ہوا کہ منکرِ ولایت علیؑ از روئے قرآن کافر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ غاشیہ آیات ۲۳۔۲۴ میں خداوندِ لم یزل ارشاد فرماتا ہے۔ ''مگر جس نے منہ پھیر لیا اور کفر کیا پس اسے اللہ تعالیٰ بڑے عذاب سے سزا دے گا''۔ حارث بن نعمان فہری بھی منہ پھیر کر چلا تھا۔ تو پھر بات اس تک ہی کیوں محدود رہے؟۔ قیامت تک جو بھی ولایتِ علیؑ سے منہ پھیرے گا اسکا یہی انجام ہونا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملعون نے انکارِ ولایت میں اسقدر شدت سے کیوں کام لیا؟۔ آپ اگر ذرا سا بھی غور فرمائیں گے تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ اگر ولایت علیؑ کو محض مستحب یا واجب جانتا ہوتا تو اتنے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہ کرتا۔ وہ یہی سوچتا کہ چلو اگر رسولؐ نے کہہ دیا ہے تو اس سے میرا

کیا بگڑتا ہے؟۔مستحب پرعمل نہ کرنے سے کوئی گناہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔میں نہیں مانوں گا تو میرا کیا نقصان ہوگا؟۔واجب پرعمل نہ کرنے سے آدمی گنہگار ہو جاتا ہے۔کافر تو نہیں ہو جاتا۔میں اگر ولایت کو نہیں مانوں گا تو بہت سے بہت گنہگار ہو جاؤں گا۔میں اور بھی بہت سے گناہ کرتا ہوں چلو ایک گناہ اور صحیح۔پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟۔لیکن وہ بڑی دوررس نگاہ رکھتا تھا۔وہ آجکل کے مولویوں کی طرح احمق نہیں تھا۔وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ رسولؐ نے کیا فرمایا ہے اور اچھی طرح جان رہا تھا کہ بات گناہ ثواب کی نہیں ہے بلکہ معاملہ سیدھا سیدھا کفر اور ایمان کا ہے۔اسی لئے جب اس نے انکار کیا تو عذاب بھی وہی مانگا جو کافروں کیلئے مخصوص ہے۔اگر سوچا جائے تو شہادتِ ولایت میں لیت ولعل کرنے والوں اور اس میں شبہات پیدا کرنے والوں سے وہ ملعون بہتر تھا۔کم ازکم وہ حقیقتِ ولایتِ علیؑ سے تو واقف تھا۔اس نے حقیقتِ ولایت سے انکار نہیں کیا تھا۔اس نے محض اس حقیقت کو ماننے سے انکار کیا تھا مگر ہائے یہ بھولے بھالے شیعہ علماء جنھیں آج تک یہی سمجھ میں نہ آیا کہ ولایتِ علیؑ (معاذ اللہ) مبطلِ اعمال ہے یا مباح ہے یا مستحب ہے یا واجب ہے؟۔جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں اور جنکو علم نہیں وہ اب جان لیں کہ مجتہدین کی اکثریت نے شہادتِ ولایتِ علیؑ کو مبطلِ اعمال قرار دیا ہے۔کچھ تھوڑے سے لوگوں نے حضرتِ ولایت پناہ کے ساتھ ذرا سی رعایت برتی ہے اور انھوں نے انکی ولایت کی شہادت کو مباح یعنی جائز و حلال کردیا ہے۔مباح وہ شے ہوتی ہے جسکا کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہوتے ہیں۔یعنی کرنے پر کوئی ثواب نہیں ہوتا اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔وہ کہتے ہیں کہ بہ رجاءِ محبوبیت اگر کوئی پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھ لے۔گویا دل خوش کرنے کیلئے پڑھا جا سکتا ہے۔وہ چند لوگ جنھوں نے امیرالمومنینؑ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے انھوں نے اسے مستحب کہا ہے۔واجب کی تو خیر بات ہی چھوڑیئے اور جس مقام پر ہم گفتگو کررہے ہیں یعنی لزوم وہ تو

انکے خواب وخیال میں بھی نہیں آ سکتا۔

جن علامہ صاحب کے ذکرِ خیر سے ابتدا ہوئی تھی انھوں نے دورانِ تقریر ایک بہت بڑے مجتہد کے بارے میں یہ ہوشربا انکشاف فرمایا کہ انھوں نے صرف غدیرِ خم کے موضوع پر ایک لاکھ کتابیں پڑھکر تیرہ (۱۳) جلدوں پر مشتمل ایک کتاب "الغدیر" تالیف فرمائی۔ آپ یہ غور فرمائیے کہ ایک لاکھ کتابیں پڑھکر اور ۱۳ کتابیں لکھ کر بھی جسکی سمجھ میں غدیر نہ آسکا اور وہ پھر بھی مباح و مستحب کے درمیان چکر کاٹتا رہا اس سے تو وہ جاہل اچھا جو صرف ایک جملہ سن کر حق ولایت کو پہچان لے۔

اب ہم کلمہ۔ اذان۔ اقامت اور نماز میں شہادتِ ثالثہ کے اثبات کیلئے جدا جدا گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

کلمہ اور شہادتِ ثالثہ

یہاں میں ایک انتہائی اہم بات کرنے جارہا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ میرے پڑھنے والے اس پر خلوصِ دل سے غور فرمائیں گے اور اسے اصولِ زندگی بنا کر ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

ہمیں چند شہادتیں ادا کرنے پر مامور کیا گیا ہے جو شرطِ ایمان ہیں۔ اب ان شہادتوں کی تعداد پر اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ شہادتیں دو ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تین یا اس سے زیادہ ہیں۔ لیکن اس دو اور تین کی بحث سے قطع نظر یہ بات طے ہے کہ جس شہادت کا بھی ہمیں حکم دیا گیا ہے تو ہر مقام پر وہی شہادت دی جائیگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کلمے میں شہادت دی جائے اور اذان میں ترک کردی جائے۔ اقامت میں شہادت دی جائے اور تشہد میں نہ دی جائے۔ اب جنکا قول یہ ہے کہ شہادتیں دو ہیں تو وہ ہر مقام پر دو ہی شہادتیں دیں گے اور جنکا مذہب یہ ہے کہ شہادتیں تین ہیں انھیں ہر مقام

پر تین ہی شہادتیں دینا پڑیں گی۔ لہٰذا ان لوگوں کو اپنی غلط فہمی دور کر لینا چاہئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ کلمہ واذان میں شہادت اور ہے اور نماز میں اور۔ شہادت جو بھی ہے ہر مقام پر وہی ہوگی۔ اس میں کلمہ واذان واقامت ونماز کی تفریق نہیں کی جا سکتی جسکی دلیل احتجاج طبرسی میں درج امام جعفر صادقؑ کی وہ حدیث ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''تم میں سے کوئی بھی جب بھی کہے لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ تو فوراً کہے علی'' امیر المومنین ولی اللہ''۔ اس حدیث میں معصومؑ نے کسی بھی شخص۔ کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام کا استثناء نہیں فرمایا۔ اب جو بھی۔ جب بھی اور جہاں بھی شہادت دے گا تو یہی تین شہادتیں ادا کرے گا۔ اس سے کسی فردِ واحد کو بھی مفر نہیں۔ اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ ہر مقام پر جدا جدا اثباتِ شہادت کیا جائے۔ اس جداگانہ بحث سے ہمارا مقصد صرف ان حضرات کے اذہان کو تسکین پہنچانا ہے جو اس اصول سے واقف نہیں ہیں۔ سب سے پہلے ہم قرآن کی روشنی میں یہ طے کریں گے کہ شہادتیں کتنی ہیں اور پھر تفسیرِ معصومؑ کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ شہادتیں کون کون سی ہیں۔ حالانکہ یہ ہم پہلے ہی جان چکے ہیں لیکن اپنے برادرانِ ایمانی کیلئے تھوڑی سی کوشش اور سہی۔

سورۂ فاطر ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

''اِلیہ یَصعدُ الکِلَمُ الطَیبُ والعمل الصالح یر فَعہ''

ترجمہ:۔ ''اسی کے حضور پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں اور نیک عمل بلند ہوتے ہیں''۔

آیت میں لفظ ''کلم'' جمع کا صیغہ ہے جسکے لئے کم از کم تین کلموں کا ہونا ضروری ہے۔ گویا قرآن نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ طے کر دیا کہ جن شہادتوں کو ادا کرنے پر ہمیں مامور کیا گیا ہے انکی تعداد دو نہیں بلکہ تین ہے۔ یہ ایک بڑی مشکل حل ہوگئی اور اب ''شہادتین'' یعنی دو شہادتوں کی مکمل نفی ہوگئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تین

شہادتیں ہیں کونسی؟۔

اس آیت کا مفہوم جب صادقِ آلِ محمدؐ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا۔

''الکلم الطیب'' سے مراد مومن کا وہ قول ہے جس میں وہ کہتا ہے لا الہ الااللہ۔ محمدؐ الرسول اللہ۔ علیؑ'' ولی اللہ''۔(شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ۱۵۲ بحوالہ تفسیر صافی۔ تفسیر مراۃ الانوار۔ تفسیر البرہان)۔ جب اتنی بات واضح ہوگئی تو اب اصل بات تک پہنچنا کم از کم مومن کے لئے تو کوئی مشکل نہ رہا۔ وہ تو اب ابتدائے کائنات پر نظر ڈالے گا اور عالمِ ذر میں جائے گا کیونکہ ہم وہاں سے کوئی عہد کر کے آئے ہیں اور یہ زندگی ہمیں ملی ہی اس لئے ہے کہ ہم اس عہد کو پورا کر سکیں۔ یہ بات اگر کوئی نہیں سمجھ پا رہا تو وہ جان لے کے زندگانی دنیا اپنے ماضی اور مستقبل سے کٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تسلسل ہے جو عالمِ ذر سے شروع ہوتا ہے اور قیامت پر ختم ہوتا ہے۔

لوحِ محفوظ پر کلمہ

رسول اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے فرمایا کہ ''خدا نے لوحِ محفوظ کو خلق کیا۔ پھر خدا نے قلم کو خلق کر کے فرمایا کہ لکھو تو قلم نے کہا کہ کیا لکھوں؟ تو کہا کہ لکھ'' لا الہ الااللہ۔ محمدؐ الرسول اللہ۔ علیؑ'' ولی اللہ''(شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ۱۲۳ بحوالہ مدینۃ المعاجز اور کفایۃ المواحدین)۔

جب ابتدائے خلق کا حال معلوم ہوگیا تو اب ہم اپنے کئے ہوئے اس عہد کے بارے میں تدبر کرتے ہیں جو ہم نے ''الست بربکم'' کے جواب میں کیا تھا۔

عالمِ ذر میں بنی آدم کا کلمہ

امام جعفر صادقؑ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ''خدا نے حضرت آدمؑ کی پشت سے انکی قیامت تک پیدا ہونے والی اولا د کو نکالا اور اپنی ذات کی معرفت کرائی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کو خدا کی معرفت نہ ہوتی۔ اور فرمایا۔'' کیا میں

تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا۔ بیشک تو ہمارا رب ہے اور یہ کہ محمدؐ میرے رسول اور علیؑ امیر المومنین ہیں"۔ (شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ ۱۴۰ بحوالہ بصائر الدرجات۔ الیقین۔ مدینۃ المعاجز اور اصولِ کافی)۔ ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ ابتدائے کائنات کس کلمے سے ہوئی اور ہم نے یہ بھی جان لیا کہ عالمِ ذر میں ہم نے کونسا عہد کیا تھا جسکو پورا کرنے کیلئے ہمیں اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا انجام کس کلمے پر ہونا ہے۔

کلمۂ حشر

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "اے علیؑ تیرے شیعہ اپنی اپنی قبروں سے یہ کہتے ہوئے نکلیں گے۔ "لا الہ الا اللہ۔ محمدٌ الرسول اللہ۔ علیٌ" حجۃ اللہ" (شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ ۱۴۸ بحوالہ شجرِ طوبیٰ جلد ۱ صفحہ ۸ مطبوعہ نجفِ اشرف)۔

آپ نے محسوس فرمایا ہوگا کہ ابتداء سے لیکر انتہاء تک کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں شہادتِ ولایتِ امیر المومنینؑ موجود نہ ہو۔ یہ پیغام ہے پوری عالمِ انسانیت کیلئے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے اور پھر ان میں سے بھی خصوصی طور پر انکے لئے جو خود کو شیعہ کہتے ہیں کہ وہ مولویوں کے بہکاوے میں آ کر اپنے اس عہد کو فراموش نہ کریں جسکے پورا کرنے پر ہی انکی نجات کا دارومدار ہے یہی وجہ ہے کہ قیامت میں مومنین اللہ کا شکر یہ ادا کریں گے تو اسی بات پر کہ اس نے ولایتِ علیؑ پر انھیں ثابت قدم رکھا۔ سورۂ اعراف ۴۳ میں اہلِ جنت کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ "اور وہ کہیں گے کہ حمد اللہ ہی کیلئے ہے جس نے ہم کو اِس کی طرف ہدایت کی اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت پا ہی نہیں سکتے"۔

"ھذا" اشارۂ قریب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کے قریب ہی کوئی ہوگا جسکی ہدایت پانے پر وہ اللہ کا شکریہ ادا کریں گے۔ اصولِ کافی

اور تفسیرِ صافی ۔ دونوں میں منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم کو جناب امیر المومنینؑ اور ائمۂ معصومینؑ کی ہدایت قبول کرنے کی توفیق ملی''۔

اسی سورۂ اعراف کہ آیت ۴۷ میں اہلِ جنت کا ذکر کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے ۔''اور جب انکی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو وہ کہہ اٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کی قوم کے ساتھ نہ رکھیو''۔''ظالمین'' کی تصریح کرتے ہوئے جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں ۔''ظالم وہ لوگ ہیں جنھوں نے میری ولایت کو جھٹلایا اور میرے حق کو چھپایا''۔ہم بھی یہ دعا کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار! دنیا ہو یا آخرت ہمیں کہیں بھی ظالموں کے ساتھ نہ رکھنا''۔

کلمۂ ولایتِ علیؑ دورِ رسالت میں

ا۔ یہاں ہم کتاب ''شہادتِ ولایتِ علیؑ'' کے صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۲ سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں خداوندِ عالم نے اپنے رسولؐ اور انکے اصحاب کی موجودگی میں کلمۂ ولایت کو بطورِ اعجاز ظاہر فرمایا ہے۔ یہ روایت مدینۃ المعاجز صفحہ ۱۸۸ سے اخذ کی گئی ہے:۔

''ایک روز رسالت مآبؐ تشریف فرما تھے کہ ایک عورت اپنے بچے کو لئے وہاں سے گذری۔حضورؐ نے بچے سے پوچھا۔اے بچے! بتا میں کون ہوں؟۔اس بچے نے جواب دیا کہ آپؐ خدا کے رسولؐ خاتم النبیین ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور علیؑ ولی اللہ ہیں''۔(اقتباس جاری ہے)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ننھا بچہ جو ابھی ماں کی گود میں ہے آخر اسکی زبان پر وہ کلمہ کیسے آیا جو عام طور پر شیعوں کے ہاں مروّج ہے یعنی شہادتِ توحید و رسالت کے ساتھ شہادتِ علیؑ ''ولی اللہ۔اگر کلمے کے وہ الفاظ جو ایک بچے نے

ادا کئے زمانۂ رسولؐ میں جاری و ساری نہ تھے تو گود کے ایک بچے نے یہ الفاظ کیسے ادا کر ڈالے؟۔اور اگر بچے نے علیؑ ولی اللہ کے الفاظ ادا کر ہی دیئے تھے تو کیا رسالت مآبؐ کا یہ فرضِ منصبی نہ تھا کہ وہ بچے کو فوراً ٹوک دیتے اور بچے کو نہیں تو کم از کم ان اصحاب کو جنکے سامنے بچے نے یہ الفاظ کہے حضورؐ نے فرمادیا ہوتا کہ بچے نے شہادت جن الفاظ کے ساتھ دی وہ درست نہیں ۔ایک بچے کا اور وہ بھی مقام اعجاز پر وہ کلمہ پڑھنا جو اہلِ تشیع کے ہاں مروّج ہے اور حضورؐ کا ان الفاظ کے خلاف کوئی بیان نہ دینا اس امر کی دلیل ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں کلمہ انہی الفاظ کے ساتھ مروّج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کلمۂ مبارکہ کو ان الفاظ کے ساتھ سن کر نہ تو صحابۂ کرام کو کوئی تعجب ہوا اور نہ حضورؐ کو۔ اور اگر آپ ذرا گہرائی میں اتر کر سوچیں تو یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ نے اس بچے کو یہ موقعہ فراہم ہی اسلئے کیا تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کلمۂ علیؑ ولی اللہ حضورؐ کی طرف سے نہیں بلکہ منجانب اللہ ہے اسی لئے بچے کی زبان پر جاری ہے اور یہ کہ شہادتِ علیؑ ولی اللہ فطرت کے عین مطابق ہے''۔(اقتباس ختم ہوا)

۲۔مودۃ القربیٰ (اردو) میں عتبہ بن عامر جہنی سے مروی ہے کہ ہم نے اس قول پر حضورؐ سے بیعت کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ وحدہ لاشریک ہے اور حضورؐ اسکے رسول ہیں اور علیؑ آنحضرتؐ کے وصی ہیں۔پس ان شرطوں میں سے کسی ایک کو اگر ہم ترک کر دیں تو کافر ہو جائیں گے''۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ زمانۂ رسولؐ میں کلمۂ علیؑ ولی اللہ جاری ہو چکا تھا اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے تھے۔اس کلمے کو اگر غائب کیا ہے تو بنی امیہ نے اور اگر آج کے دور میں کوئی اس کلمے کو مٹانے کے درپے ہے تو وہ اس دور کے علماءِ سوء ہیں۔اب ہم ایک جائزہ لیتے ہیں کہ دیگر معصومینؑ کونسا کلمہ پڑھتے تھے۔

حضرت امیر المومنینؑ کا کلمہ

شہادتِ ولایتِ علیؑ صفحہ ۱۴۲ پر بحوالہ حدیقۃ الشیعہ صفحہ ۳۷۵ یہ عبارت درج ہے:۔

''امیر المومنینؑ جب کعبے میں متولّد ہوئے تو بی بی فاطمہؑ بنتِ اسد فرماتی ہیں کہ میں دیکھا کہ حضرت علیؑ پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ ریز ہوئے اور نہایت فصاحت و بلاغت سے فرمایا۔

'' اشهد ان لاالٰه الاالله وحده لاشريك له و اشهد ان محمداً عبد ه و رسوله و اشهد انّي ولي الله و وصي رسول الله ''۔

سیدہ کونین حضرت فاطمۃ الزہراؑ کا کلمہ

بحارالانوار (اردو) جلد ۳ صفحہ ۹ تا ۱۰ پر درج ہے کہ جناب سیدہؑ نے بعد ظہور یہ کلمہ پڑھا:۔

''اشهد ان لاالٰه الاالله و انّ ابي رسول الله سيد الانبياء و انّ بَعلي سيد الاوصياء و ولدي سادة الاسباط ''۔

میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے والدؐ اللہ کے رسول اور تمام انبیاء کے سردار ہیں اور یہ کہ میرے شوہر سردار اوصیاء ہیں اور میرے بیٹے سردار ہیں آئندہ نسل کے۔

یہی روایت منتہی الآمال ۔شجر طوبیٰ ۔مشارق الانوار اور روضۃ الواعظین میں بھی موجود ہے۔

امام حسنؑ کا کلمہ

اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ صفحہ ۴۲۷ پر تین کتابوں یعنی ریاض القدس ۔معالی السبطین اور دمعۃ الساکبہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ جب

امام حسنؑ کا آخری وقت آیا تو آپؑ نے یہ کلمات اپنی زبانِ مبارک پر جاری فرمائے:۔

"لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ علی" ولی اللہ"

امام حسینؑ کا کلمہ

مندرجہ بالا کتاب میں صفحہ ۴۲۷ پر ہی دمعۃ الساکبہ کے حوالے سے درج ہے کہ وقتِ ظہور امام مظلومؑ نے یہ کلمہ پڑھا:۔

" اشهد ان لاالہ الااللہ وحدہ لاشریك لہ و اشهد ان جدّی محمداً رسول اللہ و اشهد انّ ابی ولیّ الاولیاء و اشهد انّ امّی سیدۃ النساء اہل الجنۃ"

امام محمد باقرؑ کا کلمہ

مندرجہ بالا کتاب میں ہی صفحہ ۴۲۸ پر بحوالہ دمعۃ الساکبہ بیان کیا گیا ہے کہ وقتِ ظہور امام محمد باقرؑ نے یہ کلمہ پڑھا:۔

" اشهد ان لاالہ الااللہ وحدہ لاشریك لہ و اشهد ان جدّی محمداً رسول اللہ و اشهد انّ امیر المومنین ولی اللہ"

حضرت صاحب الزمانؑ کا کلمہ

بحارالانوار (اردو) جلد ۱۱ صفحہ ۵۸ پر بیان کیا گیا ہے کہ وقتِ ظہور ہمارے زمانے کے امامؑ نے اسطرح کلمہ پڑھا:۔

" اشهد انّ لاالہ الااللہ وحدہ لاشریك لہ و اشهد انّ محمداً رسول اللہ و انّ علیاً امیر المومنین ولی اللہ"

ہم نے اختصار سے کام لیا ہے ورنہ جو بھی معصومؑ اس دنیا میں آیا ہے اس نے آتے ہی تین شہادتیں دی ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ لوگ کم از کم اپنے

امام زمانہؑ سے تو انحراف نہ کریں کیونکہ انہی کے ساتھ سب کو محشور ہونا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جب امائم نے یہ شہادات ادا کیں تو اللہ نے کیا فرمایا؟۔ اسی بحارالانوار کے صفحہ ۵۹ پر اللہ کا یہ جواب بھی درج ہے۔ ''میں نے قسم کھائی ہے کہ تیرے ذریعے سے لوگوں کا مواخذہ کرونگا۔ تیرے ہی ذریعے سے لوگوں کو عطا کرونگا۔ تیرے ذریعے سے ہی لوگوں کو بخشوں گا اور تیرے ہی ذریعے سے لوگوں پر عذاب کرونگا''۔

آپ اتنا سوچئے کہ اگر پہلے ہی مرحلے میں پتہ چلا کہ اس بندے کے امام کا کلمہ کچھ اور ہے اور اسکا اپنا کلمہ کچھ اور تو کیا پہلے ہی مرحلے میں پتہ صاف نہیں ہو جائے گا؟۔

اذان اور شہادت ثالثہ

اذان کے بارے میں ہمیں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ''حقائق الصلوۃ'' کے ذیل میں اسکی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک اذان نقل کریں گے۔ اسکی اذان جسکے غم نے ہمارے سینوں کو زخم زخم کر رکھا ہے۔ جسکی خدمت میں ہم اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ کیا دنیا بھر میں ایک بھی شیعہ ایسا ہے جو حسینؑ سے بے تعلقی کا اظہار کر سکتا ہو؟۔ آیئے اسی حسینؑ کی اذان سنتے ہیں۔

''جب جناب سید الساجدینؑ رہا ہو کر کربلا پہنچے تو وہاں ایک شخص کو مجاور پایا جو کہ لشکر یزید سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں گیارہ محرم کو کسی کام کے لئے کربلا میں ٹھہر گیا۔ جب شام ہوئی تو مقتل سے ایک سر بریدہ گردن سے اذان بلند ہوئی جو گواہی دے رہا تھا۔ اشهد انّ علياً امير المومنين ولى الله۔ جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ لاشہ

حسینؑ ابن علیؑ کا تھا۔وہ سپاہی کہتا ہے کہ میں حیران ہوا کہ یہی گواہی ختم کرنے کیلئے تو کربلا میں یہ جنگ معرضِ وجود میں آئی تھی''۔(اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ صفحہ۴۹۳ بحوالہ بحرالمصائب)۔

میں اس مرحلے پر آپ سے کچھ نہیں کہوں گا لیکن اتنا یقین ضرور رکھتا ہوں کہ جو شخص بھی حسینؑ مظلوم کا عزادار ہے وہ اپنے اس مظلوم امامؑ کی صدائے ولایت کو کبھی نہیں بھول سکتا کیونکہ یہی ولایت کربلا کی بنیاد تھی لہٰذا جو شخص اس شہادت سے گریزاں ہے وہ یقیناً حسینؑ کے ساتھ بھی دھوکا اور فریب کر رہا ہے۔

بات یہ ہے کہ اس سارے فساد کی جڑ شیخ صدوق کا ایک قول ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ اذان کی ۱۸ فصول ہیں یعنی اس میں علی''ولی اللہ شامل نہیں ہے۔اسی کو بنیاد بنا کر اپنی علمیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہم شریعت میں دخل نہیں دے سکتے۔شیخ صدوق نے بعد میں ایک اور کتاب لکھی جسکا نام ''الھدایہ'' تھا۔اس میں انھوں نے امام جعفر صادقؑ سے روایت بیان کی کہ اذان کی ۲۰ فصول ہیں یعنی اس میں دو مرتبہ علی''ولی اللہ کہنا شامل ہے۔اب میں اپنے پڑھنے والوں سے انصاف کا طالب ہوں۔اگر کنویں کا مینڈک ہی بننا ہے تب بھی اذان میں علی''ولی اللہ کا انکار کرنے کیلئے شیخ صدوق کا کاندھا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔جب انکے دو اقوال ہیں۔ایک سے اس کلمے کا اثبات ہوتا ہے اور دوسرے سے نفی تو اب کون کس قول کو اختیار کرتا ہے یہ اسکے اپنے رجحانِ طبعی پر منحصر ہے اور جو شخص بھی ان دو اقوال میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا وہ خود اپنے شجرۂ نسب کا اعلان کریگا۔

نماز اور شہادت ثالثہ

اب ہم اس مسئلے کیطرف آتے ہیں جو منافقین کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ علیؑ نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے کہ ان لوگوں

نے اپنی تمام توپوں کا رخ کلمۂ علی ''ولی اللہ کی طرف موڑ دیا ہے۔ہم نے جن علامہ صاحب کے ذکرِ خیر سے ابتدا کی تھی انہی کے چند اقوالِ زرّیں سے ہم گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ یوں تو آنجناب کے دہن مبارک سے بہت سے پھول بکھرے لیکن ہم صرف چند پھول چن کر آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔آپ نے فرمایا:۔

ا۔''علی''ولی اللہ کا جو پرچار کیا جارہا ہے وہ امریکہ کرارہا ہے''۔

اس خرافات کا جتنا جواب ضروری تھا وہ میں دے چکا ہوں۔باقی میں آپکی صوابدید اور آپکے جذبۂ ایمانی پر چھوڑتا ہوں۔حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا۔''ظالم وہ ہے جو میری ولایت کو جھٹلائے اور میرے حق کو چھپائے''۔ یہ کام تو آپ نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے اور ساری نیکیاں امریکہ کے نامۂ اعمال میں ڈال رہے رہیں۔پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ امریکہ کے دشمن ہیں یا ہمدرد۔

۲۔''علی''ولی اللہ پڑھنے کا حکم نہ قرآن نے دیا ہے نہ معصومینؑ نے۔نہ یہ کتب اربعہ میں موجود ہے''۔

علامہ صاحب کی یہ غلط فہمی انشاءاللہ جلد دور کردی جائے گی لیکن کتب اربعہ کی قید لگانا بہت معنی خیز ہے۔یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اغیار جب لاجواب ہوجاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صحیح بخاری میں دکھاؤ لیکن علامہ صاحب متفکر نہ ہوں۔انشاءاللہ انکی یہ خواہش بھی پوری کردی جائے گی۔

۳۔''علی''ولی اللہ نماز میں شیعوں نے کبھی نہیں پڑھا نہ کبھی ائمۂ معصومینؑ نے پڑھا''۔

اسکے جواب میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ قبلہ اگر آپ شیعہ ہوتے تب ہی آپکو پتہ ہوتا کہ شیعوں نے پڑھا ہے یا نہیں اور اگر ائمۂ معصومینؑ سے آپکا معمولی سا بھی تعلق ہوتا تب ہی آپکو معلوم ہوتا کہ انھوں نے پڑھا ہے یا نہیں۔ہاں جن سے آپکا تعلق ہے انکے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ

انھوں نے واقعی کبھی نہیں پڑھا۔اس بے خبری کی بھی انشا ءاللہ جلد ہی خبر لی جائے گی۔

۴۔ ''علی'' ولی اللہ کی بات کرنا دراصل لوگوں کو مراجع سے بدظن کرنا۔فتنہ برپا کرنا۔مرجعیت کو ختم کرنا اور مرکز کو کمزور کرنا ہے''۔

ہر مومن کا یہی جواب ہوگا کہ جو شے بھی ولایتِ علیؑ کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہو یا روڑے اٹکاتی ہو اسکا قلع قمع کرنا ہر صاحبِ ایمان پر واجبِ عینی ہے اس لئے کہ کلِ ایمان علیؑ ہے نہ کہ مرجعیت اور ہمارا مرکز امامؑ ہے نہ کہ مرجع۔علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دائرے کا مرکز صرف ایک ہی ہوتا ہے اسلئے انھیں حضرت صاحب الزمانؑ اور مرجعیت میں سے کسی ایک کا انتخاب بہر طور کرنا پڑے گا کیونکہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار نہیں ہوا جا سکتا۔جہاں تک فتنہ برپا کرنے کا تعلق ہے تو اگر ولایتِ علیؑ علامہ صاحب کے نزدیک (معاذ اللہ) فتنہ ہے تو بصد معذرت عرض ہے کہ یہ فتنہ خود خلاقِ عالم نے برپا کیا ہے کہ کائنات کو اس وقت تک خلق ہی نہیں کیا جب تک ولایتِ علیؑ کا اقرار نہ لے لیا۔علامہ صاحب کو چاہئے کہ خود اللہ کے خلاف محاذ کھولیں۔ہم غریبوں نے کیا قصور کیا ہے؟۔

۵۔ ''پہلے بعض مراجع نے اسکی اجازت دے دی تھی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے شیعوں میں تفرقہ پڑ رہا ہے تو انھوں نے سختی سے منع کر دیا''۔

اسکا مطلب یہ ہوا کہ علامہ صاحب کے نزدیک کلمہ ''علی'' ولی اللہ باعثِ تفرقہ ہے؟۔اگر وہ واقعی ایسا سمجھتے ہیں تو انھیں قرآن کا باغی سمجھا جائے گا۔قرآن میں اللہ نے تمام مسلمانوں کو اتحاد کا حکم دیا ہے لیکن یہ بھی بتا دیا ہے کہ اتحاد کس چیز پر کرنا ہے اور وہ ہے ''اللہ کی رسی'' جسکے لئے قرآن نے دو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ''حبل اللہ'' اور ''عروۃ الوثقی'' اور تفاسیر اہل بیتؑ کے مطابق ان دونوں سے مراد ولایتِ علیؑ ہے۔یعنی قرآن تو کہہ رہا ہے کہ ولایتِ علیؑ

مرکزِ اتحاد ہے اور علامہ صاحب فرمارہے ہیں کہ ولایتِ علیؑ (معاذ اللہ) باعث تفرقہ ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ تفرقہ وہ لوگ پھیلا رہے ہیں جو مخالفتِ شہادتِ ولایت میں مشغول ہیں۔

۲۔ اسکے بعد علامہ صاحب نے بہت فخریہ طور پر اور ہنس ہنس کر ایک واقعہ بھی سنایا ہے۔ آپ بھی وہ واقعہ سن لیں تا کہ آپکو معلوم ہو سکے کہ ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہے اور ان کا اسلام کونسا اسلام ہے جو لوگوں کو تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں۔ "چکوال میں ایک مولوی صاحب نے مجلس کے دوران یہ پڑھا کہ نماز میں علیؑ" ولی اللہ پڑھنا ضروری ہے تو کچھ لوگ انہیں کھانا کھلانے کے بہانے لے گئے اور مدرسے میں لے جا کر انکی خوب ٹھکائی کی اور ان سے "تفتیش" کی کہ انھوں نے منبر پر بیٹھ کر یہ بات کیوں کہی؟۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کام میں میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ کچھ اور لوگ بھی میرے ساتھ ہیں اور ہم سب کی پشت پر ایک فوجی جرنیل ہے جو ہم سے یہ کام کرا رہا ہے"۔

علیؑ سے دشمنی کی بھی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوگی مگر علامہ صاحب تو ساری حدیں پھلانگ گئے۔ پاکستان آرمی کو بھی اس بات کا نوٹس لینا چاہئے۔

بنیادی بات

شہادتِ ثالثہ کی مخالفت میں کوئی ایسا حربہ نہیں جسے یہ لوگ استعمال نہ کرتے ہوں۔ کچھ نہیں تو اسے ایک جذباتی مسئلہ بنا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ تمھارے آباء واجداد بھی تو نماز میں علیؑ" ولی اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ تو کیا وہ سب بھی جہنمی ہیں؟۔ اور اسطرح لوگوں کی آبائی عصبیت کو ہوا دیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عمل چاہے کوئی بھی ہو لیکن انسان بقدرِ علم اسکا مکلّف ہوتا ہے۔ اگر کسی کو نماز میں شہادتِ ثالثہ کا علم نہیں اور وہ نہیں پڑھتا تو ایسا شخص عنداللہ معذور ہے اور

اسکو ہرگز ملامت نہیں کی جا سکتی اور انشاء اللہ وہ مومنین کے ساتھ ہی محشور ہوگا۔ باز پرس اسی سے ہوگی جو علم ہو جانے کے بعد بھی نہ پڑھے اور ایسے شخص کا شمار یقیناً منافقین میں ہوگا۔

اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو اکثر مومنین شہادتِ ولایت پر مکمل ایمان رکھنے کے باوجود محض اس لئے تذبذب کا شکار رہتے ہیں کہ انھوں نے اس بارے میں کبھی کسی سے سنا نہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چودہ صدیاں گذر گئیں لیکن ہم نے کسی عالم کی زبانی یہ بات نہیں سنی (حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ بہت سے علماء نے اس پر بات بھی کی ہے اور کتابیں بھی لکھی ہیں)۔ اگر یہ چیز اتنی ہی ضروری ہوتی تو ائمہ معصومینؑ اس بارے میں بھی کھل کر بات کرتے جیسا کہ انھوں نے دیگر معاملات پر گفتگو کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس غلط فہمی کا تدارک ہو جائے تا کہ مومنین کے دل اس بارے میں مطمئن ہو سکیں۔

اگر ہمارے یہاں مطالعہ کا ذوق عام ہوتا اور لوگ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تو یہ غلط فہمی سرے سے پیدا ہی نہ ہوتی۔ اگر بنظرِ غائر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ بعدِ رسول تمام حکومتوں کا ہدف یہی کلمۂ علیؑ "ولی اللہ رہا ہے۔ اسی سے انھیں دشمنی تھی اور اسی کو مٹانے کے وہ درپے رہے۔ بنی امیہ کے دور میں یہ مہم اپنے عروج پر تھی۔ خود جناب امیر المومنینؑ نے اس زمانے کے حالات کا نقشہ بیان فرمایا ہے کہ کسطرح فضائلِ علیؑ کو مٹانے اور دوسروں کے فضائل گھڑنے کیلئے جگہ جگہ وضعی احادیث کی فیکٹریاں قائم کر دی گئی تھیں۔ ان جعلی احادیث کو تمام مساجد و مدارس یہاں تک کہ گھر گھر پھیلا دیا گیا تھا اور گھر کی بچیوں تک کو یہ خرافات پڑھائی جاتی تھیں یہاں تک کہ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے۔ پھر بھلا ذکرِ علیؑ کس کو یاد رہا ہوگا۔ اسکے باوجود کتابوں میں فضائلِ امیر المومنینؑ کا باقی رہ جانا یقیناً ایک معجزہ ہی کہلائے گا۔ کلمۂ رسالتؐ پر کبھی اختلاف نہیں رہا لیکن آپکو حیرت ہوگی کہ ایک بادشاہ ایسا بھی تھا جسے یہ

شہادت بھی گراں گذرتی تھی۔ چنانچہ کتاب مروج الذہب (تاریخ مسعودی) جلد سوئم صفحہ ۵۳۴ پر ایک واقعہ درج ہے۔ مغیرہ بن شعبہ نے ایک بار معاویہ سے بنی ہاشم کے ساتھ اچھے سلوک کی سفارش کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اب آپ معاویہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:۔

''بنو تیم کا ایک آدمی (خلیفہ اول) بادشاہ بنا تو اس نے عدل وانصاف کیا اور جو کچھ کرنا تھا کیا۔ خدا کی قسم اسکے مرنے کے ساتھ ہی اسکا ذکر بھی ختم ہو گیا۔ پھر بنو عدی کا ایک آدمی (خلیفہ دوئم) بادشاہ بنا اور دس سال تک اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ حکومت کی مگر اسکے مرنے کے ساتھ ہی اسکا ذکر بھی ختم ہو گیا۔ پھر ہمارا بھائی (خلیفہ سوئم) بادشاہ بنا۔ اس نے جو کام کرنے تھے کیئے اور اسکے مرنے کے ساتھ ہی اسکا ذکر ختم ہو گیا۔ مگر ایک ہاشمی (یعنی رسولؐ اللہ) سے دن میں پانچ بار اشھد انّ محمداً رسولؐ اللہ کہکر مدد مانگی جاتی ہے۔ اس بات کے ساتھ کونسا عمل باقی رہ جاتا ہے؟۔ خدا کی قسم کیا ہم نے اسے دفن نہیں کیا تھا؟۔''

آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس شخص کو کلمۂ محمدؐ الرسول اللہ تک گوارا نہیں وہ کلمۂ علیؑ ''ولی اللہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا اور اس کلمے کو مٹانے کیلئے اس نے کیا کیا کوششیں نہ کی ہونگی؟۔ اس زمانے میں حضرت علیؑ اور اہلبیتؑ رسولؐ کی کردارکشی اپنے زوروں پر تھی جسکا اندازہ اسی مروج الذہب حصہ سوئم کے صفحہ ۵۷ اور ۵۸ پر درج عبارات سے ہو جائے گا۔ صفحہ ۵۷ پر لکھا ہے۔ ''شامیوں کے ایک سردار اور دانشور سے پوچھا گیا کہ ابوتراب کون ہیں؟ کیا وہ ہے جس پر امام منبر پر لعنت کرتا ہے؟۔ اس نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں وہ (معاذ اللہ) فتنہ پیدا کرنے والے چوروں میں سے ایک چور ہے''۔ صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے۔ ''ہمارے ایک اہلِ علم بھائی نے بتایا کہ ہم فلاں۔ فلاں۔ حضرت علیؑ اور معاویہ کے متعلق بیٹھ کر مناظرہ کیا کرتے تھے اور اہلِ علم نے جو کچھ بیان کیا ہے اسکا بھی ذکر کرتے تھے اور عوام آ کر ہماری باتوں کو سنا کرتے تھے۔ ایک دن ان

میں سے ایک آدمی نے جوان میں بڑا عقلمند اور بڑی داڑھی والا تھا مجھے کہا۔ ''تم علیؑ۔ معاویہ اور رفلاں فلاں کے متعلق کب تک باتیں کرتے رہو گے؟''۔ میں نے کہا ''علیؑ کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟''۔ اس نے کہا ''کیا وہ فاطمہؑ کا باپ نہیں؟''۔ میں نے کہا ''فاطمہؑ کون تھی؟''۔ اس نے کہا ''حضرت نبی کریمؐ کی بیوی۔ عائشہ کی بیٹی اور معاویہ کی بہن''۔ میں نے کہا ''علیؑ کا کیا قصہ ہے؟''۔ اس نے کہا ''وہ جنگِ حنین میں حضرت نبی کریمؐ کے ساتھ مارا گیا تھا''۔

یہ واقعہ مضحکہ خیز سہی لیکن اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگوں کے اذہان کی تربیت کس نہج پر کی جا رہی تھی۔ کیا ان حالات میں شہادتِ ولایت کا ذکر کیا جا سکتا تھا؟۔

معاویہ نے عام اعلان کر دیا تھا کہ میں علیؑ کے شیعوں سے بری الذمہ ہوں۔ چنانچہ جس شخص پر یہ شبہ بھی ہو جاتا کہ اسکا علیؑ سے کوئی معمولی سا بھی تعلق ہے تو اسکا مال و اسباب لوٹ لیا جاتا۔ اسکے گھر کو گرا دیا جاتا اور قتل کرنا تو معمول کی بات تھی۔ ایسے پرآشوب دور میں ائمہ طاہرینؑ کیونکر اعلانِ ولایت کر کے اپنے شیعوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتے؟۔ بنی عباس کا زمانہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے بعد حالات اسقدر ہولناک تھے کہ امام موسیٰ کاظمؑ دعوائے امامت تک نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں کیا یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کلمہ و اذان و اقامت و نماز میں شہادتِ ولایتِ علیؑ کا کھلم کھلا اعلان فرماتے؟۔ یہی وجہ ہے کہ فروع کافی باب تشہد میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''اگر ہم تشہد کا تعین کر دیتے تو ہمارے شیعہ ہلاک ہو جاتے''۔ اسکے باوجود انھوں نے اپنے خاص اور معتمد لوگوں سے یہ باتیں بیان کر دیں اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ باتیں صرف ان لوگوں کو بتائیں جو ان باتوں کے اہل ہوں۔ یہ انتظامِ قدرت ہے کہ یہ تمام احکام کتابوں میں محفوظ ہیں اور ہماری دسترس میں ہیں جن پر قرآنِ مجید نے سورۃ المعارج اور سورۃ فاطر

میں مہر تصدیق ثبت کردی ہے تا کہ جب رسول اللہ کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق ان احادیث کو قرآن پر رکھ کر جانچا جائے تو کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔ اسکے باوجود یہ اصرار کرنا کہ چونکہ ماضی میں یہ بات مشہور نہیں تھی اسلئے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا یقیناً دل کی کجی اور بدفطرتی کی دلیل ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث آپ پڑھ چکے اور باقی احادیث آپ اب پڑھیں گے جن سے انشاء اللہ آپکے دل کو تقویت۔ اطمینان اور یقین کامل حاصل ہوگا اور مجھے امید واثق ہے کہ آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے آقاؤں کے احکام پر عمل شروع کردیں گے۔ رہے وہ جنکا مشن ہی علیؑ ولی اللہ کو مٹانا ہے تو ناکامی انکا مقدر ہے کیونکہ اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا چاہے مجرم کراہت ہی کیوں نہ کریں۔

آخر کیوں؟

اس موضوع پر گفتگو کو آگے بڑھانے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر وہ کیا عذر ہے جسکی آڑ لیکر نماز میں شہادتِ ثالثہ کے خلاف ایک پورا محاذ کھول دیا گیا ہے۔ آپ بھی اس عذر کو جان اور سمجھ لیں تا کہ کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ فقہاء کے نزدیک نماز میں سوائے قرآن۔ ذکر اور دعا کے کسی اور چیز کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ گویا فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) حضرت امیر المومنینؑ کا تعلق نہ قرآن سے ہے نہ ذکر سے اور نہ ہی دورانِ دعا انؑ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس معصومیت کی داد کون دے سکتا ہے اور اگر وہ اتنے ہی بھولے ہیں تو پھر انھیں اپنی بساطِ علمی کو لپیٹ لینا چاہئے۔ آپ میری بات کا یقین نہ کیجئے بلکہ عملاً اس بات کو آزمایئے۔ اگر آپ شیعوں کے کسی بچے سے بھی پوچھیں گے تو وہ فوراً جواب دے گا کہ علیؑ قرآنِ ناطق ہے۔ میرے پاس اتنا فاضل وقت نہیں ہے کہ میں اس لایعنی بحث میں خود کو الجھالوں اور صفحے کے صفحے سیاہ کر کے رکھ دوں۔

مسلّمات کا انکار کرنے والا اس بات کا حقدار نہیں ہوتا کہ اسکو جواب دینے میں اپنا وقت برباد کیا جائے۔ ہاں اگر کوئی ایک بھی شیعہ۔ چاہے وہ کتنا ہی ضعیف العقیدہ کیوں نہ ہو۔ کھڑا ہو کر یہ کہدے کہ علیؑ قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کتاب سے لیکر عدالت تک میں اسکا تعاقب کرنے کو تیار ہوں۔

اب رہی بات ذکر کی تو یہ بھی تجاہلِ عارفانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں یہ تسلیم کر ہی نہیں سکتا کہ فقہاء کو یہ بات معلوم نہیں کہ ذکر خود جناب امیر المومنینؑ ہیں اور اگر واقعی انھیں معلوم نہیں تو پھر انھیں فتوے دینے کا اختیار کس نے دیا ہے؟۔ ہم خود قرآن سے ہی پوچھیں گے کہ ''ذکراللہ'' کون ہے؟۔

۱۔ طٰہٰ ۱۲۴۔ ''اور جو کوئی میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو یقیناً اسکی زندگی تنگی میں بسر ہوگی اور وہ قیامت کے دن اندھا محشور کیا جائے گا''۔

تفسیر صافی میں اصولِ کافی کے حوالے سے اللہ کے اس قول کی تفسیر میں معصومؑ سے منقول ہے کہ۔ ''ذکری (میرا ذکر) سے مراد ولایتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے''۔

۲۔ یٰسین ۱۱۔ ''ماسوا اسکے نہیں کہ تو اسے ڈرا سکتا ہے جس نے ذکر کی پیروی کی اور رحمٰن سے غائبانہ ڈرا پس اسے بخشش اور باعزت بدلے کی خوشخبری دے''۔

تفسیرِ صافی میں اصولِ کافی کے حوالے سے معصومؑ سے منقول ہے کہ اس آیت میں ذکر سے مراد جناب امیر المومنینؑ ہیں۔

۳۔ عنکبوت ۴۵۔ ''یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور ضرور اللہ تعالیٰ کا ذکر اکبر (سب سے بڑا) ہے''۔

معصومؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ''نحن ذکر اللہ و نحن اکبر''۔ ''ہم ہی اللہ کا ذکر ہیں اور ہم ہی اکبر ہیں'' (شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ ۱۸۰ بحوالہ مراۃ الانوار۔ تفسیر برہان۔ کفایت الموحدین)

۴۔ جمعہ ۹۔ ''اے وہ لوگوں جو ایمان لا چکے ہو جب جمعے کے دن نماز کیلئے ندا دی جائے تو تم **اللہ تعالیٰ کے ذکر** کی طرف دوڑ پڑو......الخ''۔

شیخ مفید اپنی کتاب ''الاختصاص'' میں امام محمد باقرؑ کی زبانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ ''ذکر اللہ امیر المومنینؑ ہیں''۔(شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ ۱۸۰)۔

۵۔ جن ۱۷۔ ''جو شخص اپنے **رب کے ذکر** سے منہ پھیرے گا اسے سنگین ترین عذاب بھگتنا پڑے گا''۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ اس آیت میں ''ذکرِ رب'' سے مراد ولایت علی ابن ابی طالبؑ ہے۔(اکمال الدین بولایت امیر المومنینؑ صفحہ ۳۴۲)۔

قرآن کی ان واضح گواہیوں کے بعد اس غبارے سے ہوا نکل جانی چاہئے جو علیؑ کو ذکرِ خدا سے خارج سمجھتا ہے۔

اب باقی رہ گئی دعا کی بات تو نماز کے دوران روٹی کپڑے اور مکان کی دعا تو مانگی نہیں جاتی۔ اگر واجب ارکانِ نماز میں ہم کوئی دعا مانگتے ہیں تو وہ ہے۔ '' اھدنا الصراط المستقیم ''۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ''صراطِ مستقیم'' سے مراد حضرت امیر المومنینؑ ہیں تو پھر تو منکرینِ شہادتِ ولایت کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جانی چاہئے۔

۱۔ مومنون ۷۳۔ ''اور یقیناً تم انھیں صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے ہو''۔

تفسیر صافی پر بحوالہ تفسیر قمی لکھا ہے کہ **صراطِ مستقیم سے مراد ولایت جناب امیر المومنینؑ ہے**۔

۲۔ زخرف ۴۳۔ ''پھر جو کچھ تیری طرف وحی کیا گیا ہے تو اس سے تمسک رکھ یقیناً تو صراطِ مستقیم پر ہے''۔

اسکی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''**صراطِ مستقیم علیؑ ہیں**''۔(اصول کافی

۔کتابِ حجت۔باب ۱۰۷۔حدیث ۲۴)۔
۳۔انعام ۱۵۳۔"اور یقیناً یہی میرا صراطِ مستقیم ہے۔پس اسکی پیروی کرو اور تم مختلف سبیلوں کی پیروی مت کرو کہ وہ تمھیں اس سبیل سے ہٹا دیں گے"۔
امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔"علیؑ اور انکے اوصیاءؑ کی ولایت اللہ کی صراطِ مستقیم ہے"۔
۴۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"صراطِ مستقیم علیؑ ہیں"۔(اصولِ کافی۔کتاب حجت۔باب ۱۰۷۔حدیث ۹۱)
۵۔رسول اللہؐ نے فرمایا۔"صراط سے مراد ولایت علیؑ وائمہؑ ہے"۔(ینابیع المودۃ صفحہ ۱۸۴)۔

ہم نے اس عذر کا قلع قمع کردیا جسکی آڑلیکر یہ لوگ مومنین کو بہکاتے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ جس نبیؐ کی امت ہونے کا یہ لوگ دعوی کرتے ہیں وہ تو زندگی بھر اپنی نمازوں میں شہادتِ ولایت علیؑ ادا کرتا رہا۔لیکن یہ لوگ حقیقتاً کس کی امت ہیں اس بات کو یہ خود ہی بہتر جانتے ہونگے کیونکہ اگر یہ امت محمدؐ میں داخل ہوتے تو کبھی اپنے نبیؐ کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہ کرتے۔تفسیر برہان اور مراءۃ الانوار میں امام موسیٰ کاظمؑ کا یہ فرمان موجود ہے۔"اللہ تعالی نے ان لوگوں کا نام منافق رکھا ہے جو علیؑ کی ولایت کے بارے میں آنحضرتؐ کی پیروی نہیں کرتے۔جو انکی امامت کا منکر ہے وہ خود آنحضرتؐ کا منکر ہے اور انہی کے بارے میں سورۂ منافقین نازل ہوئی"۔(اکمال الدین بولایت امیر المومنینؑ صفحہ ۵۲۰)۔

بات صرف اتنی ہے کہ واقعۂ غدیر خم نے مسلمانوں کو دو واضح کیمپوں میں تقسیم کردیا ہے۔ایک کیمپ جناب سلمانؓ و ابوذرؓ کا ہے اور دوسرا کیمپ حارث بن نعمان فہری کا۔اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس کیمپ میں چاہے چلا جائے۔ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے لیکن مذہب شیعہ کو مسخ کرنے اور مومنین

کو گمراہ کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی اور آپ انشاءاللہ ہمیں اپنے آخری سانس تک اس محاذ پر ڈٹا ہوا پائیں گے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اللہ اور معصومینؑ نے کبھی یہ کہا ہے کہ سوائے مجتہدین کے باقی تمام لوگوں کیلئے قرآن پر تدبر کرنا حرام ہے؟۔جبکہ قرآن نے تو جگہ جگہ تمام عالمِ انسانیت کو انتہائی تاکید کے ساتھ قرآن پر تدبر کرنے کا حکم دیا ہے۔یہ یاد رکھئے کہ عربی زبان کا ماہر ہو جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان قرآن کو بھی سمجھ لے گا۔فخر الدین رازی اور جلال الدین سیوطی سے زیادہ عربی یہ لوگ نہیں جان سکتے۔کیا انھوں نے قرآن کو سمجھ لیا تھا؟۔اگر سمجھ لیتے تو مومن نہ ہو جاتے؟۔اور پھر جن لوگوں کے سامنے قرآن نازل ہو رہا تھا انکی تو مادری زبان ہی عربی تھی۔ان میں سے کتنوں نے قرآن کو سمجھا؟۔بات صرف اتنی ہے کہ اگرچہ بظاہر قرآن عربی میں نازل ہوا لیکن درحقیقت <u>اسکی زبان ایک Language of sense</u> <u>ہے اور اسی Sense کا نام ایمان ہے</u>۔اسی لئے قرآن کا مزاج یہ ہے کہ جب مومن اسے کھولتا ہے تو چاہے وہ ترجمہ ہی کیوں نہ پڑھ رہا ہو لیکن اسکے سامنے قرآن اپنے معنی کھول کر رکھ دیتا ہے اور وہ قرآن کے ان دقیق مطالب تک پہنچ جاتا ہے جن تک بڑے بڑے علماء کی بھی رسائی نہیں ہو پاتی۔اسکے برخلاف جب منافق قرآن کو کھولتا ہے تو قرآن اپنے مطالب کو اس سے چھپا لیتا ہے چاہے وہ عربی زبان کو گھول کر ہی کیوں نہ پی گیا ہو۔اب اگر قرآن کوئی حکم دیتا ہے اور احادیث معصومینؑ اسکی تائید کرتی ہیں تو کیا اس حکم کو یہ کہکر مسترد کیا جا سکتا ہے کہ اسکی تصدیق مجتہدین نے نہیں کی؟۔کیا احکامِ قرآن و معصومینؑ پر عمل کرنے کیلئے بھی مجتہدین کی اجازت لینا ضروری ہے؟۔اگر نہیں تو پھر اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تشہد نماز میں شہادتِ ولایت علیؑ دینا حکمِ قرآن بھی ہے۔حکمِ معصومینؑ بھی ہے اور عملِ معصومینؑ بھی اور اگر کوئی ان تمام چیزوں سے بے تعلق ہونا چاہتا ہے تب بھی اسکے لئے جائے فرار نہیں ہے کیونکہ اگر وہ دیوانہ

نہیں ہے اور عقل رکھتا ہے تو خود عقل تقاضا کرتی ہے کہ اگر نماز میں علیؑ کی ولایت کی شہادت نہ دی جائے تو نماز ایک بیکار محض شے ہے۔

ان تمام امور پر انشاءاللہ ہم گفتگو کریں گے تا کہ ابطال باطل کیا جا سکے۔

ایک اور عذر لنگ

اکثر لوگ اپنے تقاضائے ایمانی سے مجبور ہو کر جب ان دوست نما دشمنوں کے پاس یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے جاتے ہیں تو وہ انتہائی معصومیت سے انکو اسطرح بہلاتے ہیں کہ بھائی صرف ولایت علیؑ کی ہی شہادت کیوں؟ اور کیوں نہ تمام ائمہؑ کی ولایت کی شہادت دی جائے؟ ظاہر ہے کہ ہر آدمی اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔اس پر وہ کہتے ہیں کہ ہم تشہد میں درود اسی لئے بھیجتے ہیں کہ ان سب کی ولایت کی شہادت پوری ہو جائے۔یہ ضروری ہے کہ اس فریب کا بھی پردہ چاک کیا جائے۔

اول تو یہ جان لینا چاہئے کہ درود میں ہم محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح کرتے ہیں شہادت نہیں دیتے۔مدح اور شہادت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔دوئم یہ کہ اگر یہ درود کو ہی شہادت تسلیم کرانے پر مصر ہیں تو پھر درود میں تو خود جناب رسولؐ خدا بھی شامل ہیں اور اسطرح صرف شہادتِ توحید کافی ہے۔پھر اسکے بعد یہ لوگ شہادتِ رسالت کیوں دیتے ہیں؟۔اور اگر اس سے بھی بڑھکر سوچا جائے تو درود بھیجنے والوں میں خود اللہ بھی شامل ہے لہٰذا کیوں نہ آیۂ درود پر ہی اکتفا کر لیا جائے۔اسطرح ان لوگوں کی جان شہادتِ توحید سے بھی چھوٹ جائے گی۔علیؑ کی دشمنی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کے ہاتھ سے توحید و نبوت بھی جاتی رہتی ہے اسی لئے حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے کہ میری ولایت کے بغیر نہ توحید تمھارے کوئی کام آئے گی اور نہ نبوت۔

الغدیر

۱۸ ذی الحجہ کو دنیا بھر کے تمام شیعہ جشن کے طور پر مناتے ہیں ۔بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔خوب خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور اگر کوئی منع کرے تو نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے لیکن اس بات پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ غدیر ہے کیا۔کیا حرج ہے اگر اس پر تھوڑی سی نظر ڈال لی جائے ۔

نصف النہار کا وقت ہے ۔آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔گرمی ایسی ہے کہ لوگ بلبلا رہے ہیں ۔میدان ایسا ہے جہاں کوئی سایہ دار مقام موجود نہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے پڑے ہیں ۔ایسے عالم میں آیت آتی ہے۔ ''اے رسولؐ اسی وقت پہنچا دے اس شے کو جو تجھ پر نازل کی گئی ہے''۔اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے بڑھتی ہے۔ ''اور اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو تو نے اللہ کی رسالت کو ہی سر انجام نہ دیا''۔حضرت ختمی مرتبت تمام لوگوں کو وہیں ٹھہرا لیتے ہیں ۔پالانِ شتر کا منبر بنایا جاتا ہے ۔رسولؐ منبر پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور علیؑ کو ہاتھوں سے تھام کرا تنا بلند کرتے ہیں کہ سپیدیٔ بغل ظاہر ہو جاتی ہے ۔(علیؑ تو نام ہی بلند ترین مقام کا ہے ۔وہ تو بلند ہی ہوگا چاہے خانۂ کعبہ میں بت شکنی کا موقعہ ہو یا منبرِ غدیر ہو) ۔ولایت علیؑ کا اعلان کیا جاتا ہے ۔مبارک بادیاں دی جاتی ہیں ۔ایک بڑا خیمہ نصب کیا جاتا ہے ۔تاج پوشی مولائے کائنات منعقد ہوتی ہے ۔ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ افراد فرداً فرداً جناب امیر المومنینؑ کی بیعت کرتے ہیں ۔

رسولؐ اللہ ان تمام قبائل کو جو وہاں سے جدا جدا راستوں پر اپنے وطن جانے والے تھے جمع کرتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ وہ اپنے وطن پہنچ کر یہ پیغام عام کریں اور اس بارے میں تحریری دستاویزات لکھ کر ان کے سپرد کی جاتی ہیں ۔تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان تمام لوگوں تک یہ پیغام پہنچائیں جو وہاں موجود نہ تھے ۔جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے تو آیت نازل ہوتی ہے ۔ ''<u>آج کے دن</u> میں

نے تمھارے دین کو مکمل کیا (لفظ "تمھارے ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے کامل تھا لیکن لوگوں تک جو دین آج سے پہلے تک پہنچایا گیا تھا وہ نامکمل تھا) اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کیا اور (آج) تمھارے لئے دینِ اسلام سے راضی ہوا"۔ حضرت ابوذرؓ اذان دیتے ہیں جس میں علیؑ "ولی اللہ کہتے ہیں اور رسولؐ اللہ اسکی توثیق فرماتے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ اس دن کو روزِ عید قرار دیتے ہیں اور تاکیداً حکم دیتے ہیں کہ جب بھی کوئی خطیب منبر پر جائے تو غدیر کا ذکر ضرور کرے۔
کیا یہ تمام باتیں انسان کو سوچنے پر مجبور نہیں کرتیں؟۔

۱۔اعلانِ ولایت کیلئے یہ وقت اور یہ مقام کیوں منتخب کیا گیا؟۔اور ایسے حالات اور ایسی کیفیات کے دوران یہ اعلان کیوں کیا گیا جنکو کوئی فراموش نہ کر سکے؟۔اس سے بڑا مجمع رسولؐ اللہ کو خطبۂ حج کے وقت میسر تھا۔وہاں کیوں نہ اعلان ہوا؟۔

۲۔جس نبی کو اللہ اپنا محبوب کہتا ہو۔جسکے لئے یہ کہتا ہو کہ اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو خلق ہی نہ کرتا۔جس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی اللہ قسمیں کھاتا ہو۔وہ اگر چادر اوڑھ لے تو "چادر والا" کہکر قسم کھاتا ہو۔وہ اگر کملی اوڑھ لے تو "کملی والا" کہکر قسم کھاتا ہو۔وہ جس بستی میں رہتا ہو اس بستی کی قسم کھاتا ہو۔اپنے اس محبوب نبی کیلئے آج اللہ کے تیور کیوں بدلے ہوئے ہیں؟۔جس نبیؐ کے صدقے میں تمام انبیاءؑ کو نبوتیں ملی ہوں اسی نبی کی رسالت ختم کرنے کی دھمکی کیوں دی جارہی ہے؟۔کیا کوئی اپنے محبوب سے اسطرح بات کرتا ہے؟۔لگتا ہے کہ جس شے کے اعلان کا حکم دیا جارہا ہے اسکے بغیر رسولؐ رسول ہی نہیں رہتا۔

۳۔ ہر حاضر کو یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے کہ وہ یہ بات غائب تک پہنچائے؟۔

۴۔زبانی کہہ دینے کے بعد دستاویز لکھ کر دینے کی کیا ضرورت درپیش آگئی؟۔

۵۔آج سے پہلے دین میں کیا کمی تھی کہ اسے نامکمل کہا گیا؟۔

۶۔وہ کون سی نعمت تھی جسے تمام کیا گیا؟۔کیا اس روز مَن وسلویٰ نازل کیا گیا

تھا؟۔
۷۔کیا آج سے پہلے اللہ دینِ اسلام سے راضی نہیں تھا؟۔
۸۔اسے روزِ عید کیوں قرار دیا گیا؟۔
۹۔اس بات کی تاکید کیوں کی گئی کہ اس دن کا ذکر مسلسل کیا جائے؟۔اور اسکو بھول جانے سے ہمارا کیا نقصان ہوتا ہے؟۔
اگر آپ ان سوالات پر غور فرمائیں گے تو انشاءاللہ ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔البتہ جس نے غور و تدبر کرنا اپنے اوپر حرام کر رکھا ہو اور اپنی عقل کو دوسروں کی تحویل میں دے رکھا ہو اسکو تو اللہ بھی نہ سمجھا سکا۔ہم تو پھر بھی گنہگار بندے ہیں۔

تقاضائے عقل

اس سلسلے میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف چند باتیں آپکی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں ورنہ مندرجہ بالا سوالات کو پڑھکر آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف عقلی تقاضوں کے بارے میں ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔
۱۔نماز میں عام طور پر دو شہادتیں ادا کی جاتی ہیں۔شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت۔دو شہادتوں کو عربی میں ''**شہادتین**'' کہا جاتا ہے جبکہ تین یا اس سے زیادہ شہادتوں کو ''**شہادات**'' کہتے ہیں۔لفظ شہادتین پورے قرآن میں کسی ایک مقام پر بھی نہیں دکھایا جا سکتا جبکہ لفظ شہادات ہم قرآن میں دکھا سکتے ہیں اور وہ بھی نماز کے حوالے سے۔اسکے باوجود شہادات کی مخالفت کرنا اور شہادتین پر اصرار کرنا کیا ہٹ دھرمی اور قرآن سے ضد باندھنا نہیں ہے؟۔اور کیا یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں علیؑ کی دشمنی پروان چڑھ رہی ہے؟۔
۲۔شہادتِ ولایت علیؑ سے دین مکمل ہوا۔یہاں میں انتہائی معذرت کے ساتھ

عرض کرتا ہوں کہ دین میں تو خود توحید بھی شامل ہے۔ دین میں توعدل ونبوت و امامت وقیامت بھی شامل ہیں۔ گویا اللہ کی توحید سے لیکر قیامت تک یعنی مبداء سے لیکر معاد تک ہر شے نامکمل ہے بغیر ولایت علیؑ کے۔ اسی لئے جناب امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ ''میری ولایت کے بغیر نہ توحید تمھیں کوئی فائدہ پہنچائے گی نہ نبوت''۔ جس شے کے بغیر پورا دین ہی ادھورا ہو اسکے بارے میں جو شخص مباح ومستحب کی بحث میں مبتلا ہوگا اسکی علمیت پر تو بعد میں نظر کی جائے گی۔ پہلے تو اسکی صحتِ عقل کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہیں سے سمجھئے کہ آخر نماز بھی تو دین میں شامل ہے۔ بغیر شہادتِ ولایتِ علیؑ نماز کیسے مکمل ہو جائے گی؟۔ <u>جب شہادت ولایت کے بغیر رسولؐ کی رسالت نہ بچتی ہوتو اسکے بغیر کسی کی نماز کیسے بچ جائے گی؟</u>۔

۳۔ جب اعلانِ ولایت ہو چکا۔ اذان میں اشھد انّ علی ولی اللہ کہا جا چکا تو اب نماز کا مرحلہ آیا۔ جیسے ہی یہ مرحلہ شروع ہوا فوراً ایک شخص اٹھا (اس شخص کا نام لکھنا ہم مناسب نہیں سمجھتے) ۔ ناراض ہوا۔ ایک ہاتھ مغیرہ بن شعبہ اور دوسرا ہاتھ عبداللہ بن قیس اشعری کے کندھے پر رکھا اور بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔ فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔ ''لا صدّ ق ولا صلّیٰ و لکن کذّب......الخ''۔ (پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلاتا ہوا منہ موڑ کر اہل وعیال کیطرف چل دیا)۔

آدمی اگر تھوڑی سی بھی عقل استعمال کرے تو فوراً محسوس کر لے گا کہ یہ شخص مکۂ مکرمہ سے ایامِ حج میں رسولؐ اللہ کے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ غدیر سے پہلے کسی مقام پر بھی اس نے رسولؐ اللہ سے الگ نماز نہیں پڑھی تو پھر غدیر کے دن اس نے رسولؐ کے ہمراہ نماز کیوں نہیں پڑھی؟۔ اسکا نماز نہ پڑھنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ آج نماز میں اشھد انّ علیاً امیر المومنینؑ ولی اللہ پڑھا جانا تھا اور اس کلمے سے اسے دشمنی تھی اسی لئے نماز نہ پڑھی۔

۴۔تشہد نماز ہی کا ایک رکن ہے اور جس نماز کا یہ رکن ہے اسکے بارے میں شیخ مفید ''الاختصاص'' صفحہ۱۲۹مطبوعہ نجف اشرف میں اور دیگر علماء اپنی اپنی کتابوں میں امام محمد باقرؑ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:۔

''نماز امیر المومنینؑ ہیں۔یعنی صلٰوۃ سے مراد ولایت ہے اور یہی ولایتِ کبریٰ ہے''۔(شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ۱۸۱)۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ جو مجسم نماز اور حقیقتِ نماز ہو اسی کے ذکر کو نماز سے باہر رکھا جائے؟۔اور کیا اسکے ذکر کے بغیر نماز کا کوئی وجود ہوسکتا ہے؟۔

قرآن کا حکم

ا۔المعارج ۳۳ تا ۳۵۔''والذین ھم بشھٰدٰتھم قائمون ۝والذین ھم علیٰ صلاتھم یحافظون۝اولٰئک فی جنّٰتٍ مکرمون۝''

ترجمہ:۔''اور جو لوگ اپنی **شہادات** پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ایسے ہی لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہونگے''۔

ہر قیمتی چیز کی حفاظت کی جاتی ہے اور اگر حفاظت نہ کی جائے تو وہ چیز یقیناً برباد ہوجاتی ہے۔نماز سے زیادہ قیمتی چیز اور کیا ہوسکتی ہے۔اگر نماز کی حفاظت نہ کی جائے تو اسکے بھی برباد ہوجانے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔کون بیوقوف ہوگا جو نمازیں پڑھتا رہے لیکن اسکی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کرے۔ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ نماز کی حفاظت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ نماز میں ''شہادات'' یعنی تین شہادتیں ادا کی جائیں۔اسطرح انسان نہ صرف جنتی ہوجائے گا بلکہ اہلِ جنت پر واجب ہوگا کہ اسکا اکرام کریں۔پس بغیر شہادات کے جو نماز ہوگی وہ نہ تو محفوظ رہے گی اور نہ اپنے پڑھنے والے کو جنت میں لے جائے گی۔

۲۔ یونس ۹۴۔ ''اور اگر تو شک میں ہے جو کچھ ہم نے تیری طرف نازل کیا تو ان لوگوں سے پوچھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے تھے''۔

اہلِ سنت نے ''جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے تھے'' سے مراد یہود و نصاریٰ لیا ہے لیکن ہمارے ائمہؑ نے اسکی بالکل مختلف تفسیر فرمائی ہے چنانچہ تفسیر فرات اور تفسیر برہان میں زرارہ بن اعین کہتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں امام محمد باقرؑ سے پوچھا کہ اس آیت میں وہ کون لوگ ہیں جن سے سوال کرنے کا حکم رسالت مآبؐ کو دیا گیا تھا؟۔ امامؑ نے جواب دیا۔ ''حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب آپؐ شبِ معراج چوتھے آسمان پر پہنچے تو خدا نے انبیاءؑ و صدیقین اور ملائکہ کو جمع کیا۔ حضرت جبریلؑ نے اذان دی اور نماز قائم ہوئی۔ حضورؐ نے نماز کی امامت فرمائی۔ جب نماز پڑھ چکے تو حضورؐ نے انبیاءؑ سے پوچھا کہ بتاؤ تم کس چیز کی شہادت دیتے ہو تو ان سب نے عرض کیا کہ ہم شہادت دیتے ہیں اس امر کی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور علیؑ امیر المومنین ہیں''۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ نے انبیاءؑ و مرسلینؑ سے بحکمِ خدا جو یہ سوال کیا کہ وہ کس چیز کی شہادت دیتے ہیں تو اس سوال کیلئے یہ انتظام کیوں کیا کہ پہلے نماز کا اہتمام کیا گیا اور پھر نماز کے فوراً بعد یہ سوال کیا گیا؟۔ یہ سوال نماز سے پہلے بھی کیا جا سکتا تھا؟۔ اگر تمام واقعات و حالات اور شہادتِ ولایت علیؑ کے سلسلے میں پائی جانے والی روایات کو ایک غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ اسکا تعلق نماز کے رکن تشہد میں دی جانے والی شہادت سے تھا جسکا جواب انبیاءؑ و مرسلینؑ کی جانب سے یہی تھا کہ وہ نماز میں تین شہادات دیتے ہیں۔

احکامِ معصومینؑ

۱۔ ہر عمل اسی لئے کیا جاتا ہے کہ وہ شرفِ قبولیت پا سکے اور جزا بھی صرف اسی عمل

کی ملتی ہے جو قبول ہو جائے ۔اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے ''تمھیں چاہئے کہ عمل کی بہ نسبت قبولِ عمل کے لئے شدید کوشش کرو'' ۔(نہج الاسرار جلد۲ صفحہ۴۱۰) ۔لہٰذا ہر شخص کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ عمل کرنے سے پیشتر اس بات پر غور کرے کہ عمل قبول کسطرح ہوگا اور شرائط قبولیت کو پورا کرتے ہوئے ہی عمل کو بجا لائے ورنہ عمل برائے عمل محض دیوانگی کہلائے گا۔ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نے قبولیتِ عمل کیلئے کیا شرط مقرر کی ہے۔

امالی صدوق صفحہ۲۲۳ پر امام رضاؑ ایک طویل حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں جس میں اللہ فرماتا ہے۔''میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو قبول نہیں کروں گا جب تک وہ احمدؐ کی رسالت کے ساتھ علیؑ کی ولایت کا اقرار نہ کرے'' ۔(شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ۱۷۶) ۔

کیا کوئی فردِ واحد بھی اس امر سے انکار کرسکتا ہے کہ نماز بھی ایک عمل ہے؟ بلکہ افضل ترین عمل ہے؟ ۔تو جب ایک عام عمل بھی بغیر شہادتِ ولایتِ علیؑ قبول نہیں ہوتا تو یہ افضل ترین عمل بغیر شہادتِ ولایت کے کیونکر قبول ہو جائے گا؟ ۔

۲۔احتجاج طبرسی میں امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث موجود ہے اور یہ ایسی حدیث ہے جسکا انکار آج تک ایک شخص بھی نہیں کرسکا۔کتاب ''شرائع الاسلام'' اور اسکی شرح ''جواہر الکلام'' میں جو اجتہاد کے کورس میں شامل ہیں یہ حدیث موجود ہے اور جواہر الکلام میں تو اس پر بھرپور بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ''اگر اجماع علماء مانع نہ ہوتا تو اس (شہادتِ ولایت) کی جزئیت ثابت ہے'' ۔اس قول پر ہم اپنی کتاب کشف الحقائق میں ''اجماع'' کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں ۔کچھ ایسا ہی قول جناب خمینی کا بھی ملتا ہے جو ہم آپکے لئے نقل کرتے ہیں ۔اپنی کتاب ''پرواز در ملکوت'' میں جناب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ولایت کی شہادت رسالت کی گواہی کے ساتھ ضروری ہے کیونکہ ولایت ہی رسالت کا باطن ہے ۔لیکن اسکے بعد فرماتے ہیں :۔

''بواسطۂ تکذیبِ علماءِ اعلام ایں روایات راہ احتیاط اقتضا کند''۔ یعنی ان روایات میں (جن سے شہادتِ ولایتِ علیؑ ثابت ہوتی ہے) احتیاط کرنا چاہئے تا کہ علماء کی تکذیب نہ ہو''۔

اس مقام پر ہم تفصیل سے کام نہیں لے سکتے لیکن ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی غیرتِ ایمانی کو جھنجوڑے اور یہ سوچے کہ کیا یہ بات کسی بھی مومن کیلئے قابلِ قبول ہوسکتی ہے کہ بیشک اللہ کی تکذیب ہوتی ہے تو ہو جائے۔ رسولؐ کی تکذیب ہوتی ہے تو ہو جائے۔ ائمہ معصومینؑ کی تکذیب ہوتی ہے تو ہو جائے۔ لیکن خبردار! علماء کی تکذیب نہ ہونے پائے۔

بہرحال اب آپ امام جعفر صادقؑ کا وہ فرمان سنئے۔ معصومؑ فرماتے ہیں:۔

''فا ذا اقال احد کم لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ فلیقل علی'' امیر المومنین ولی اللہ ''۔ (پس جب بھی تم میں سے کوئی بھی کہے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ تو ساتھ ہی فوراً (بلا فصل) کہے علی'' امیر المومنین ولی اللہ)۔

اس حدیث میں امامؑ نے نہ کسی شخص کا استثناء کیا نہ کسی وقت کا نہ کسی مقام کا بلکہ مطلق حکم دیا ہے کہ کوئی بھی۔ کہیں بھی۔ کسی بھی وقت جب دو شہادتیں دے تو فوراً تیسری شہادت ادا کرے۔ جب کوئی وقت اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں شہادتِ ولایت علیؑ کی معافی ہو تو نماز میں اسکی معافی کیسے ہو جائے گی؟۔ کیا نماز کا کوئی وقت اور مقام نہیں ہوتا؟۔

۳۔ شہادتِ ولایت علیؑ صفحہ ۸۴ بحوالہ مقدمہ مشکوۃ الانوار۔

جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''جس نے میری ولایت کا اقرار نہ کیا اسے محمدؐ کی نبوت کا اقرار کوئی فائدہ اور نفع نہیں دے گا۔ آگاہ رہو کہ یہ شہادتیں لازم و ملزوم ہیں''۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وقت اور مقام چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ تنہا شہادتِ نبوت ہرگز کفایت نہیں کرسکتی اس لئے کہ یہ شہادت اور شہادتِ ولایت لازم وملزوم ہیں۔ان دونوں کو کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نماز کو کسی بھی منطق کے لحاظ سے اس لزوم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔علامہ صاحب کا اصرار تھا کہ شہادتِ ثالثہ کا حکم کتبِ اربعہ میں نہیں ملتا۔ہم انکی فرمائش سے بڑھ کر مواد پیش کریں گے۔اب تک ہم نے صرف تشہد کی بات کی ۔سلام کی بات نہیں کی لیکن اب ہم سلام میں بھی ائمہ معصومینؑ کا وجود ثابت کریں گے۔

اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ صفحہ ۵۴۱ سے اخذ کرکے ہم من لایحضرہ الفقیہ اور تہذیب الاحکام میں موجود ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔یہ یاد رہے کہ یہ دونوں کتابیں کتبِ اربعہ میں شامل ہیں:۔

''حضرت حلبی (جو ایک ثقہ راوی ہیں) کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ کیا نماز میں ائمہ طاہرینؑ کا نام لیا جاسکتا ہے؟۔ فرمایا۔''اجملھم''۔

جن حضرات کو ولایتِ علیؑ سے تکلیف پہنچتی ہے انھوں نے ''اجملھم'' کا ترجمہ ''اجمال کے ساتھ'' کیا ہے یعنی ائمہ طاہرینؑ کے نام مختصر کرکے لئے جائیں۔حالانکہ یہ ترجمہ قطعاً بعید از عقل ہے اس لئے کہ علیؑ ۔حسنؑ۔حسینؑ کو کیونکر مختصر کیا جا سکتا ہے؟۔ لیکن جو لوگ خوشبوئے ولایت سے مانوس ہیں انھوں نے وہی ترجمہ کیا ہے جو ہونا چاہئے۔ ''جمیل'' کے معنی ہیں خوبصورت۔اور''اجمل'' اسکا صیغۂ تفضیل ہے یعنی ''خوبصورت ترین''۔

پس ''اجملھم'' کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ہاں۔نماز میں ائمہ طاہرینؑ کے اسماء

گرامی کو خوبصورت ترین طریقے سے ادا کرو''۔

یہ ہوگئی تشہد کی بات۔آج کل جو نماز پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے اس میں تشہد میں تو ڈنڈی ماری ہی جاتی ہے لیکن طرفہ ستم یہ ہے کہ سلام میں سے بھی علیؑ اور اولادِ علیؑ کا نام غائب کر دیا گیا ہے۔''السلام علینا'' کہکر خود کو تو قابلِ سلام سمجھا جاتا ہے لیکن ائمہ طاہرینؑ کو (معاذ اللہ) اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا۔

من لا یحضرہ الفقیہ کا اردو ترجمہ بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔اگر آپ اسکے باب الصلوٰۃ میں ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو نبیؐ اکرم پر سلام کے بعد یہ جملہ ملے گا۔

''السلام علیٰ الائمۃ الراشدین المھدیین''۔

یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔علامہ صاحب کا تو چیلنج تھا کہ کتب اربعہ میں شہادت ثالثہ ہے ہی نہیں لیکن یہاں تو سلام بھی نکل آیا!اب بھلا وہ کسطرح علیؑ کو نماز سے جدا کریں گے؟۔میرا خیال ہے کہ آخری حربے کے طور پر اب وہ یہ کہیں گے کہ ''اصولِ کافی میں دکھاؤ!''ہم انکی یہ آرزو بھی پوری کئے دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ عقل سے کام لیا جائے گا۔مکھی پر مکھی نہیں ماری جائے گی۔حضرت کلینیؒ کا زمانہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ایسے خون آشام دور میں یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کھل کر لکھ سکیں گے۔

اصولِ کافی۔کتاب ایمان وکفر۔باب ۱۴۸۔حدیث ۲۔

''امام جعفر صادقؑ کے خادم نے بیان کیا کہ مجھے حضرتؑ نے جبکہ آپؑ حیرہ نامی شہر میں تھے ایک ضرورت سے بھیجا۔میرے ساتھ حضرتؑ کے اور غلام بھی تھے۔ہم روانہ ہوئے اور وقتِ شام وہاں سے لوٹے۔میرا بستر حیرہ میں وہیں تھا جہاں چھوڑا تھا۔میں وہیں بیٹھ گیا اور میں مغموم تھا۔میں بستر پر لیٹ گیا۔حضرتؑ وہیں تشریف لے آئے اور فرمایا۔''ہم خود ہی تمھارے پاس چلے آئے ہیں''۔میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔حضرتؑ میرے فرش کے سرہانے بیٹھ گئے اور جس کام کے لئے بھیجا تھا اسکے متعلق پوچھنے لگے۔میں نے سب حال سنایا۔حضرتؑ

نے خدا کی حمد کی۔ پھر ایک قوم کا ذکر چل پڑا۔ میں نے کہا۔ ”میں آپ پر فدا ہوں۔ ہم ان سے بَری ہیں (اسی کو تبرّا کہتے ہیں) کیونکہ وہ لوگ نماز میں وہ نہیں کہتے جو ہم کہتے ہیں“۔ (حیرت سے) فرمایا۔ ”وہ ہم کو دوست رکھتے ہوئے بھی وہ نہیں کہتے جو تم کہتے ہو؟“۔

روایت آپ نے پڑھ لی۔ اب اس پر تھوڑا سا تدبر کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس روایت سے کون کون سی باتیں سامنے آتی ہیں:۔

۱۔ یہ بات انتہائی غور و فکر کی متقاضی ہے کہ یہ روایت کتاب ایمان و کفر میں درج کی گئی ہے جسکا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جسکا تعلق ایمان و کفر سے ہے۔

۲۔ وہ قوم جو چیز اپنی نمازوں میں نہیں پڑھتی تھی وہ شے اسقدر اہم تھی کہ خادم کو اسکے ترک سے شدید دھچکا لگا۔

۳۔ یہاں تک کہ وہ اس قوم پر تبرّا تک بھیجنے لگا۔

۴۔ امامؑ کو بھی اس پر حیرت ہوئی کہ امامؑ سے محبت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود وہ لوگ اس شے کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

۵۔ امامؑ کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے دوستی کا دعویٰ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ اس شے کو نماز میں پڑھا جائے۔

۶۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شے کیا ہو سکتی ہے جو وہ لوگ اپنی نمازوں میں نہیں پڑھتے تھے؟۔

۷۔ کیا وہ سورۂ حمد اور دوسرا سورہ نہیں پڑھتے تھے؟۔

۸۔ کیا وہ سبحان ربی العظیم نہیں پڑھتے تھے؟۔

۹۔ کیا وہ سبحان ربی الاعلیٰ نہیں پڑھتے تھے؟۔

۱۰۔ کیا وہ شہادتِ توحید نہیں دیتے تھے۔

۱۱۔ کیا وہ شہادتِ رسالت نہیں دیتے تھے؟۔

۱۲۔ کیا وہ درود نہیں بھیجتے تھے؟۔

ان تمام چیزوں کے بارے میں تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی انکو نہ پڑھتا ہو۔ یہ تو ناصبی اور خارجی بھی پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ لشکرِ یزید بھی یہی کچھ پڑھا کرتا تھا۔ پھر وہ کونسی شے تھی جسکا براہِ راست تعلق محبتِ اہلبیتؑ سے تھا اور وہ قوم اسے نہیں پڑھتی تھی؟۔ یہ وہی شہادت تھی جسے اپنوں پرایوں سب نے چھپایا تھا اور بنی امیہ و بنی عباس نے جسکو مٹانے کیلئے پوری حکومتی قوت لگا دی تھی اور انکے پس ماندگان آج بھی اس شہادت کو چھپانا جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ کیا کہنا اس نام نہاد ایمان کا جو کُلِّ ایمان کے سامنے سینہ سپر ہو جائے!

عملِ معصومؑ

اب آخر میں ہم اس اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں جو بڑی شد و مد سے کیا جاتا ہے اور جسکے ذریعے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جاتے ہیں اور ایک عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر نماز میں یہ شہادت اتنی ہی ضروری ہوتی تو حضرت رسولِ خداؐ اور ائمۂ معصومینؑ بھی اسے ضرور پڑھتے۔

ہم اصل صورتِ حال مومنین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تا کہ انکے شبہات رفع ہو سکیں اور وہ مکمل یقین کے ساتھ اپنی نمازوں میں شہادتِ ولایتِ علیؑ ادا کر کے ان نمازیوں میں شامل ہو سکیں جن سے اللہ نے جنت اور عزت کا وعدہ فرمایا ہے۔

رسول اللہؐ کی نماز

امالی شیخ مفید سے ایک روایت پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے جس میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ”خدا نے جبریلؑ کو محمدؐ کی طرف بھیجا کہ وہ اپنی زندگی میں (یعنی زندگی بھر) ولایتِ علیؑ کی شہادت دیں“۔ اس روایت کی موجودگی میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ حکمِ خدا سے روگردانی کر سکتے ہوں اور یہ روایت اس بات

کی محکم دلیل ہے کہ آپ کسی بھی حالت میں اس شہادت کو ترک نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اسی شہادت کو ادا کرنے اور اسکی تبلیغ کرنے پر مامور ہوئے تھے۔ پھر بھی ہم مومنین کو حدِ یقین تک پہنچانے کیلئے ایک ایسی مستند روایت پیش کرتے ہیں جو معتبر ترین شیعہ تفاسیر میں موجود ہے اور جس سے اچھی طرح ثابت ہو جائے گا کہ رسول اللہ زندگی بھر اپنی نمازوں میں شہادتِ ولایت دیتے رہے۔ کبھی دھیمی آواز سے اور کبھی بلند آواز میں۔ یہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ ہے جسکی تفسیر بصائر الدرجات۔ عیاشی۔ صافی۔ البرہان اور نور الثقلین میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی طرح کی گئی ہے لیکن ہم اسے تفسیر نور الثقلین سے نقل کریں گے۔

ربّ العزت کا ارشاد ہے۔ ''ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا''۔

ترجمہ:۔ اور (اے رسولؐ) تم اپنی نماز میں اپنی نماز کو نہ تو بلند ہی کیا کرو اور نہ اسے بہت آہستہ کیا کرو اور اسکے بین بین کا راستہ اختیار کرو۔

امام محمد باقرؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''ولا تجهر بصلواتك کا مطلب یہ ہے کہ علیؑ کی ولایت کا اس وقت تک نماز میں بلند آواز سے اظہار نہ کرو جب تک کہ میں اس بارے میں حکم نہ دوں۔ ولا تخافت بها کا یہ مطلب ہے کہ ایسی مدھم آواز میں ولایت علیؑ ادا کرو کہ خود علیؑ اسکو سن سکے یعنی علیؑ سے نہ چھپاؤ۔ وابتغ بين ذالك سبيلا کا مقصد یہ ہے کہ تم مجھ سے سوال کرتے رہو کہ امرِ ولایت کے اظہار کی تم کو اجازت دے دوں۔ چنانچہ حضورؐ اسکا سوال کرتے رہے اور بروزِ خمِ غدیر اسکے اظہار کا حکم مل گیا''۔ (اکمال الدین بولایت امیر المومنینؑ صفحہ ۵۳۹)۔

یہاں وہ حضرات جو خود کو قرآن کا وارث تصور کرتے ہیں اور اپنے علاوہ

کسی اور کو قرآن پر تدبر کرنے کی اجازت نہیں دیتے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اس آیت میں تو رسولؐ کو آہستہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔پھر آخر اس آیت کو کس آیت نے منسوخ کیا جسکے تحت رسولؐ کو علیؑ ولی اللہ باَواز بلند پڑھنے کی اجازت مل گئی۔یعنی اس منسوخ آیت کی ناسخ آیت کونسی ہے؟۔اس سوال کا واضح جواب موجود ہے۔مولانا مقبول احمد دہلوی کے ترجمے کے صفحہ ۴۲۵ پر سورہ حجر کی آیت ۹۴ اور اسکی تفسیر دی گئی ہے۔جس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کی آیت کو منسوخ کرتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:۔

''فاصدع بما تؤمر و اعرض من المشرکین''۔

ترجمہ:۔(اے رسولؐ) پس جو حکم تجھے دیا جاتا ہے وہ کھول کھول کر سنا دے اور مشرکین سے منہ پھیر لو (یعنی انکی پیروی نہ کرو)۔

تفسیر عیاشی میں جناب صادقؑ آلِ محمدؐ سے منقول ہے کہ اس آیت نے ''ولا تجھر بصلاتک'' کو منسوخ کر دیا اور بانگِ دہل بلند آواز سے شہادتِ ولایت فی الصلوٰۃ ادا کرنے کا حکم جاری فرمایا''۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس ولایت کو آہستہ کہنے کا حکم تھا وہ آج ختم کر کے بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ شہادتِ ولایت کو مبطلِ نماز کہتے ہیں وہ از روئے قرآن مشرک ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کی نماز

اکمال الدین بولایتِ امیر المومنینؑ صفحہ ۵۴۳ پر بحوالہ بحار الانوار جلد ۸۴ صفحہ ۲۰۸ تا ۲۰۹ لکھا ہے کہ امام جعفر صادقؑ اپنی نماز میں تشہد کے دوران یہ جملہ پڑھا کرتے تھے:۔

''اشہد انک نعم الرب و ان محمداً نعم الرسول و ان

علی ابن ابی طالبٍ نعم الولی"

امام علی رضاؑ کی نماز

اسی کتاب کے صفحہ ۵۴۷ پر بحوالہ فقہ الرضاؑ صفحہ ۱۰۸ تا ۱۰۹ امام رضاؑ کا تشہد اسطرح بیان کیا گیا ہے:۔

"اشہد انك نعم الرب و ان محمداً نعم الرسول و ان علیاً نعم المولی"۔

اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ہم نے ہر اعتبار سے لزوم کلمۂ علی" ولی اللہ ثابت کردیا۔ اب ہر مومن کا فرضِ عین بنتا ہے کہ وہ اپنے کلمے۔ اپنی اذان۔ اپنی اقامت اور اپنی نماز کی قبولیت اور حفاظت کو یقینی بنانے کیلئے اسے شہادتِ ولایتِ علیؑ سے زینت دے تا کہ **اسکی ولادت بھی طاہر رہے اور اسکی موت بھی ایمان پر ہو**۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

یہ کتاب "کشف المسائل" آج بتاریخ ۱۴ اپریل ۲۰۰۳ء مطابق کیم صفر ۱۴۲۴ھ بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب بتوفیقِ خداوندی و بتائید و امدادِ حضرت صاحب الزمانؑ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

الحمد للّٰہ رب العا لمین۔ والصلوۃ والسلام علی خاتمؐ النبین و آلہٖ الطیبین الطاہرین المعصومین المظلومین و لعنتہ اللہ علی اعداء ہم اجمعین من یو منا ھذا الی یوم الدین۔

تحفۂ یا علیؑ مدد